احمدیت یعنی حقیقی اسلام

از

سیدنا حضرت میرزا بشیرالدین محمود احمد
خلیفۃ المسیح الثانی

احمدیت یعنی حقیقی اسلام

(تحریر فرمودہ ۲۴۔ مئی تا ۶ جون ۱۹۲۴ء)

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ ھُوَ النَّاصِرُ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ۔ وَاِیَّاہُ نَدْعُوْا اَنْ یَّھْدِیَنَا اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ۔ اَللّٰھُمَّ یَا رَبِّ اَلْھِمْنَا مَا یَکُوْنُ فِیْہِ رِضَاکَ وَارْزُقْنَا تَقْوٰکَ وَصَفِّ خَوَاطِرَنَا وَنَقِّ اَفْکَارَنَا وَجَرِّءْنَا عَلٰی مُقَابَلَۃِ الشَّرِّ وَدَوَاعِیْہِ وَشَجِّعْنَا عَلٰی مُخَالَفَۃِ الْخَنَّاسِ وَمَسَاعِیْہِ۔

اَمَّا بَعْدُ ہم اللہ تعالیٰ کا بے حد و انتہاء شکر کرتے ہیں جس نے ہمیں ان طاقتوں کے ساتھ پیدا کیا جو ہمیں اعلیٰ سے اعلیٰ مقاماتِ ترقی تک پہنچا سکتی ہیں پھر ہمیں علم و عرفان کے پَر دیئے جن کی مدد سے ہم آسمانِ روحانی تک اُڑ کر پہنچ سکتے ہیں۔ جس نے ہماری کمزوریوں اور کوتاہیوں کو دیکھ کر روحانی علاج کے اسرار ہمارے لئے کھولے اپنے پاس سے علم روحانی کے طبیب علاج کے لئے بھیجے جنہوں نے بیماریوں کا علاج کیا اور ہماری طاقت اور قوت کے بڑھانے کی تدابیر اختیار کیں۔ اور ہم خدا تعالیٰ کا شکر کرتے ہیں جس نے ہمارے دلوں میں اپنی محبت رکھی اور اپنی ملاقات کی تڑپ پیدا کی پھر اس محبت سے ہماری طرف کھینچا گیا اور اپنی ملاقات سے اس نے ہمیں مسرور کیا۔ جس نے اپنے عشق کا جام ہمیں پلایا اور اپنے وصل کے پیالہ سے ہمیں سیراب کیا جس سے اس تاریکی کے زمانہ میں جبکہ روحانیت کے متلاشی اندھوں کی طرح مارے مارے پھرتے

تھے اپنے علم کا سورج چڑھایا اور اپنے مامور اور مرسل حضرت احمد علیہ السلام کو مشرقی زمین سے برپا کیا اور اس کی نورانی کرنوں کے ذریعہ سے وساوس اور شکوک کی تاریکی کو پھاڑ دیا۔ پھر اس نے اپنی رحمت کے بادل برسائے اور اپنے فضل کی ہوائیں چلائیں۔ اور ہر ایک خشک زمین کو سیراب کیا اور روحانیت اور تقویٰ کی روئیدگی کو نکالا تا دنیا ایک شاداب کھیت کی طرح ہو جائے بعد اس کے کہ وہ ایک خشک جنگل کی طرح تھی اور لوگ زندگی اور خوشی کا سانس لیں بعد اس کے کہ وہ مرچکے تھے اور مرجھا گئے تھے۔ ہم اس کے نبی محمد ﷺ پر بھی درود بھیجتے ہیں جس کے ذریعہ سے وہ چشمہ پھوٹا جو کبھی خشک نہ ہو گا اور وہ علم کا دروازہ کھولا گیا جو تلاش کرنے والوں کے لئے کبھی بند نہ ہو گا۔ اور ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ اپنے وعدوں کے مطابق دنیا کو راستی اور ہدایت کی طرف لائے اور حق کو قبول کرنے کی اس کو توفیق دے تا تمام دنیا میں امن اور صلح کا دَور دَورہ ہو اور روز مرہ کے جھگڑے اور فساد دُور ہوں اور تا لوگ اس حقیقی راحت کو پالیں جو بغیر خدا تعالیٰ سے ملنے کے کبھی نہیں مل سکتی۔ اَللّٰھُمَّ اٰمِیْن

اس کے بعد میں خوشی کا اظہار کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس کلام کی تائید میں جو اس نے تیرہ سو سال پہلے قرآن کریم میں نازل فرمایا تھا بانیان ریلیجس کانفرنس کو اس جلسہ کے انعقاد کی توفیق عطا فرمائی وہ کلام یہ ہے:-

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا۔ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا۔ فَالتّٰلِیٰتِ ذِکْرًا۔ اِنَّ اِلٰھَکُمْ لَوَاحِدٌ۔رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَھُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ۔ اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِزِیْنَۃِ ۨ الْکَوَاکِبِ۔ وَحِفْظًا مِّنْ کُلِّ شَیْطٰنٍ مَّارِدٍ [1]

یعنی میں اس امر کی شہادت کے طور پر کہ خدا کا دین ہی آخر غالب رہے گا ان مجالس کو پیش کرتا ہوں جہاں لوگ قطاروں میں بیٹھیں گے اور اس جماعت کو پیش کرتا ہوں جو انتظام کرے گی اور کسی کو اپنے دائرہ عمل سے باہر نہیں جانے دے گی اور ان لوگوں کو پیش کرتا ہوں جو اس وقت مذاہب کی خوبیوں پر مضمون پڑھیں گے۔ ان سب کی کوششوں کا آخری یہی نتیجہ نکلے گا کہ خدا ایک ہے آسمانوں اور زمینوں اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب۔ وہ مشرقوں کا بھی ویسا ہی رب ہے (جس طرح مغربوں کا) اور یہ کہ ہم نے اس روحانی بلندی کو جو سب سے قریب کی ہے ستاروں سے منور کیا ہے اور ان کا یہ کام بھی مقرر کیا ہے کہ وہ ہر ایک اس شخص کے حملہ سے سچے دین کو بچائیں جو لوگوں کو حق سے دور کرتا ہے اور خدا کی اطاعت سے باہر نکل گیا ہے۔

اس کے بعد میں اس مضمون کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جس پر بولنے کی مجھ سے خواہش کی گئی ہے یعنی احمدیت۔ لیکن پیشتر اس کے کہ میں اس کے مذہبی پہلو پر روشنی ڈالوں میں احمدیت کی مختصر تاریخ اور اس کی موجودہ وسعت اور قوت کو بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ احمدیہ سلسلہ کی بناء حضرت مرزا غلام احمد علیہ السلام نے (۲۳ مارچ) ۱۸۸۹ء میں قریباً ۵۴ سال کی عمر میں رکھی اور قادیان میں جو آپ کا وطن ہے اور جو این ڈبلیو ریلوے کے سٹیشن بٹالہ سے گیارہ میل شمال مشرق پر ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اس کا مرکز تجویز کیا۔ باوجود اس سخت مخالفت کے جو آپ کی تمام مذاہب ہند نے کی اور اس غیر ہمدردانہ بلکہ بعض اوقات مخالفانہ رویہ کے جو گورنمنٹ نے آپ سے برتا آپ کا سلسلہ تمام اکناف ہند میں بڑھنا شروع ہوا حتیٰ کہ آپ کی وفات کے وقت جو ۱۹۰۸ء میں ہوئی احمدیہ جماعت کی تعداد کئی لاکھ تک پہنچ گئی تھی اور یہ سلسلہ ہندوستان سے نکل کر عرب اور افغانستان میں بھی پھیل چکا تھا۔ آپ کی وفات کے بعد سلسلہ کے امام حضرت استاذی المکرم مولوی نور الدین صاحب منتخب ہوئے اور آپ کی وفات پر جو ۱۹۱۴ء میں ہوئی یہ عاجز جماعت کا امام منتخب ہوا۔ (ابتدائے اسلام کی طرح احمدیہ جماعت کا بھی ایک امام مقرر ہوتا ہے جسے جماعت منتخب کرتی ہے اور یہ ضروری نہیں کہ وہ حضرت مسیح موعود کی اولاد یا خاندان میں سے ہو جیسے کہ حضرت خلیفہ اول کوئی حسبی یا نسبی تعلق حضرت مسیح موعود سے نہیں رکھتے تھے اور نہ یہ ضروری ہے کہ وہ آپ کے خاندان میں سے نہ ہو (جیسا کہ یہ عاجز حضرت مسیح موعود کی فرزندی کی عزت رکھتا ہے) اس وقت یہ سلسلہ تمام دنیا میں پھیلا ہوا ہے اور اس کے ممبروں کی تعداد پانچ لاکھ سے زیادہ ہے جن میں سے بڑا حصہ ہندوستان اور اس کے قریب کے علاقوں میں ہے۔ اس مخالفت شدید کے سبب سے جو اس سلسلہ کے افراد سے کی جاتی ہے بہت سے لوگ مخفی طور پر احمدی ہیں لیکن ظاہر طور پر شامل نہیں ہو سکتے چنانچہ ایسے لوگ ہندوؤں، سکھوں اور دوسرے مسلمان فرقوں میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ہر قوم اور طبقہ کے لوگ شامل ہیں اعلیٰ اقوام کے بھی اور نام نہاد ادنیٰ اقوام میں سے بھی۔ چنانچہ پچھلے دو سال کے عرصہ میں ان قوموں میں سے جن کو لوگ ادنیٰ سمجھتے ہیں پنجاب اور یوپی میں تین ہزار کے قریب آدمی اس سلسلہ میں داخل ہوئے ہیں اور ہر مہینے میں یہ جماعت بڑھ رہی ہے اسی طرح حیدر آباد کی ادنیٰ اقوام میں سے بھی پچھلے سال کے اندر کئی سو آدمی اس سلسلہ کی تربیت کے نیچے آیا ہے۔

ملکی لحاظ سے جماعت احمدیہ ہندوستان کے ہر صوبہ میں ہے کوئی صوبہ ایسا نہیں ہے کہ جہاں اس جماعت کے افراد نہ پائے جاتے ہوں۔ افغانستان کے دونوں حصوں یعنی پشتو بولنے والے اور فارسی بولنے والے دونوں علاقوں میں جماعت موجود ہے۔ ہندوستان کے جنوب کی طرف سیلون' برما' ملایا سٹریٹس سیٹلمنٹ میں بھی جماعت موجود ہے۔ سیلون سے دو اخبار بھی جماعت کے نکلتے ہیں ایک ملایا میں اور ایک انگریزی میں۔ چین میں تبلیغ کا سلسلہ باقاعدہ نہیں ہے لیکن جیسا کہ ایک ترکی پارلیمنٹ کے ممبر کی ایک کتاب سے جو انہوں نے اپنی سیاحت کے متعلق لکھی ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں بھی جماعت ہے گو اندرون ملک کی جماعت کا مرکز سے ابھی تک تعلق قائم نہیں ہوا۔ جزیرہ فلپائن اور سماٹرا کے کچھ لوگ بھی سلسلہ میں داخل ہو چکے ہیں۔ شمالی اور مغربی ایشیائی علاقوں میں سے ایران' بخارا' عراق' ولایت' موصل' عرب اور شام میں جماعت احمدیہ پائی جاتی ہے افریقہ کے علاقوں میں سے مصر' یوگنڈا' مشرقی افریقہ' زنجبار' جرمنی' جزیرہ ماریشس' نٹال (جنوبی امریکہ)' مراکش' الجزائر' سیرالیون' گولڈ کوسٹ (گھانا) اور نائیجریا میں جماعتیں قائم ہو چکی ہیں۔ اور جزیرہ ماریشس' نائیجریا اور گولڈ کوسٹ اور مصر میں باقاعدہ مشن بھی قائم ہیں اور ماریشس سے ایک اخبار سلسلہ کی تائید میں فرانسیسی زبان میں نکلتا ہے۔ یورپ کے علاقوں میں سے اب تک صرف انگلستان اور فرانس میں جماعت ہے اور انگلستان میں مشن بھی دس سال سے قائم ہے۔ امریکہ میں صرف تین سال سے مشن قائم ہوا ہے اور اس وقت یونائیٹڈ سٹیٹس میں ایک ہزار کے قریب آدمی سلسلہ میں داخل ہو چکا ہے۔ اسی جگہ سے ایک سہ ماہی رسالہ بھی مشن کی طرف سے نکلتا ہے۔ یونائیٹڈ سٹیٹس کے علاوہ جزیرہ ٹرینیڈاڈ اور جنوبی امریکہ کی ریاست ہائے برازیل اور کوسٹوریکا میں بھی جماعت ہے۔ جزائر میں سے آسٹریلیا اس نعمت عظمیٰ میں حصہ دار ہے اور ہم اللہ تعالیٰ کے کلام کی بناء پر یقین رکھتے ہیں کہ ابھی زیادہ دن نہیں گذریں گے کہ سب دنیا اس نعمت سے حصہ لے گی۔

سلسلہ احمدیہ کے امتیازی مسائل

ہر ایک شخص کے دل میں طبعاً یہ سوال پیدا ہوگا کہ اس قدر مذاہب اور سلسلوں کی موجودگی میں سلسلہ احمدیہ کی کیا ضرورت پیش آئی تھی؟ لہذا میں مذہبی امور میں سے سب سے پہلے اس مسئلہ کو لیتا ہوں۔

ہر ایک شخص جو کسی الہامی مذہب سے تعلق رکھتا ہے اس امر پر بھی یقین رکھتا ہے کہ

خدا تعالیٰ کی طرف سے وقتاً فوقتاً انبیاء آتے رہے ہیں دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس میں خدا تعالیٰ کی طرف سے آنے والے لوگ نہ پائے جاتے ہوں۔ دنیا کی ترقی انہی لوگوں سے وابستہ ہے اور ان لوگوں کو علیحدہ کرکے دنیا میں تاریکی ہی تاریکی نظر آتی ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّاخَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ [2]۔ کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس میں کوئی نبی نہ گذرا ہو۔ قدیم تاریخ کی ورق گردانی اور آثار قدیمہ کا تجسس ہمیں زیادہ سے زیادہ اس حقیقت کا معتقد بناتا جاتا ہے اور یہ تحقیق بنی نوع انسان میں یگانگت پیدا کرنے کا بہت بڑا موجب ہو رہی ہے جس کا سہرا قرآن کریم کے سر ہے جس نے اس حقیقت کو سب سے پہلے بیان کیا ہے۔ جب ہم ان انبیاء کی آمد کی غرض کو دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بعثت کا داعی ہمیشہ دنیا میں سے روحانیت کا مٹ جانا اور خدا تعالیٰ سے تعلق کا قطع ہو جانا رہا ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ اس بادل کی طرح آتے رہے ہیں جو بارش کے ایک لمبے عرصہ تک بند رہنے کے بعد آتا ہے اور دنیا کو سرسبز وشاداب کر دیتا ہے۔ یہ لوگ خدا تعالیٰ کا وہ جواب ہوتے ہیں جو متلاشی دنیا کی پکار کے نتیجہ میں آسمان سے بھیجا جاتا ہے یا وہ نرسنگا ہوتے ہیں جو شکار کا پیچھا کرنے والے شکاریوں کو جب وہ جنگل میں ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں اکٹھا کرنے کے لئے وہ شکاری بجاتا ہے جس کے سامنے شکار ہوتا ہے۔ دنیا اس کے ذریعہ سے پھر صداقت پر جمع ہوتی ہے اور منزل مقصود کی طرف قدم بڑھاتی ہے۔

یہ سلسلہ نبوت جس طرح ہمیشہ سے چلا آیا ہے ہمارے نزدیک اسی طرح آئندہ چلا جائے گا اور وہ کسی وقت بند نہ ہوگا کیونکہ عقل انسانی اس سلسلہ کے بند ہونے کے خیال کو رد کرتی ہے۔ اگر دنیا میں تاریکی اور خدا تعالیٰ سے دوری کے زمانے آتے رہیں گے تو یہ سلسلہ بند نہ ہوگا۔ اگر وقتاً فوقتاً لوگ اصل راستہ کو چھوڑ کر گمراہی کے گھنے جنگلوں میں راستہ کھوتے رہیں گے اور سچے راستہ کی طرف پہنچنے کی خواہش ان کے دل میں پیدا ہوتی رہے گی اور وہ ہدایت کی جستجو کرتے رہیں گے تو ایسے لوگوں کی آمد کا انقطاع بھی ناممکن ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کی رحیمیّت کی شان کے خلاف ہے کہ وہ درد کو تو پیدا کرے مگر علاج پیدا نہ کرے۔ تڑپ تو دے مگر ملاقات کے سامانوں کو مٹا دے۔ ایسا خیال اس سرچشمۂ رحم پر بدظنی ہے اور روحانی نابینائی کی علامت۔ اس عام قاعدہ کے ماتحت ہم لوگ یقین رکھتے ہیں کہ اس وقت ایک ہادی اور رہنما کی ضرورت تھی جو دنیا کو خدا تعالیٰ کا راستہ دکھائے اور شک وشبہ کی زندگی سے نکال کر یقین اور وثوق کے مرتبہ تک

پہنچائے۔

اے بھائیو! اگر دنیا کبھی کسی نبی کی محتاج تھی تو وہ آج اس سے بڑھ کر محتاج ہے۔ مذاہب کی جڑ آج کھوکھلی ہو رہی ہے اور دنیا میں تین ہی قسم کے لوگ نظر آتے ہیں یا تو وہ جو مذہب کی ضرورت کو ہی خیرباد کہہ چکے ہیں اور خدا تعالیٰ کو یا تو بکُلّی جواب دے چکے ہیں یا اس پر ان کو ویسا ہی ایمان ہے جیسا کہ پہاڑوں اور دریاؤں پر کیونکہ اس کا وجود ان کی روزمرہ کی زندگی پر کوئی اثر نہیں ڈالتا۔ اگر وہ یہ فیصلہ کرلیں کہ خدا تعالیٰ نہیں ہے تو بھی ان کے اعمال میں کوئی تغیر واقع نہ ہو اور اب جو وہ کہتے ہیں کہ خدا ہے تو اب بھی اس کا اثر ان کے اعمال پر کچھ نہیں ہے۔ یہ لوگ یہاں تک کہہ اٹھتے ہیں کہ ہم اپنی حریت کو خدا تعالیٰ کے لئے بھی نہیں چھوڑ سکتے اور اپنے وقار کو خدا تعالیٰ کے سامنے دعا اور عاجزی کرکے صدمہ نہیں پہنچانا چاہتے۔ دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں جو خدا تعالیٰ کے تو قائل ہیں اور اس کی طاقتوں پر بھی یقین رکھتے ہیں لیکن وہ اس پیاسے کی طرح ہیں جو ریگستان کے ٹیلوں کے درمیان راستہ بھول جاتا ہے اور میلوں میل تک اسے پانی کا ایک قطرہ نہیں ملتا۔ جوں جوں وہ پانی کی تلاش کرتا ہے اس کی پیاس اور بڑھتی جاتی ہے اور اس کی گھبراہٹ ترقی کرتی جاتی ہے مگر اس کا پھرنا اور چکر لگانا اس کو نفع نہیں دیتا۔ وہ ایک سراب سے دوسرے سراب تک جاتا ہے اور بھی دور ہوتا جاتا ہے اور آخر موت کے قریب پہنچ جاتا ہے۔

تیسرا گروہ وہ ہے جو اپنی قسمت پر خوش ہے اور اپنی حالت پر قانع ہے مگر اس لئے نہیں کہ وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اس کی فطرت کے تقاضے پورے ہو چکے ہیں بلکہ اس لئے کہ وہ ہمت ہار چکا ہے اور خدا کے فضل سے مایوس ہو چکا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ خدا کے فضل پہلوں پر ختم ہو چکے ہیں۔ میں اس کے سوتیلے بیٹے کی طرح ہوں جسے وہ اپنے مال کا وارث نہیں قرار دیتا اس لئے میرے لئے وہی کافی ہے جو پہلوں کے دسترخوان سے اٹھا اور جو ان کی مہربانی نے مجھ تک پہنچا دیا۔

مگر یہ تینوں حالتیں غیر طبعی ہیں نہ پہلے گروہ کی بے اعتنائی اس کو فائدہ پہنچا سکتی ہے نہ دوسرے گروہ کی بے فائدہ جدوجہد اور نہ تیسرے گروہ کی قناعت۔ جو چیز فائدہ پہنچا سکتی ہے وہ خدا کا عرفان ہے جو تمام تاریکیوں کو مٹا کر انسان اور خدا تعالیٰ کے درمیان سے سب پردے ہٹا دیتا ہے اور بندے اور خدا کو ایک جگہ جمع کر دیتا ہے اور مذہب کو ایسی صورت میں انسان کے سامنے پیش کرتا ہے کہ اس کا دل اسے قبول کرلیتا ہے اور اس کی عقل تسلی پا جاتی ہے اور یہ بات نہ آج تک نبیوں کے بغیر دنیا کو حاصل ہوئی ہے نہ آئندہ ہو سکتی ہے۔

اے بھائیو! ذرا غور تو کرو کہ اس وقت کونسا مذہب ہے جس کے تبع اس امر کے دعویدار ہوں کہ انہوں نے وہ کچھ پالیا ہو جو پہلے نبیوں کے ذریعے سے دنیا کو ملا تھا؟ کیا یہ امر درست نہیں کہ لوگ اس امر پر قانع ہیں کہ انعامات پہلوں پر ہی ختم ہو چکے یا مذہب کو ہی جواب دے چکے ہیں یا یہ سمجھتے تو ہیں کہ ان کو سب کچھ مل گیا؟ مگر ان کی مثال اس معمول کی طرح ہے جو مسمریزم کے اثر کے نیچے بیسیوں غیر معقول امور کو تسلیم کرتا ہے لیکن دوسرے دیکھنے والوں کو کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ اگر یہ سچ ہے اور ضرور ہے تو آج بھی دنیا کو اسی طرح ایک نبی کی ضرورت ہے جس طرح کہ پہلے زمانوں میں تھی اور اسی وجہ سے احمدی جماعت اس امر کی معتقد ہے کہ نبوت کا دروازہ ہمیشہ سے کھلا ہے اور کھلا رہے گا اور یہ کہ موجودہ زمانہ نہایت زور سے ایک نبی کی ضرورت کی شہادت دے رہا ہے۔

مگر ہم لوگ اپنے عقیدہ کی بناء صرف زمانہ کی شہادت پر ہی نہیں رکھتے بلکہ پہلے نبیوں کی شہادت پر بھی ہمارے عقیدے کی بنیاد ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر ایک مذہب کے پیشواؤں نے ایک آنے والے نبی کی بشارت دی ہے جیسے ہندوؤں میں نہہ کلنک اوتار کی پیشگوئی ہے جس کے وہ اب تک منتظر ہیں' مسیحیوں میں مسیح کی آمد ثانی کی' مسلمانوں میں مہدی اور مسیح موعود کی' زردشتیوں میں موسیودربھی کے آنے کی پیشگوئیاں ہیں۔ اگر آئندہ سلسلہ نبوت دنیا سے بند ہو چکا ہوتا تو یہ سب قومیں ایک آنے والے کے متعلق کیوں متفق ہوتیں؟

پھر ایک اور عجیب بات ہے جو ہم ان پیشگوئیوں میں دیکھتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ وہ علامات جو ان موعود نبیوں کے متعلق بیان کی گئی ہیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔ سب کی سب پیشگوئیوں میں اس زمانہ میں بدیوں کی کثرت' بیماریوں کی زیادتی' ستاروں کا ٹوٹنا' سورج اور چاند گرہن کا لگنا اور لڑائیوں کا ہونا وغیرہ علامات بتائی گئی ہیں اور کام بھی ان موعودوں کا ایک ہی بتایا گیا ہے یعنی اس وقت ان کے ذریعہ سے سب دنیا پر صداقت پھیل جائے گی اور مذہب حقہ کو غیر معمولی طور پر دوسرے دینوں پر غلبہ ملے گا جو اس سے پہلے کبھی حاصل نہیں ہوا۔

اب ایک طرف تو ان پیشگوئیوں کا اپنے وقت پر پورا ہو جانا بتاتا ہے کہ یہ پیشگوئیاں جھوٹی نہیں ہیں۔ دوسری طرف ان موعودوں کا مقررہ کام اس امر کو ناممکن قرار دیتا ہے کہ ایک ہی وقت میں اس قدر موعود اپنے اپنے مذہب کو سارے ادیان پر غالب کریں۔ پس لازماً یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ پیشگوئیاں ایک ہی شخص کے متعلق ہیں جو اس غرض کے لئے آئے گا کہ اپنی قوت قدسیہ

سے سب ادیان کو ایک جگہ جمع کردے اور سب قومیں اس کے ذریعہ سے سچا راستہ دیکھیں۔

لیکن جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب پیشگوئیاں ایک ہی موعود کی خبر دے رہی ہیں وہاں ان پیشگوئیوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس موعود کو ایسی خصوصیات بھی حاصل ہوں گی جن کے سبب سے تمام اقوام اس کو اپنا ہی سمجھیں گی۔ اس کو ہندوؤں سے بھی ایسا تعلق ہوگا کہ وہ اسے اپنا نہہ کلنک اوتار قرار دے سکیں گے اور فارسیوں سے بھی اسے ایسا تعلق ہوگا کہ وہ اسے اپنا موسیودر بھی سمجھ سکیں گے اور مسلمانوں سے بھی اسے ایسے تعلق ہوگا کہ وہ اسے اپنا مہدی کہہ سکیں گے اور مسیحیوں سے بھی اسے ایسا تعلق ہوگا کہ وہ اسے اپنا مسیح مان سکیں گے اور یہ تعلق اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ وہ مختلف نسبتوں کے ذریعہ سے مختلف قوموں کی طرف منسوب ہو۔ مثلاً کسی قوم کے ساتھ اسے مذہبی تعلق ہو، کسی قوم کے ساتھ نسلی تعلق ہو، کسی قوم کے ساتھ ملکی تعلق ہو اور کسی قوم کے ساتھ سیاسی اور تمدنی تعلق ہو حتیٰ کہ ہر قوم اس کو اپنا قرار دے سکے۔

ہم احمدی جماعت کے لوگوں کا یہ مذہب اور یہ عقیدہ ہے کہ یہ سب باتیں حضرت مرزا غلام احمد علیہ السلام بانی سلسلہ احمدیہ میں جمع ہو جاتی ہیں۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ کے مفاسد کی اصلاح کے لئے مبعوث فرمایا ہے آپ اپنے دعویٰ کے مطابق مسیحیوں کے لئے مسیح تھے اور مسلمانوں کے لئے مہدی اور ہندوؤں کے لئے کرشن یا نہہ کلنک اوتار اور زردشتیوں کے لئے موسیودر بھی۔ غرضیکہ آپ ہر ایک قوم کے موعود نبی تھے اور سب دنیا کو ایک مذہب پر جمع کرنے کے لئے مبعوث ہوئے تھے آپ کے وجود میں اللہ تعالیٰ نے سب قوموں کی امیدوں اور آرزوؤں کو جمع کردیا۔ آپ وہ صلح کا گنبد تھے جس میں ہر ایک قوم آکر اپنے پیدا کرنے والے کے آگے جھکی۔ اور وہ کھڑکی تھی جس میں سے سب قوموں نے خدا کو دیکھا اور وہ نقطہ مرکزی تھے جس پر دائرہ کے سب خط آکر جمع ہوئے۔ پس آپ کے ذریعہ سے دنیا کی صلح اور آشتی مقدر ہے آپ ایرانی النسل ہونے کے سبب سے زردشتیوں کے موعود تھے' ہندوستانی ہونے کے سبب سے ہندوؤں کے موعود تھے' مسلمان ہونے کے سبب سے مسلمانوں کے موعود تھے اور مسیح موعود تھے اور مسیح کا نام پانے کے سبب سے اور ان تمدنی نقائص کا علاج لانے کے سبب سے جو مسیحی ممالک میں پائے جاتے ہیں اور جن کی وجہ سے مسیحی ممالک کی عام آبادی کی پیٹھ جھکی جاتی ہے اور مسیحیوں کی حکومت میں پیدا ہونے کے سبب سے اور مسیح کی عزت کو ان کے حملوں سے

بچانے کے سبب سے جو ہزاروں سال سے اس پر کئے جاتے تھے مسیحیوں کے موعود کہلانے کے مستحق تھے اور انہی چار قوموں پر بس نہیں آپ دنیا کی ہر ایک قوم کی قدیم اخبار کو پورا کرنے والے اور ساری دنیا کی امیدوں کو برلانے والے تھے۔

وہ سب پیشگوئیاں جو پہلے نبیوں نے کی تھیں آپ کے حق میں اور آپ کے ہاتھ پر پوری ہوئیں اور اللہ تعالیٰ نے ان پیشگوئیوں کے پورا ہونے سے پہلے دوبارہ ان کے وقوع کا وقت قریب آجانے کی آپ کو خبر دی اور ثابت کردیا کہ آپ ہی ان پیشگوئیوں کے پورا ہونے کے مستحق تھے۔

کہا گیا تھا کہ آنے والا موعود مشرق سے ظاہر ہو گا [۳]۔ چنانچہ آپ مشرق سے ظاہر ہوئے۔ اور کہا گیا تھا کہ مسیح کی آمد سے پہلے جھوٹے مسیح ظاہر ہوں گے [۴]۔ سو ایسا ہی ہوا کہ آپ کے دعویٰ سے پہلے کئی مسیحیت کے مدعی پیدا ہوئے جن میں سے بعض قریب تھا کہ بہت سے سمجھداروں کو بھی گمراہ کردیتے۔ لڑائیاں ہوئیں' طاعون پڑی' قحط پڑے' مگر آخر وہ علامت ظاہر ہوئی جسے انجیل اور زردشتیوں کی کتاب جاماسی نے تو ان عام الفاظ میں بیان کیا ہے کہ سورج اور چاند اندھیرے ہو جائیں گے مگر اسلامی کتب میں اس کو زیادہ وضاحت سے بیان کیا گیا ہے یعنی بتایا گیا ہے کہ رمضان کے مہینہ میں سورج کو اس کی گرہن کی تاریخوں میں سے دوسری کو اور چاند کو اس کی گرہن کی تاریخوں میں سے پہلی تاریخ کو مہدی کے زمانہ میں گرہن لگے گا اور یہاں تک زور دیا گیا تھا کہ یہ علامت مہدی سے پہلے کسی مدعیٔ مہدویت کے لئے مقرر نہیں کی گئی۔ [۵]۔ چنانچہ یہ نشان بھی پورا ہوا اور اس نشان نے تمام مدعیان مسیحیت اور مہدویت کے مقابلہ میں آپ کے دعوے کو ممتاز کرکے دکھایا۔ یہ گرہن ۱۸۹۴ء میں آپ کے دعوے کے چوتھے سال رمضان کے مہینہ میں عین انہی تاریخوں میں جو بتائی گئی تھیں لگا اور یہ عجیب بات ہے کہ گو کئی مدعی مہدویت اور مسیحیت کے پہلے گذرے ہیں کسی کے زمانہ میں یہ نشان ظاہر نہیں ہوا۔

آپ کے زمانہ میں وہ غیر معمولی حالت بھی پیدا ہوئی جو پہلی کتب میں بتائی گئی تھی اور اس زمانہ سے پہلے کبھی دنیا میں اس کا ظہور نہیں ہوا۔ یعنی کہا گیا تھا کہ اس زمانہ میں اس قدر امن بھی ہو گا کہ بچے سانپوں سے اور بکریاں بھیڑیوں سے بے خوف کھیلیں گی [۶]۔ لیکن لڑائیاں بھی بکثرت ہوں گی [۷]۔ گویا امن اور جنگ ایک ہی وقت میں دنیا میں پائے جائیں گے۔ چنانچہ یہ بات نہایت

ممتاز طور پر آجکل دنیا میں نظر آتی ہے کہ ایک طرف تو حب الوطنی کے جذبات اس قدر ترقی پر ہیں کہ ان کے اثر کے ماتحت تمام اقوام کا اندرونی انتظام پہلے زمانوں کی عام حالت سے بدرجہا اچھا ہے اور وہ جھگڑے اور لڑائیاں اور لوٹ مار جو پہلے زمانوں میں ملکوں میں ہوتی تھی اب دنیا کے بیشتر حصہ سے مفقود ہے مگر اس کے مقابلہ میں بین الاقوام تعلقات بالکل خراب ہیں اور ہر قوم دوسری قوم سے خائف و ترسان ہے اور قومی حسد انتہاء کو پہنچ گیا ہے۔

ان کے علاوہ مسلمانوں میں آنے والے موعود کی نسبت نہایت تفصیل سے پیشگوئیاں موجود ہیں وہ سب اپنے اپنے رنگ میں پوری ہو چکی ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس موعود کی پیدائش کے زمانہ میں ایک نئی سواری ایجاد ہو گی جس کے سبب سے اونٹ ترک کر دیئے جائیں گے[8]۔ چنانچہ ریل ایجاد ہو چکی ہے اور ایسی ایجاد ہو گی کہ تمام دنیا کی خبر ایک آن میں سنی جاسکے گی[9]۔ چنانچہ تار ایجاد ہو چکی ہے۔ پھر لکھا تھا اس وقت عورتیں زیادہ ہو جائیں گی[10]۔ اور تجارتی کاروبار میں سے چیزوں کے فروخت کرنے کا کام عورتوں کے سپرد ہو گا[11]۔ اور عورتوں کے لباس ایسے ہوں گے کہ ان کا جسم کا وہ حصہ جسے پہلے لوگ بھی خواہ وہ عورتوں کے پردہ کے قائل نہ تھے پردہ کے قابل سمجھا کرتے تھے ننگا نظر آئے گا[12]۔ اور اس وقت تین بڑی حکومتیں تین بڑی حکومتوں سے لڑیں گی اور تین جو فاتح ہونگی قسطنطنیہ پر قبضہ کرلیں گی[13]۔ لیکن ایک شخص قسطنطنیہ سے بھاگ کر شام کی طرف چلا جائے گا اور وہاں سے جنگ کر کے اپنے علاقہ کو واپس لے لے گا۔ اسی طرح لکھا تھا کہ اس وقت نصاریٰ کو دیگر اقوام پر غلبہ ہو گا[14]۔ اور ملک عرب دوسرے صوبوں سے الگ ہو جائے گا اور عراق اور شام اور مصر کی حکومتیں الگ قائم ہو جائیں گی[15]۔ اور ایک قوم مہینوں کو چھوٹا کر دے گی[16]۔ اسلامی شریعت کی مقرر کردہ حدود ترک کر دی جائیں گی[17]۔ جوا کثرت سے پھیل جائے گا[18]۔ پولیس کثرت سے مقرر ہو گی[19]۔ عورتوں میں مردوں کے لباس کا رواج ہو جائے گا[20]۔ مزدوروں کی حکومت ہو گی۔[21]۔ امراء غرباء کے لئے اپنے مالوں کی زکوٰۃ نکالنے کو بوجھ خیال کریں گے[22]۔ اسلامی حکومتیں مٹ جائیں گی[23]۔ عرب کی دینی حالت بہت خراب ہو جائے گی[24]۔ بے جان چیزیں بولیں گی[25]۔ جس سے فونوگراف وغیرہ کی ایجاد کی طرف اشارہ ہے' ایسی سواریاں دریافت ہوں گی جو اس سے پہلے دنیا میں موجود نہ تھیں جس سے ہوائی جہاز وغیرہ کی طرف اشارہ ہے[26]۔ دو سمندروں کے درمیان ایک خشکی جس کے ایک طرف مونگا پایا جاتا ہے اور دوسری طرف موتی' اس کو پھاڑ کر دونوں سمندروں کو ملا دیا جائے گا اور اس میں سے کثرت

سے جہاز گذریں گے [۲۷]۔ جو سویز اور پانامہ کی نہروں کی طرف صاف اشارہ ہے۔ پھر لکھا تھا کہ اس وقت کتابیں اور اخبارات کثرت سے شائع ہوں گے [۲۸]۔ علوم ہیئت کے بہت انکشاف ہونگے [۲۹]۔ دریاؤں میں سے نہریں نکالی جائیں گی [۳۰]۔ حتیٰ کہ اصل دریا قریباً خشک ہو جائیں گے ' پہاڑوں کو اڑا دیا جائے گا [۳۱]۔ سفر کا رواج زیادہ ہو جائے گا [۳۲]۔ بعض ممالک کی اصل آبادی تباہ کردی جائے گی ستی وغیرہ کی قدیم رسوم قانوناً بند کردی جائیں گی [۳۳]۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب پیشگوئیاں اس زمانہ میں پوری ہو چکی ہیں۔

اسی طرح بتایا گیا تھا کہ یہ موعود دو بیماریوں میں مبتلاء ہو گا ایک دھڑ کے اوپر کے حصہ سے تعلق رکھے گی اور ایک نچلے دھڑ سے [۳۴]۔ اور یہ کہ اس کا رنگ گندم گوں ہو گا ' سر کے بال سیدھے ہونگے [۳۵]۔ اور یہ کہ اس کے کلام میں لکنت ہو گی [۳۶]۔ کسانوں کے خاندان میں سے ہو گا [۳۷]۔ اور وہ بات کرتے وقت ہاتھ کو ران پر مارے گا [۳۸]۔ اور کدعہ نامی گاؤں سے ظاہر ہو گا [۳۹]۔ مسیحیت اور مہدویت کی دو شانوں کا جامع ہو گا [۴۰]۔ چنانچہ اسی طرح ہوا۔ آپ کو دوران سر اور ذیابیطس کی دو بیماریاں تھیں رنگ گندم گوں اور بال سیدھے تھے اور آپ کے کلام میں خفیف لکنت پائی جاتی تھی اور بات کرتے وقت آپ کو ران پر ہاتھ مارنے کی عادت تھی۔ آپ کسانوں کے خاندان میں سے تھے اور قادیان کے باشندے تھے جسے عوام الناس کادی کے لفظ سے پکارتے ہیں۔ غرض جب سب پیشگوئیوں پر مجموعی حیثیت سے نظر ڈلیں تو سوائے اس زمانہ کے اور کسی زمانہ پر اور سوائے آپ کے وجود کے اور کسی شخص پر وہ چسپاں نہیں ہوتیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہی زمانہ اس موعود کے ظہور کا ہے جس کی خبر پہلے نبیوں نے دی تھی اور آپ ہی وہ موعود ہیں جن کی انتظار میں صدیوں سے لوگ بیٹھے تھے۔ اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان علامتوں میں سے بہت سی علامتوں کے پورا ہونے سے پہلے بانی سلسلہ احمدیہ نے بذریعہ خاص الہام کے ان کے پورا ہونے کی خبر دی تھی جیسے طاعون کی آمد ' یورپ کی جنگ عظیم ' زار روس کی معزولی اور روس سے آئندہ بادشاہت کا مٹ جانا اور زار روس اور اس کے خاندان کی قابل رحم حالت اور عالمگیر زلزلوں کا آنا ' انفلوئنزا کا حملہ وغیرہ وغیرہ تو ہمارا یقین اور ایمان اور بھی بڑھ جاتا ہے اور ہم اس امر پر ایمان لانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور ہر شخص جو انصاف پسندی سے کام لے گا اور فیصلہ میں جلدی نہ کرے گا بلکہ سوچ کر اور غور کر کے فیصلہ کرے گا اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ خدا تعالیٰ نے بانی سلسلہ احمدیہ میں تمام اقوام کی امیدوں کو پورا کردیا ہے اور اس کی رحمت

کا دریا دلوں کی خشک زمینوں کو سیراب کرنے کے لئے اپنے کناروں سے اُچھل کر بہہ پڑا ہے۔ پس مبارک ہے وہ جو اس پانی کو اپنے کھیت میں جمع کرتا ہے اور اِباء اور استکبار سے کام نہیں لیتا اور دین کو دنیا پر مقدم کرتا ہے۔

اس امر کے بیان کر چکنے کے بعد کہ احمدی جماعت دوسرے مذاہب یا فرقوں سے اس لئے جدا ہے کہ اس نے ان نشانات کو دیکھ کر جو آخری زمانہ کے مصلح کے لئے بطور علامت بتائے گئے تھے حضرت مرزا غلام احمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دعویٰ کو قبول کر لیا ہے اور وہ اب دوسری قوموں کی طرح کسی اور مصلح کی جو اس زمانہ کے لئے مقدر ہو منتظر نہیں ہے اب میں بتانا چاہتا ہوں کہ بانی سلسلہ احمدیہ نے اپنی آمد کی غرض کیا بتائی ہے؟

آپ فرماتے ہیں

"وہ کام جس کے لئے خدا نے مجھے مامور فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ خدا میں اور اس کی مخلوق کے رشتہ میں جو کدورت واقع ہو گئی ہے اس کو دور کر کے محبت اور اخلاص کے تعلق کو دوبارہ قائم کروں اور سچائی کے اظہار سے مذہبی جنگوں کا خاتمہ کر کے صلح کی بنیاد ڈالوں اور وہ دینی سچائیاں جو دنیا کی آنکھ سے مخفی ہو گئی ہیں ان کو ظاہر کر دوں اور وہ روحانیت جو نفسانی تاریکیوں کے نیچے دب گئی ہے اس کا نمونہ دکھاؤں اور خدا کی طاقتیں جو انسان کے اندر داخل ہو کر توجہ یا دعا کے ذریعہ سے نمودار ہوتی ہیں حال کے ذریعہ سے نہ محض مقال سے ان کی کیفیت بیان کروں اور سب سے زیادہ یہ کہ وہ خالص اور چمکتی ہوئی توحید جو ہر ایک قسم کے شرک کی آمیزش سے خالی ہے جو اب نابود ہو چکی ہے اس کا دوبارہ قوم میں دائمی پودا لگادوں اور یہ سب کچھ میری قوت سے نہیں ہو گا بلکہ اس خدا کی طاقت سے ہو گا جو آسمان اور زمین کا خدا ہے"[۴۱]

"خدا تعالیٰ نے مجھے مطلع کیا ہے تا میں گمراہوں کو متنبہ کروں اور ان کو جو تاریکی میں رہتے ہیں روشنی میں لاؤں۔"[۴۲]

"خدا تعالیٰ نے مجھے بھیجا تا میں اس خطرناک حالت کی اصلاح کروں اور لوگوں کو خالص توحید کی راہ بتاؤں چنانچہ میں نے سب کچھ بتا دیا اور نیز میں اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ تا ایمانوں کو قوی کروں اور خدا تعالیٰ کا وجود لوگوں پر ثابت کر کے دکھلاؤں کیونکہ ہر ایک قوم کی ایمانی حالتیں نہایت کمزور ہو گئی ہیں اور عالم آخرت صرف ایک افسانہ سمجھا جاتا

ہے اور ہر ایک انسان اپنی عملی حالت سے بتا رہا ہے کہ وہ جیسا کہ یقین دنیا اور دنیا کی جاہ و مراتب پر رکھتا ہے اور جیسا کہ اس کو بھروسہ دنیوی اسباب پر ہے یہ یقین اور یہ بھروسہ ہرگز اس کو خدا تعالیٰ اور عالم آخرت پر نہیں۔ زبانوں پر بہت کچھ ہے مگر دلوں میں دنیا کی محبت کا غلبہ ہے۔ حضرت مسیح نے اسی حالت میں یہود کو پایا تھا اور جیسا کہ ضعفِ ایمان کا خاصہ ہے یہود کی اخلاقی حالت بھی بہت خراب ہو گئی تھی اور خدا کی محبت ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اب میرے زمانہ میں بھی یہی حالت ہے سو میں بھیجا گیا ہوں کہ تا سچائی اور ایمان کا زمانہ پھر آوے اور دلوں میں تقویٰ پیدا ہو۔ سو یہی افعال میرے وجود کی عِلّتِ غائی ہیں۔ مجھے بتلایا گیا ہے کہ پھر آسمان زمین کے نزدیک ہو گا بعد اس کے کہ بہت دور ہو گیا تھا سو میں انہی باتوں کا مجدّد ہوں اور یہی کام ہیں جن کے لئے میں بھیجا گیا ہوں۔"[۴۳]

پھر آپ فرماتے ہیں کہ آپ اس لئے دنیا کی طرف بھیجے گئے کہ تا:

"دنیا کو اخلاقی اور اعتقادی اور علمی اور عملی سچائی کی طرف کھینچا جائے اور نیز یہ کہ وہ خاص کشش سے ایسے طور سے کھنچ جائیں کہ ان امور کی بجا آوری میں ان کو ایک قوت حاصل ہو۔"[۴۴]

پھر آپ تحریر فرماتے ہیں کہ آپ کی اولاد میں سے ایک اسیروں کی رستگاری کا موجب ہو گا[۴۵]۔ یعنی اس کے ذریعہ سے بہت سی قومیں اور جماعتیں اور ملک جو دوسری قوموں اور جماعتوں یا حکومتوں کے ظلم کے نیچے دبی ہوئی ہونگی ظلموں سے نجات پائیں گی اور اپنی اپنی قیدوں سے آزاد کی جائیں گی اور خدا تعالیٰ ان کی مشکلات کو دور کر کے ان کو راحت اور آرام کی زندگی نصیب کرے گا۔

پھر آپ فرماتے ہیں کہ آپ کا کام یہ ہے کہ اول "تمام قوموں پر اسلام کی سچائی کی حجت پوری کریں"[۴۶]۔ دوم۔ "اسلام کو غلطیوں اور الحاقاتِ بے جا سے منزّہ کر کے وہ تعلیم جو روح و راستی سے بھری ہوئی ہے خلق اللہ کے سامنے رکھیں"[۴۷]۔ سوم۔ "ایمانی نور کو تمام قوموں کے مستعد دلوں کو بخشیں"۔[۴۸]

ان تمام دعاوی سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا کام کامل توحید کی اشاعت اور نیکی اور تقویٰ کا قیام اور دلوں میں خشیت اللہ کا پیدا کرنا اور خدا تعالیٰ سے بندوں کا تعلق مضبوط کرنا اور شک اور

شُبہ سے نکال کر یقینی ایمان لوگوں کو عطا کرنا اور دلوں کو بے اطمینانی کی حالت سے بچا کر سکون اور آرام دینا اور علوم آسمانی کو کھولنا اور اخلاقی اور روحانی اور علمی اور عملی مشکلات کو حل کرنا اور مظلوموں کو آسمانی حربوں کے ذریعہ سے ظلموں سے بچانا اور جن جماعتوں کے حق غصب ہو چکے ہیں ان کے حقوق واپس دلانا اور دنیا میں سے جنگ اور فساد کو دور کر کے باہمی صلح کرانا اور سب دنیا کو ایک دین اور ایک کلمہ پر جمع کرنا اور تمام اقوام تک سچائی کو پہنچانا اور اسلام کو الحاقی غلطیوں سے پاک کرنا اور اس کے سچے علوم کو دنیا کے سامنے پیش کرنا اور خدا تعالیٰ کی طرف سے نشانات ظاہر کر کے لوگوں پر اس کے جلال کو ظاہر کرنا تھا۔

کیسا شاندار کام اور کیسا شاندار مستقبل ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا کوئی مدعی آج تک ایسا بھی گذرا ہے جو ان امور کے خلاف کہتا ہو؟ ہر ایک مدعی ہمیشہ دنیا کے سامنے ایسے ہی شاندار مستقبل اور ایسے ہی شاندار مقاصد رکھا کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ بغیر اس کے لوگ اس کی طرف توجہ نہیں کریں گے اور اس زمانہ میں جبکہ اشاعت پر ہی ہر ایک کام کی بنیاد ہے ایسے خوشنما اعلان نہایت ہی ضروری ہیں۔ پس اگر صرف ان اعلانوں تک ہی آپ کے دعویٰ کی بنیاد رہتی تو آپ کا دعویٰ ہرگز قابل قبول نہ ہوتا اور دوسرے مدعیوں کے مقابلہ میں اسے کوئی خاص فوقیت حاصل نہ ہوتی لیکن جیسا کہ میں ابھی بتاؤں گا آپ نے ایسی تعلیم دی ہے اور وہ قواعد مقرر فرمائے ہیں کہ ہر ایک عقلمند انسان سمجھ سکتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے وہ اغراض بوجہ احسن پوری ہو سکتی ہیں جو آپ نے اپنے آنے کا موجب قرار دی ہیں۔

مگر اس جگہ ایک سوال ہے اور میرے نزدیک اس سوال کا سمجھنا لوگوں کے لئے بہت مشکل ہے مگر اس کے سمجھنے کے بغیر احمدیت کی حقیقت بھی سمجھ میں نہیں آسکتی اور وہ یہ ہے کہ جب بانی سلسلہ احمدیہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ علوم قرآن کریم کی اشاعت کے لئے آئے ہیں اور اپنے آپ کو ایک مسلمان قرار دیتے ہیں اور امت محمدیہ میں سے ایک فرد تو ان کی ضرورت اور سلسلہ کی اہمیت بحیثیت ایک جماعت کے کیا باقی رہ جاتی ہے؟ تب تو ان کی حیثیت ایک عالم یا ایک صوفی کی رہ جاتی ہے اور سلسلہ احمدیہ محض ایک علمی جماعت کے دوسرے درجہ کی حیثیت پر جا گرے گا لیکن یہ خیال صداقت سے بالکل دور ہو گا اور سلسلہ احمدیہ کے سمجھنے سے بالکل محروم کر دے گا۔

اصل بات یہ ہے کہ احمدیت کا یہ عقیدہ ہے کہ انبیاء دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو شریعت

لاتے ہیں اور ایک وہ ہیں جو اس شریعت کو قائم کرنے آتے ہیں اور جو نقائص مرور زمانہ سے مذہب میں پیدا ہو گئے تھے ان کو دور کرتے ہیں تمام مذہبی سلسلوں کا اس امر پر اتفاق ہے اور موسوی سلسلہ کے انبیاء اس فرق کی ایک کھلی مثال ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام شریعت لانے والے نبی تھے آپ کے زمانے میں ہارون اور آپ کے بعد یوشع اور ان کے بعد آنے والے نبی بشمولیت حضرت مسیح عَلَیْہِمُ السَّلَامُ سب کے سب موسیٰ کی شریعت کو قائم کرنے کے لئے آئے تھے۔ حضرت مسیح خود فرماتے ہیں "یہ خیال مت کرو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتاب منسوخ کرنے کو آیا۔ میں منسوخ کرنے کو نہیں بلکہ پوری کرنے کو آیا ہوں"[۴۹]۔ اس امر کے متعلق کہ موسیٰ کی شریعت آپ کے زمانہ تک اور آپ کے شاگردوں کے لئے بھی جاری تھی اس نصیحت سے جو آپ نے اپنے شاگردوں اور دوسروں کو کی ظاہر ہے یعنی "فقیہہ اور فریسی موسیٰ کی گدی پر بیٹھے ہیں اس لئے جو کچھ وہ تمہیں ماننے کو کہیں مانو اور عمل میں لاؤ لیکن ان کے سے کام نہ کرو کیونکہ وہ کہتے ہیں پر کرتے نہیں"[۵۰]۔

بے شک مسیح کی بعض تعلیموں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ توریت سے مختلف ہیں لیکن اگر ہم توریت کو غور سے دیکھیں تو ان کا بیج ہمیں توریت میں نظر آتا ہے بلکہ خود حضرت مسیح نے ان تعلیموں کے متعلق فرمایا ہے کہ یہ تعلیمیں بھی نئی نہیں ہیں بلکہ وہی ہیں جو پہلے توریت میں بیان ہو چکی ہیں۔ چنانچہ آپ اس پہاڑی وعظ کے بعد جس کی نصائح کو توریت سے جُدا سمجھا جاتا ہے فرماتے ہیں "توریت اور نبیوں کا خلاصہ یہی ہے"[۵۱]۔

غرض انبیاء دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو نئی شریعت لاتے ہیں جیسے کہ موسیٰ علیہ السلام اور ایک وہ جو پرانی شریعت کو قائم کرتے ہیں بعد اس کے کہ لوگوں کے خیالات کی ملونی سے وہ حقیقت سے دور ہو گئی ہو جیسے کہ ایلیاہ' یسعیاہ' حزقیل' دانیال اور مسیح عَلَیْہِمُ السَّلَامُ۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا دعویٰ بھی مؤخر الذکر قسم کے نبیوں کی طرح ایک نبی ہونے کا تھا اور خصوصاً آپ اس امر کے مدعی تھے کہ جس طرح موسوی سلسلہ کے آخری خلیفہ حضرت مسیح ناصری تھے اسی طرح اسلام کے آخری خلیفہ آپ تھے اور اس وجہ سے احمدیت کو دوسرے مسلمان فرقوں کے مقابلہ پر بالکل اسی مقام پر سمجھنا چاہئے کہ جس پر یہودیت کے مقابلہ میں مسیحیت ہے۔ ہم لوگ یہ یقین کرتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ حضرت موسیٰ کی اس پیشگوئی کے

پورا کرنے والے تھے جو استثناء باب ۱۸ آیت ۱۸ میں بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے ایک موسیٰ جیسے نبی یعنی صاحب شریعت نبی کے آنے کے متعلق ہے آپ بھی ایک جدید شریعت لائے اور بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسماعیل میں سے تھے۔ قرآن کریم آپ کے اس پیشگوئی کا مصداق ہونے کے متعلق ان الفاظ میں دعویٰ کرتا ہے

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلاً شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلاً [52]۔ ہم نے تمہاری طرف ایک رسول بھیجا ہے جو شریعت کے احکام پر تم سے اپنی نگرانی میں عمل کرا کے ان کو قائم کرتا ہے اسی طرح جس طرح ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا تھا۔ اب اگر آنحضرت ﷺ موسیٰ کے مثیل تھے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ مسیح ثانی جس کا وعدہ دیا گیا تھا وہ آپ کی شریعت کو ہی رائج کرنے والا ہو جس طرح مسیح ناصری توریت کے احکام کو دنیا میں قائم کرنے کے لئے آئے تھے اور اس کی جماعت کا اسلام سے وہی تعلق ہو جو ابتدائی صدیوں میں مسیحیت کا یہودیت سے تھا۔

اس تفصیل سے آپ لوگوں پر یہ امر تو اچھی طرح واضح ہو گیا ہو گا کہ اسلام اور احمدیت کا کیا تعلق ہے لیکن ابھی تک یہ واضح نہیں ہوا کہ پھر احمدیت کی اہمیت کیا ہے؟ ایک امر کی طرف تو میں پہلے ہی اشارہ کر چکا ہوں کہ ایسے نبیوں کا ایک کام جو شریعت کے بغیر آتے ہیں یہ ہوتا ہے کہ وہ مرورِ زمانہ سے جو غلط خیالات اس مذہب میں داخل ہو جاتے ہیں ان کو دور کر کے اصل حقیقت کو آشکار کرتے ہیں۔ اور یہ بھی ایک بہت بڑا کام ہے ضرورت کے وقت پرانی گمشدہ شے کو تلاش کر دینا ویسا ہی بڑا کام ہے جیسے کہ نئی چیز کا لانا۔ لیکن ہمارے نزدیک حضرت مسیح موعود کا کام اس سے بھی بڑا تھا مگر اس کام کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے یہ سمجھ لیا جائے کہ ہم لوگ قرآن کریم کو کیا سمجھتے ہیں ہم لوگوں کا برخلاف دوسرے مسلمانوں کے یہ عقیدہ ہے کہ قرآن کریم کے معارف پہلے زمانوں پر ختم نہیں ہو گئے بلکہ قرآن کریم خدا کا مکمل کلام ہے اور مکمل کلام کے لئے یہ شرط ہوتی ہے کہ جس طرح خدا تعالیٰ کا فضل غیر محدود عجائبات کا خزانہ ہے جو وقت اور ضرورت پر ظاہر ہوتے رہتے ہیں اسی طرح خدا کا قول بھی غیر محدود عجائبات کا خزانہ ہو جو ہر روحانی اور اخلاقی ضرورت کے وقت اس کا علاج بتائے۔ دنیا جب سے پیدا ہوئی ہے اس کے اندر خدا تعالیٰ نئی نئی چیزیں نہیں پیدا کرتا لیکن اس کی ایک ایک چیز میں اس قدر عجائبات اور اسرار ہیں کہ ایک چیز بھی دنیا کی نہیں جس کی نسبت یہ کہا جا سکے کہ انکشافات ختم ہو گئے ہیں اور

اب اس میں سے کسی نئی طاقت یا اس کے کسی نئے فائدے کا معلوم ہونا ناممکن ہے۔ انسانی جسم کے اسرار بھی ابھی تک پورے طور پر ظاہر نہیں ہو سکے کجا یہ کہ انسان اپنے غیر کے اسرار کو بالاستیعاب دریافت کر سکتا۔ پس جب یہ حال اس قانون قدرت کا ہے جو ایک عارضی فائدہ اور عارضی نفع کے لئے بنایا گیا ہے تو کلام الٰہی کو جو معالج روحانی کا قائم مقام ہے کس قدر عجائبات اور اسرار اور فوائد پر مشتمل ہونا چاہئے اور اس کی مخفی طاقتوں کا خزانہ کیسا غیر محدود ہونا چاہئے۔ ہمارے نزدیک اور ہم سمجھتے ہیں کہ ہر ایک عقلمند انسان کے نزدیک کامل کلام کے اندر اس خوبی کا پایا جانا ضروری ہے اور جس کلام میں یہ خوبی نہیں وہ ہرگز خدا کا کامل کلام نہیں کہلا سکتا۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام اپنے مخالفوں کو جو قرآن کریم کے علوم کی نسبت یہ خیال کرتے تھے کہ وہ سب کے سب پہلے لوگوں پر ختم ہو چکے مخاطب کر کے یوں فرماتے ہیں۔

"جاننا چاہئے کہ کھلا کھلا اعجاز قرآن شریف کا جو ہر ایک قوم اور ہر ایک اہل زبان پر روشن ہو سکتا ہے جس کو پیش کر کے ہم ہر ایک ملک کے آدمی کو خواہ وہ ہندی ہو یا پارسی یا یوروپین یا امریکن یا کسی اور ملک کا ہو ملزم و ساکت ولاجواب کر سکتے ہیں وہ غیر محدود معارف و حقائق و علوم حکمیہ قرآنیہ ہیں جو ہر زمانہ میں اس زمانہ کی حاجت کے موافق کھلتے جاتے ہیں اور ہر ایک زمانہ کے خیالات کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلّح سپاہیوں کی طرح کھڑے ہیں۔ اگر قرآن شریف اپنے حقائق ودقائق کے لحاظ سے ایک محدود چیز ہوتی تو ہرگز وہ معجزہ تامہ نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ فقط بلاغت و فصاحت ایسا امر نہیں ہے جس کی اعجازی کیفیت ہر ایک خواندہ وناخواندہ کو معلوم ہو جائے کھلا کھلا اعجاز اس کا تو یہی ہے کہ وہ غیر محدود معارف ودقائق اپنے اندر رکھتا ہے۔ جو شخص قرآن شریف کے اس اعجاز کو نہیں مانتا وہ علم قرآن سے سخت بے نصیب ہے۔

اے بندگانِ خدا! یقیناً یاد رکھو کہ قرآن شریف میں غیر محدود معارف و حقائق کا اعجاز ایسا کامل اعجاز ہے جس نے ہر ایک زمانہ میں تلوار سے زیادہ کام کیا ہے اور ہر ایک زمانہ اپنی نئی حالت کے ساتھ جو کچھ شبہات پیش کرتا ہے یا جس قسم کے اعلیٰ معارف کا دعویٰ کرتا ہے اس کی پوری مدافعت اور پورا الزام اور پورا پورا مقابلہ قرآن شریف میں موجود ہے۔ کوئی شخص برہمو ہو یا بدھ مذہب والا آریہ یا کسی اور رنگ کا فلسفی کوئی ایسی الٰہی صداقت نکال نہیں سکتا جو قرآن شریف میں پہلے سے موجود نہ ہو۔

قرآن شریف کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہو سکتے اور جس طرح صحیفہ فطرت کے عجائب وغرائب خواص کسی پہلے زمانہ تک ختم نہیں ہو چکے بلکہ جدید در جدید پیدا ہوتے جاتے ہیں یہی حال ان صحف مطہرہ کا ہے تا خدا تعالیٰ کے قول اور فعل میں مطابقت ثابت ہو"۵۳

یہ وہ نکتہ عظیمہ ہے جسے حضرت مسیح موعود نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ مسلمان یہ تو خیال کرتے تھے کہ قرآن کریم کامل ہے لیکن تیرہ سو سال تک ان کے ذہن اس طرف نہیں گئے کہ وہ صرف کامل ہی نہیں بلکہ ایک خزانہ ہے جس میں آئندہ زمانوں کی ضروریات کے سامان بھی مخفی رکھے گئے ہیں اور اس کی تحقیق اور تجسّس سے بھی اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر علوم نکلیں گے جس طرح کہ نیچر پر غور کرنے سے علوم نکلتے ہیں۔ بانی سلسلہ احمدیہ نے اس نکتہ کے پیش کرنے سے روحانی عالم میں ایجاد کا ایک وسیع دروازہ کھول دیا ہے جس کا مقابلہ علوم سائنس کی دریافت نہیں کر سکتی۔ بانی سلسلہ احمدیہ نے یہی نہیں کیا کہ ان مسائل کو جو مرور زمانہ سے بگڑ چکے تھے پھر اصلی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے قرآن کریم کو ایسی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا کہ اس کی تمام وہ ضروریات ذہنی اور علمی جو اس وقت کے متغیر حالات کے سبب سے پیدا ہو رہی تھیں قرآن کریم سے پوری ہو گئیں اور آئندہ کے لئے بھی تمام مشکلات کے حل کی کنجی مل گئی۔

اس میں کیا شک ہے کہ دنیا اس وقت بعض صداقتوں اور بعض تمدنی مشکلات کے حل کے لئے پیاسے کی طرح حیران پھر رہی ہے۔ حتیٰ کہ بعض لوگ مذہبی کتب میں ان مشکلات کا حل نہ پا کر ان کتب سے ہی بیزار ہو گئے ہیں اور بعض لوگ نئی شریعتوں کے بنانے کی طرف مائل ہیں اور دنیا کی مصیبت کو اور بھی زیادہ کر رہے ہیں۔ لیکن جیسا کہ آپ لوگوں پر ابھی ظاہر ہو جائے گا ان تمام مشکلات کا حل اس تعلیم میں موجود ہے جو بانی سلسلہ احمدیہ نے دنیا کے سامنے پیش کی ہے۔ وہ بیشک قرآن کریم میں موجود تھی مگر اس کے ایک حصہ کی تو یہ حالت تھی کہ جیسے صاف پانی میں کوئی باہر کی ناپسندیدہ آلائش شامل ہو جائے اور بعض حصہ کی یہ حالت تھی جیسے زیر زمین چشمہ بہہ رہا ہو لیکن ہمیں معلوم نہ ہو کہ یہاں پانی ہے آپ نے آمیزش والے پانی کو چھان کر صاف کیا اور زیر زمین چشمہ کا ہمیں پتہ دیا اور ہمیشہ کے لئے ہماری آنکھوں پر سے پردہ اٹھا دیا اور تحقیق اور انکشاف کا ایک وسیع دروازہ کھول دیا مگر اس حدبندی کے ساتھ کہ اسلام کی وہ شکل بھی جو

رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں قائم کی گئی تھی اور جسے اللہ تعالیٰ ہمیشہ محفوظ رکھنا چاہتا ہے محفوظ رہے اور جدید ضروریات کا سامان بھی مہیا ہوتا رہے۔

مذکورہ بالا حقیقت کے معلوم ہونے کے بعد اس امر کا سمجھنا بالکل آسان ہے کہ باوجود قرآن پر ایمان لانے کے اور مسلمان کہلانے کے احمدیہ جماعت موجودہ مسلمان فرقوں میں سے ایک فرقہ ان معنوں میں کہ جن معنوں میں عُرفاً فرقہ کا لفظ بولا جاتا ہے نہیں ہے بلکہ وہ اپنے دعویٰ کے مطابق آج سے تیرہ سو سال پہلے کا اسلام پیش کرنے والی جماعت ہے جو قرآن کریم کے غیر محدود علوم کا انکشاف کرکے اپنے دوسرے بھائیوں کو ان سے حصہ دینے کے لئے کھڑی ہوئی ہے۔ اس کا وجود کسی خاص خیال کی ارتقائی ترقی کا نتیجہ نہیں ہے نہ کسی خاص فرقہ کی طبعی رَو کی آخری موج بلکہ وہ ایک نیا اُبال ہے جس نے دو سمت کا رخ کیا ہے ایک لہر اس کی تو ماضی کی طرف شدت سے نکل گئی ہے اور آج سے تیرہ سو سال پہلے کے زمانہ تک چلی گئی ہے اور دوسری لہر اس کی موجودہ اور آئندہ زمانوں کی ضروریات کا احاطہ کرتی ہوئی نکل گئی ہے۔ یہ ایک ایسی لہر ہے جس نے صرف مشرق اور مغرب کو ہی نہیں ملایا بلکہ ماضی اور مستقبل کو بھی ایک جگہ جمع کردیا ہے اور اب ہم بِلاشُبہ اور شک کے کہہ سکتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ جن پر آخری اور مکمل شریعت نازل ہوئی آدمِ تکمیلِ شریعت تھے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام جن کو اللہ تعالیٰ نے علومِ قرآنیہ کی وسعت اور ہر زمانہ کی ضروریات کے علاج پر مشتمل ہونے کی حقیقت کے اظہار کے لئے بھیجا ہے وہ آدم تکمیل اشاعت تھے جس طرح کہ پہلا آدم تکمیلِ انسانیت تھا۔

اس احمدی عقیدہ کا بیان کردینا میرے مضمون کے لئے نہایت ہی ضروری تھا کیونکہ جیسا کہ میں نے بتایا ہے احمدیت کسی جدید مذہب کا نام نہیں ہے اگر بِلا اس تشریح کے میں احمدیت کی تعلیم اور اس کے اصول کو بتاتا تو چونکہ وہ قرآن کریم پر مبنی ہوتے آپ لوگوں کے لئے اس امر کا سمجھنا مشکل ہو جاتا کہ میں احمدیت کا ذکر کر رہا ہوں یا اسلام کا حالانکہ جیسا کہ آپ لوگوں نے اب معلوم کرلیا ہوگا احمدیت اور اسلام ایک ہی چیز کا نام ہے اور احمدیت سے مراد صرف وہ حقیقتِ اسلام ہے جو اس زمانہ کے موعود کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے ظاہر فرمائی ہے۔

پس احمدیت کی تمام بناء قرآن کریم اور شریعت اسلام پر ہے مگر باوجود اس کے احمدیت دوسرے مسلمان فرقوں سے بالکل مختلف ہے کیونکہ احمدیت اپنی تعلیم میں ان خیالات سے جو اس وقت مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں رائج ہیں بالکل مختلف ہے۔ اس کے ذریعے سے بہت

سی صداقتیں جو دنیا سے مفقود ہو چکی تھیں دوبارہ ان کو دنیا کے سامنے پیش کیا گیا ہے اور بہت سی صداقتیں جو اس زمانہ سے خاص ہیں پہلے لوگوں کو معلوم ہی نہ تھیں ان کو ظاہر کیا گیا اور بہت سے علوم قرآنیہ جو الفاظ کے نیچے مدفون چلے آتے تھے ان کو نکال کر علمی دنیا کو مالا مال کر دیا گیا ہے۔ پس جب میں اپنے مضمون میں یہ کہوں کہ اسلام کی یہ تعلیم ہے تو اس سے مراد وہی تعلیم ہوگی جو احمدی نقطہ نگاہ کے مطابق ہے خواہ دوسرے لوگ اس کو قبول کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں اور جب میں یہ کہوں کہ احمدیت کی یہ تعلیم ہے تو اس سے مراد بھی وہ تعلیم ہوگی جو اسلام نے پیش کی ہے نہ کوئی جدید تعلیم۔

مگر پیشتر اس کے کہ میں ان تعلیمات اور خصوصیات کو بیان کروں جو احمدیت کو دوسرے مذاہب سے ممتاز کر دیتی ہیں میں تمہیداً اس امر کو بیان کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ گو بانیانِ مذہبی کانفرنس کی اس کانفرنس کے قیام سے کچھ بھی غرض ہو میرے نزدیک ایسی کانفرنس کی سب سے بڑی غرض یہی ہونی چاہئے کہ ان کے ذریعہ سے لوگوں کو اس امر کے موازنہ کرنے کا موقع ملے کہ کونسا مذہب ان کو اس مقصد کے حصول میں مُمِد ہو سکتا ہے جس مقصد کے لئے مذہب کی جستجو کی جاتی ہے۔ پس گو یہ ضروری نہیں کہ ان مضامین میں جو اس موقع پر پڑھے جاتے ہیں ہر اک حکم کو بیان کیا جائے مگر یہ ضروری ہے کہ ہر مذہب کی اصولی تعلیم کا ایک مختصر مگر مکمل نقشہ پیش کر دیا جائے جس سے لوگ اس امر کا اندازہ کر سکیں کہ اس مذہب میں تمام اہم ضروریات کو پورا کرنے کے سامان موجود ہیں اور صرف چند باتوں کو لے کر ان پر زور نہیں دے دیا گیا۔

دوسرا امر اس غرض کو پورا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہر اک مذہب کے قائم مقام اپنے مذہب کو پیش کریں نہ کہ اپنے خیال کو۔ اگر ایسا نہ کیا جائے گا تو کبھی حق کو نہیں پا سکیں گے خیالات کوئی مادی اور ٹھوس چیز نہیں ہیں جن کو مختلف مذاہب کے پیرو تالوں میں بند کر کے رکھ چھوڑیں۔ جس وقت کسی خیال کا اظہار کیا جاتا ہے وہ مِلکِ عام ہو جاتا ہے جو چاہے اس کو اختیار کرلے اور استعمال کرے۔ پس اگر ایسا کوئی علاج نہ نکالا جائے جس کے ذریعہ سے یہ معلوم ہو سکے کہ وہ خیالات جن کو کسی مذہب کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے وہ فی الواقع اسی کے ہیں اور لیکچرار نے ان خیالات کو دوسرے لوگوں سے چُرایا نہیں کبھی بھی مذاہب کا فیصلہ کرنے میں آسانی نہ ہوگی اور نہ صحیح موازنہ ہو سکے گا اور نہ کوئی نتیجہ نکلے گا بلکہ ان لوگوں کو نقصان پہنچے گا اور وہ خیال کرنے لگیں گے کہ سب مذاہب ایک سے ہیں حالانکہ صرف ایک مذہب میں وہ سچائی ہوگی

اور دوسرے مذاہب اس سے خالی ہونگے ہاں ان کے ہوشیار پیروان خیالات کو چُرا کر اپنے مذہب کی طرف منسوب کر رہے ہونگے۔

بانی سلسلہ احمدیہ نے اس نقص کو دور کرنے کے لئے ایک تجویز پیش کی ہے جسے وہ ہمیشہ اپنے مضامین میں مدنظر رکھتے تھے اور جس کے مدنظر رکھنے سے مذکورہ بالا خرابی بالکل دور ہو جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر مذہب کے وکیل اپنے مذہب کی طرف جو امر منسوب کریں اس کا ثبوت وہ اپنی مذہبی کتب سے دیں یعنی اپنی الہامی کتاب سے یا اس شخص کی تشریح سے جس پر وہ کتاب نازل ہوئی ہے۔ اس شرط پر عمل کرنے سے وہ اخفاء کا پردہ جو سچائی پر پڑا رہتا ہے بالکل اٹھ سکتا ہے اور حقیقت کھل سکتی ہے اور خوب ظاہر ہو سکتا ہے کہ کونسا مذہب کامل ہے اور کونسے مذاہب ناقص جن کے پیروان کو کامل ظاہر کرنے کے لئے دوسرے مذاہب کی تعلیم چرا کر اس کی طرف منسوب کر رہے ہیں۔

چونکہ ریلیجس کانفرنس کے بانیوں نے اس قسم کی کوئی شرط نہیں لگائی گو میں امید کرتا ہوں کہ آئندہ جب ریلیجس کانفرنسیں ہوں تو ان میں یہ شرط رکھی جائے گی تاکہ لوگوں کے لئے فیصلہ کرنے میں آسانی ہو اس لئے دوسرے مذاہب کے قائم مقام تو اس شرط کا خیال غالباً اپنے مضامین میں نہیں رکھیں گے مگر میں اپنے لئے خود یہ قید مقرر کرتا ہوں کہ میں جو تعلیم اسلام اور احمدیت کی طرف منسوب کروں گا وہ وہی ہو گی جسے ہمارا مذہب پیش کرتا ہے نہ وہ جسے میں خود کہیں سے مُستعار لے کر پیش کر دوں۔ میں اول تو ہر بات کا ثبوت اپنی مذہبی کتب سے پیش کرتا چلا جاؤں گا اور اگر بعض جگہ بسبب طوالت حوالہ کو چھوڑ دوں تو ہر شخص کا حق ہے کہ وہ مجھ سے حوالہ کا مطالبہ کرے جس کی بناء پر میں نے اس تعلیم کو اسلام کی طرف منسوب کیا ہے۔

اس تمہید کے بعد میں اصل مضمون کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ سو یاد رکھنا چاہئے کہ مذہب کی بڑی غرضیں چار ہیں۔ اول یہ کہ وہ انسان کو اس کے مبدأ کے متعلق علم دے یعنی اس کے پیدا کرنے اور اس کے وجود میں لانے والے کے متعلق اس کو صحیح عقائد بتائے تاکہ وہ اس خزانۂ قوت و طاقت سے فائدہ حاصل کرنے سے محروم نہ رہ جائے اور اپنی پیدائش کی غرض سے جسے پیدا کرنے والا ہی بتا سکتا ہے غافل نہ رہے اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے چار باتوں کا بیان کرنا ضروری ہے۔

۱- خدا تعالیٰ کی ذات اور صفات کے متعلق اصل حقیقت کو بیان کرنا۔

۲- یہ بتانا کہ بندے کو خدا سے کیا تعلق ہونا چاہئے۔
۳- یہ بتانا کہ کن اعمال سے بندہ اس تعلق کا اظہار کرے یا یہ کہ بندہ پر خدا تعالیٰ کی طرف سے کیا ذمہ داریاں ہیں۔
۴- خدا تعالیٰ سے ملنے کا راستہ بتائے اور اس غرض کو اسی دنیا میں پورا کر کے دکھائے تا کہ انسان خدا تعالیٰ کے متعلق ظنّی علم سے گذر کر یقین کے درجہ تک پہنچ سکے۔

دوسرا مقصد مذہب کا یہ ہے کہ وہ انسان کو کامل اخلاقی تعلیم دے۔ اس مقصد کے پورا کرنے کے لئے بھی مندرجہ ذیل سات امور کا بیان کرنا ضروری ہے۔

(۱) اخلاق حسنہ کیا ہیں (۲) اخلاق سیّئہ کیا ہیں (۳) یہ کہ اخلاق حسنہ کے مختلف مدارج کیا ہیں (۴) اخلاق سیّئہ کے مختلف مدارج کیا ہیں (۵) کسی امر کو بدی اور کسی کو نیکی کیوں قرار دیا گیا ہے (۶) وہ ذرائع کیا ہیں جن کی مدد سے انسان اخلاق حسنہ کو اختیار کر سکتا ہے (۷) وہ ذرائع کیا ہیں جن کی مدد سے انسان اخلاق سیّئہ سے بچ سکتا ہے۔

اخلاق حسنہ کے بیان میں ان سات امور کا بیان کرنا نہایت ضروری ہے بغیر اس کے یہ مقصد ہرگز پورا نہیں ہو سکتا۔

تیسرا مقصد مذہب کا بنی نوع انسان کی تمدنی ضروریات کا حل ہے کیونکہ جب خدا تعالیٰ نے انسان کو مدنی الطبع پیدا کیا ہے تو یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اس کے لئے ایسے اصولی قواعد تجویز فرمائے جن کے ذریعہ سے دنیا میں امن اور امان قائم ہو اور ہر ایک طبقہ اور فرقہ کے لوگ اپنے حقوق کے اندر رہیں اور کوئی کسی کے حق کو دانستہ یا نادانستہ نہ دبا سکے اگر غور کیا جائے سوائے اللہ تعالیٰ کے سوسائٹی کے حقوق کو دوسری کوئی ہستی بیان ہی نہیں کر سکتی کیونکہ دوسرے تمام لوگ اپنے ذاتی فوائد کی وجہ سے اس وسعت نظر سے محروم ہوتے ہیں جو اس کام کے لئے ضروری ہے پس ان قواعد کا بیان کرنا جو تمدنِ انسانی کے لئے بمنزلہ اساس کے ہوں مذہب کے اہم فرائض میں سے ہے اور جو مذہب اس مقصد کو پورا نہیں کرتا وہ ہرگز مذہب کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ اس مقصد کے پورا کرنے کے لئے مندرجہ ذیل امور پر روشنی ڈالنا مذہب کا فرض ہے۔

۱- امور خانہ داری یعنی رشتہ داروں سے رشتہ داروں کے تعلقات اور ان کے باہمی حقوق پر کہ یہ تمدن انسانی کا پہلا ٹکڑا ہے۔

۲- ملکی اور سیاسی حقوق پر کہ کس احسن طریق پر ان کو ادا کیا جا سکتا ہے۔
۳- آقا اور ملازم یا مالداروں اور غریبوں کے تعلقات پر۔
۴- اس سلوک پر جو ایک مذہب کے لوگوں کو دوسرے مذہب کے لوگوں سے یا ایک بادشاہت کے لوگوں کو دوسری بادشاہت کے لوگوں سے کرنا چاہئے۔

چوتھا مقصد مذہب کا انسان کے انجام کا بیان کرنا ہے۔ یعنی یہ بتانا کہ انسان مرنے کے بعد کہاں جائے گا اس سے کیا سلوک ہو گا وغیرہ وغیرہ۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے مندرجہ ذیل امور کا بیان کرنا ضروری ہے۔

۱- کیا موت کے بعد انسان کے لئے کوئی بقاء ہے؟ اگر ہے تو کس رنگ میں؟
۲- اگر کوئی بقاء ہے تو کیا اس بقاء کے ساتھ تکلیف یا خوشی کا کوئی سلسلہ وابستہ ہے؟
۳- اگر وابستہ ہے تو اس کی کیا کیفیت ہے؟
۴- آیا مرنے کے بعد بھی انسان کے لئے بدی سے نیکی کی طرف جانے کا کوئی راستہ کھلا ہے اگر ہے تو کس طرح؟

مذکورہ بالا چار مقاصد کے متعلق کسی مذہب کی تعلیم معلوم کر کے ہی اس کے دعویٰ کے متعلق صحیح نتیجہ نکالا جا سکتا ہے اور میں ان مقاصد کے متعلق احمدیت کی تعلیم کو اس امید اور یقین کے ساتھ پیش کرتا ہوں کہ جب آپ لوگ انصاف سے اس پر غور فرمائیں گے تو آپ پر ثابت ہو جائے گا کہ اگر ان چاروں مقاصد کو کوئی مذہب پورا کرتا ہے تو وہ صرف اسلام ہی ہے۔

خدا تعالیٰ کے متعلق اسلام کی تعلیم

جیسا کہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں یہ مضمون چار سوالوں میں تقسیم ہے۔ پس میں ان چاروں سوالوں کو باری باری لے کر ان کے متعلق اسلام کی تعلیم کو بیان کرتا ہوں۔

(ا) پہلا سوال۔ مقصد اول کے متعلق یہ ہے کہ اس مذہب میں خدا تعالیٰ کی ذات اور صفات کے متعلق کیا تعلیم دی گئی ہے؟ سو یاد رکھنا چاہئے کہ اسلام اللہ تعالیٰ کو ایک کامل ہستی بیان فرماتا ہے جس میں سب خوبیاں جمع ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم کی ابتداء ہی ان الفاظ سے ہوتی ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ [۵۴]۔ سب تعریف کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے کیونکہ وہ سب جہانوں کا پیدا کرنے والا اور ان کو پالنے والا ہے۔ پس چونکہ ہر ایک چیز اس کی پیدا کی ہوئی اور اسی کی پرورش کی محتاج ہے اس لئے جو خوبیاں دنیا میں کسی اور چیز میں نظر آویں ان کی تعریف کا استحقاق

بھی در حقیقت اللہ تعالیٰ کو ہی حاصل ہے کیونکہ ان کو جو کچھ ملا ہے وہ اللہ تعالیٰ سے ہی ملا ہے۔ ایک خوبصورت نظارہ' ایک خوشبودار پھول' ایک خوش ذائقہ کھانا' ایک نرم اور ملائم فرش' ایک دلکش آواز غرض جس قدر اچھی چیزیں ہیں جن کو محسوس کر کے حواس انسانی خوشی و راحت پاتے ہیں ان سب چیزوں کی خوبی خدا تعالیٰ ہی کی پیدا کی ہوئی ہے۔ پھر فرماتا ہے اَلرَّحْمٰن بندوں کو جس قدر ضروریات پیش آنی تھیں اور جس قسم کے سامانوں کی ان کو احتیاج ہونی تھی وہ سب خدا تعالیٰ نے بطور انعام اور فضل کے پیدا کر چھوڑی ہیں جیسے نور اور روشنی یا آگ اور پانی اور ہوا اور قسم قسم کی غذائیں اور دوائیں اور لکڑی اور لوہا اور پتھر۔ غرض انسان کی محنت اور کوشش کے لئے اس نے اس قدر چیزیں دنیا میں پیدا کر چھوڑی ہیں کہ وہ جس طرف بھی رخ کرے اسے اپنے مشغول کرنے اور اپنے علم اور کمال میں ترقی کرنے کا موقع میسر ہے حتیٰ کہ کوئی انسانی حاجت نہیں جس کا سامان خدا تعالیٰ نے انسان کی پیدائش سے پہلے پیدا نہیں کر دیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا نام قرآن کریم اَلرَّحِیْم بتاتا ہے کہ وہ تمام محنتوں اور کوششوں کے نتائج صحیح اور اعلیٰ پیدا کرتا ہے۔ جیسی جیسی کوئی محنت کرتا ہے اسی قدر اس کو بدلہ مل جاتا ہے۔ انسان کی محنت کبھی ضائع نہیں جاتی بلکہ ہمیشہ اس کے ثمرات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

پھر یہ فرمایا کہ خدا تعالیٰ جزاء و سزا کے وقت کا مَالِک ہے یعنی علاوہ ان نتائج کے جو اس کی طرف سے طبعی قانون کے ماتحت نکلتے رہتے ہیں یا علاوہ ان بدلوں کے جو ساتھ کے ساتھ ملتے رہتے ہیں اس نے ہر ایک کام کی ایک انتہاء مقرر کی ہے جس پر پہنچ کر اس کا آخری فیصلہ ہو جاتا ہے۔ نیک نیک بدلہ اور بدبدی کی سزا پالیتے ہیں مگر یہ بدلے اور جزائیں اللہ تعالیٰ کی مالکیت کے ماتحت ہوتے ہیں اگر وہ چاہتا ہے تو معاف بھی کر دیتا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی نسبت آتا ہے کہ وہ قَدِیْر ہے اس نے ہر ایک چیز اور ہر ایک چیز کے اثر اور ہر ایک چیز کے نتائج کے اندازے مقرر کئے ہوئے ہیں جن کی وجہ سے دنیا کا کارخانہ چل رہا ہے۔ اگر یہ اندازہ نہ ہوتا تو دنیا میں اندھیر آجاتا کیونکہ لوگ بالکل کام چھوڑ بیٹھتے۔ کھانا پکانے والا کھانا پکانے کے لئے اس لئے آگ جلاتا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ یہ ضرور گرمی پیدا کرے گی اگر یہ قانون نہ ہوتا اور آگ کے لئے جلانے کا کام مقرر نہ ہوتا یا پانی کے لئے بجھانے کا کام۔ کبھی آگ گرمی پیدا کرتی کبھی سردی' پانی کبھی آگ بجھاتا کبھی آگ لگاتا تو آج جس طرح لوگ ان چیزوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں کبھی نہ اٹھاتے بلکہ نتائج کے یقینی نہ ہونے کے سبب سے ہمت ہار کر

بیٹھ جاتے اور ہلاک ہو جاتے۔

اسی طرح اس کی صفت بتاتی ہے کہ وہ عَلِیْم ہے ایک ایک ذرہ کا اس کو علم ہے وہ دلوں کے پوشیدہ راز اور پردوں کے اندر کی چھپی ہوئی باتیں بلکہ انسانی فطرت کے مخفی اسرار تک سے واقف ہے جن سے خود انسان بھی واقف نہیں ہوتا۔ زمین کے اندر مدفون یا پہاڑ کی چوٹی پر رکھی ہوئی چیزیں سب اس کے لئے یکساں ہیں۔ وہ پہلے زمانہ کے حالات بھی جانتا ہے' حال سے بھی آگاہ ہے اور آئندہ زمانہ میں جو کچھ ہونے والا ہے وہ بھی اسے معلوم ہے۔ وہ سَمِیْع ہے یعنی سننے والا ہے مخفی سے مخفی بات کا اس کو علم ہے۔ آہستہ سے آہستہ کلام وہ سنتا ہے چیونٹی کی رفتار بھی اس کی شنوائی سے باہر نہیں اور انسانی رگوں کے اندر خون کے چلنے کی حرکت سے جو آواز پیدا ہوتی ہے وہ بھی اس کی سماعت سے بالا نہیں ہے۔ وہ حَیّ ہے یعنی خود زندہ ہے اور دوسروں کو زندہ کرتا ہے۔ خَالِق ہے یعنی پیدا کرتا ہے قَیُّوْم ہے یعنی دوسروں کو اپنی مدد سے قائم رکھتا ہے اور خود قائم ہے۔ صَمَد ہے کوئی چیز اس کی مدد اور نصرت کے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتی۔ غَفُوْر ہے لوگوں کی خطاؤں کو بخشتا ہے۔ قَہَّار ہے ہر ایک چیز اس کے قبضۂ قدرت میں ہے جَبَّار ہے ہر ایک فساد کی اصلاح کرتا ہے وَہَّاب ہے اپنے بندوں کو انعاماتِ وافر سے حصہ دیتا ہے سَبُّوح ہے کسی قسم کا کوئی عیب اس کے اندر نہیں پایا جاتا۔ قُدُّوْس ہے تمام قسم کی پاکیزگیوں کا جامع ہے نیند اس کو نہیں آتی۔ تھکتا وہ نہیں ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ مُھَیْمِن ہے ہر ایک چیز کا محافظ ہے ان صدمات سے اور وباؤں سے جن کا انسان کو علم بھی نہیں ہوتا اس کو بچاتا رہتا ہے۔ کتنی دفعہ وہ بیماریوں کی زد میں آجاتا ہے یا حادثات کا شکار ہونے لگتا ہے کہ مخفی در مخفی سامان اس کو اس کے صدمہ سے بچالیتے ہیں۔ بیماری کے پیدا ہوتے ہی جسم میں اس کے زہر کے مٹانے کے سامان بھی پیدا ہونے لگتے ہیں جب تک کہ انسان بالکل ہی غافل نہ ہو جائے اور قانون قدرت کے توڑنے پر مُصِرّ نہ رہے وہ بہت سے بدنتائج سے محفوظ رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ [55]۔ اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان کے غیر طبعی اعمال پر پکڑنے لگتا تو دنیا پر ایک حیوان بھی باقی نہ رہتا۔

غرضیکہ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى [56]۔ سب نیک نام اس کو حاصل ہیں اور اس کی رحمت ہر ایک چیز پر غالب ہے۔ جیسے فرمایا وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ [57]۔ میری رحمت ہر اک دوسری شئے پر غالب ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی صفاتِ غضبیہ اس کی صفاتِ رحمت کے ماتحت ہیں۔ اللہ

اَحَد ہے یعنی کوئی چیز اس کی ہمسر نہیں ہے وہ وَاحِد ہے تمام اشیاء اس کے حکم سے نکلی ہیں۔ وہ سب کی ابتدائی کڑی ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اور بہت سے نام قرآن کریم میں بیان فرمائے گئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ایک ایسے کامل خدا کو دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے جو ان دونوں خوبیوں کو اپنے اندر جمع رکھتا ہے یعنی محبت اور خوف کے موجبات کو جن کے بغیر کبھی کامل تعلق پیدا ہی نہیں ہوتا۔

ہر عقلمند انسان سمجھ سکتا ہے کہ کامل اطاعت اور کامل اتحاد ہمیشہ دو ہی ذریعوں سے ہوتا ہے محبت سے یا خوف سے۔ بیشک محبت کا تعلق اعلیٰ اور اکمل ہے مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ کئی طبائع صرف خوف سے مانتی ہیں۔ پس جب تک کوئی مذہب صفات غضبیہ اور صفات محبت دونوں پر زور نہ دے اور دونوں کو پیش نہ کرے کبھی وہ مذہب تمام دنیا کو نفع نہیں پہنچا سکتا۔ اگر اصلاح ہمارے مدنظر ہو تو ہم صرف یہ نہیں دیکھیں گے کہ اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کے لئے کسی کام کے کرنے کا کیا محرک ہوتا ہے بلکہ ہمیں اعلیٰ اور ادنیٰ دونوں قسم کے لوگوں کے حالات کو مدنظر رکھنا ہوگا ورنہ ہم اصلاح کے کام میں ناکام رہیں گے۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ اعلیٰ طبقہ کے لوگ تو خود ہی ہدایت کی طرف مائل ہوتے ہیں ہمیں زیادہ فکر ان لوگوں کی رکھنی پڑے گی جو ادنیٰ حالات میں گرے ہوئے ہیں اور ان کی فطرتیں مسخ ہو گئی ہیں اور وہ اپنے فرائض کو بھول گئے ہیں۔ ایسے لوگ اکثر اوقات سوائے شاذ و نادر کے خوف سے ہی مانتے ہیں اور جب تک ان کے سامنے نقصان کا اندیشہ موجود نہ ہو اصلاح کی طرف مائل نہیں ہوتے۔ پس وہ مذہب جو اللہ تعالیٰ سے تمام بندوں کا تعلق پیدا کرنا چاہے اس کے لئے ضروری ہے کہ فطرت کا لحاظ رکھے اور اسلام نے جس خوبی سے صفات الٰہیہ کے بیان کرنے میں اس توازن کو قائم رکھا ہے وہ یقیناً ہر اک قسم کی طبائع کے علاج پر مشتمل ہے اور اس سے مکمل علاج اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ اس نے خدا تعالیٰ کی صفات غضبیہ کو بھی پیش کیا ہے اور صفات رحمت کو بھی مگر ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا ہے کہ وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ میری رحمت ہر اک چیز پر غالب ہے۔ آخر میری رحمت میرے غضب کو مٹا دیتی ہے کیونکہ میرا غضب بغرض اصلاح ہوتا ہے نہ دکھ دینے کے لئے۔

یہ تعلیم اللہ تعالیٰ کی ذات کی نسبت جیسی مکمل اور اعلیٰ ہے ظاہر ہے۔ جو غرض مذہب کی ہے وہ اس تعلیم سے بوجہ احسن پوری ہوتی ہے مگر پھر بھی یہ تعلیم امتیازی نہیں۔ جہاں تک میں سمجھتا

ہوں اکثر مذاہب سوائے تھوڑے اختلافات کے لفظاً اسی تعلیم کو پیش کرتے ہیں اور سطحی نگاہ سے دیکھنے والا انسان حیران ہو جاتا ہے کہ پھر آپس میں اختلاف کیوں ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ یہ دھوکا کہ سب مذاہب ایک ہی سی تعلیم پیش کرتے ہیں اس امر سے لگتا ہے کہ بہت لوگ فطرت انسانی کو اس فیصلہ کے وقت نظرانداز کر دیتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی فطرت میں یہ خاصہ رکھا گیا ہے کہ بعض امور کو وہ بلا خارجی مدد کے قبول کر لیتی ہے یا رد کر دیتی ہے ایسے امور کو بدیہیات کہتے ہیں۔ گو بعض فلسفی انکے بدیہی ہونے کے بھی منکر ہوں لیکن عوام الناس ان کے متعلق کوئی شبہ نہیں رکھتے کیونکہ وہ ان کی طبیعت ثانیہ ہو گئے ہیں۔ ایسے امور کے خلاف بات کہہ کر کوئی شخص کامیاب ہونے کی امید نہیں کر سکتا۔ انہی امور میں سے ایک یہ ہے کہ تمام بنی نوع انسان اِلَّا مَاشَاءَاللّٰہُ اس امر پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک کامل وجود ہے جس میں کوئی نقص نہیں۔ اب اگر کوئی مذہب یہ دعویٰ کرے کہ نہیں خدا تعالیٰ میں بھی فلاں فلاں نقص ہے یا فلاں فلاں خوبی اس میں نہیں ہے تو کبھی بھی لوگ اس مذہب کی طرف توجہ نہ کریں۔ اس لئے مذاہب میں ان ناموں کے متعلق اس قدر اختلاف نہیں ہو سکتا جو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں بلکہ مذاہب کا اختلاف ان تفصیلات میں ہوتا ہے جو ان ناموں کی تشریح میں مختلف مذاہب کے پیرو کرتے ہیں اور اس اتحاد کی وجہ یہ نہیں کہ واقع میں سب مذاہب کی تعلیم اس بارے میں ایک ہے بلکہ اس کی وجہ وہ قلبی احساس ہے کہ لوگ ان ناموں کے سوا دوسرے ناموں کو سننے کے لئے تیار نہیں۔ پس مذاہب کا مقابلہ کرتے ہوئے ہمیشہ ان تفاصیل کو دیکھنا چاہئے جو ان ناموں کے متعلق مختلف مذاہب نے بیان کی ہیں۔

مثلاً مذاہب اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ہے تمام مخلوق کا پیدا کرنے والا اور اس کو اس کے دائرہ استعداد کے اندر ترقی دینے والا ہے مگر اس کی تشریح میں مختلف مذاہب میں بڑا فرق ہے چونکہ میں اس وقت احمدیت کی تعلیم کو بیان کر رہا ہوں میں اس صفت کے ماتحت جو اسلام نے تعلیم دی ہے اس کو بیان کر دیتا ہوں۔

یہ بات واضح ہے کہ اس صفت کا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی خاص جماعت کا خدا نہیں بلکہ وہ تمام مخلوق کا رب ہے اور اس وجہ سے اسے صرف پیدائش کی وجہ سے کسی خاص قوم سے تعلق نہیں ہو سکتا بلکہ سب انسان بحیثیت انسان ہونے کے اس کے لئے برابر ہیں۔ جس طرح وہ یورپ کے لوگوں کی ربوبیت کرتا ہے ایشیا کے لوگوں کی بھی کرتا ہے' جس طرح امریکہ کے

لوگوں کی ربوبیت کرتا ہے افریقہ کے لوگوں کی بھی ربوبیت کرتا ہے اور جس طرح وہ ان سب لوگوں کی جسمانی ربوبیت کرتا ہے روحانی بھی کرتا ہے چنانچہ قرآن کریم اس اصل کے ماتحت یہ حیرت انگیز انکشاف کرتا ہے اور اس زمانہ میں کرتا ہے جبکہ قوم پرستی اور ملکی تعصبات کا دَور دورہ تھا جبکہ لوگ عام طور پر یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ دوسرے ممالک کے لوگوں میں نبوت کا خیال بھی پایا جاتا ہے یا نہیں۔ وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ کوئی قوم دنیا کے پردے پر ایسی نہیں ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انکی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے نبی نہ بھیجا ہو۔ پھر ایک دوسری جگہ فرماتا ہے وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ [۵۸]۔ یعنی ہم نے یقیناً ہر ایک قوم میں رسول بھیجے ہیں یہ پیغام دیکر کہ اللہ کی عبادت کرو اور سرکش اور شریر لوگوں کی باتوں میں نہ آؤ۔ پس بعض لوگ تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایمان لے آئے اور بعض اپنی گمراہی میں ہی پڑے رہے۔ پس جاؤ اور ساری دنیا میں پھر کر دیکھو تمہیں ہر قوم میں نبیوں کی خبر ملے گی اور ان لوگوں کا انجام جنہوں نے خدا کے نبیوں کی مخالفت کی معلوم ہو جائے گا۔ حدیث نبی کریم ﷺ میں بھی آتا ہے کہ بعض لوگوں نے رسول کریم ﷺ سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! کیا کبھی فارسی زبان میں بھی الہام ہوا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں فارسی زبان میں بھی خدا تعالیٰ نے ایک نبی پر کلام بھیجا تھا [۵۹]۔ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ کی صفت کے ماتحت جو اسلام نے یہ انکشاف کیا ہے اس کو دیکھو کہ کس طرح ایک جملہ سے جو ساری دنیا میں اور سب مذاہب کے پابندوں میں مشترک تھا کیسی نئی صداقت پیدا کر دی ہے اور کس طرح تمام بنی نوع انسان میں اخوت کی روح پھیلا دی ہے۔ اس تعلیم کے ماتحت ایک مسلمان کو کسی مذہب کے بزرگوں سے پرخاش نہیں ہو سکتی کرشن' رامچندر' بدھ' زردشت' کنفیوشس اسی طرح ایک مسلمان کے نبی ہیں جس طرح کہ موسیٰ اور مسیح۔ صرف یہ فرق ہے کہ ان کے نام قرآن کریم میں چونکہ آگئے ہیں وہ ان کی نسبت زیادہ وثوق کے مقام پر ہیں اسلام کی پوزیشن اس ایک نکتہ کی وجہ سے کیسی اعلیٰ ہو گئی ہے۔ دنیا کے کسی گوشہ میں کسی علاقہ میں کسی نئے مذہب کا علم ہو کسی نبی کا پتہ لگے ایک مسلمان کا دل بجائے ایک نئے حریف کا خیال کر کے منقبض ہو جانے کے ایک نئے مصدق قرآن کی بشارت کی خبر سمجھ کر خوش ہو جاتا ہے کیونکہ کیا یہ سچ نہیں کہ اسلام نے خدا تعالیٰ کو رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ثابت کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس کا فضل عرب اور شام سے ہی

مخصوص نہیں۔ جس طرح اس کا دنیاوی سورج دنیا کے ہر گوشہ پر چڑھتا ہے اسی طرح اس کے کلام کا سورج بھی ہر قوم کو منور کرتا ہے۔

اس جگہ یہ شبہ پیدا کیا جاسکتا ہے کہ اگر ساری دنیا میں مذاہب خدا تعالیٰ کی طرف سے آئے ہیں تو پھر کیوں نہ سب کو ہی سچا سمجھ لیا جائے اور کیوں نہ یہ مانا جائے کہ جس مذہب پر چل کر کوئی خدا کو پانا چاہے پاسکتا ہے؟ اس شبہ کا جواب بھی قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے دے دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ [60]۔ ترجمہ۔ ہمیں اپنی ذات کی ہی قسم ہم نے تجھ سے پہلے جس قدر امتیں گذر چکی ہیں سب کی طرف رسول بھیجے تھے مگر بعد میں لوگوں نے جو حق سے دور تھے ان کو اور کاموں میں ڈال دیا اور آج ایسے ہی لوگ ان کے دوست ہیں اور ان کو دردناک عذاب پہنچے گا اور ہم نے تیری طرف کتاب نہیں بھیجی مگر صرف اس لئے کہ تُو ان کے سامنے ان امور کو بیان کرے جن میں کہ ان کے خیالات حق کے خلاف ہو گئے ہیں اور تاکہ وہ کتاب مومنوں کے لئے ہدایت اور رحمت بنے۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ رسول کریم ﷺ کی آمد سے پہلے ہی تمام پہلی کتب اور تعلیمیں مخلوط ہو گئی تھیں اور دوسرے لوگوں کے خیالات اور وساوس ان کے اندر شامل ہو گئے تھے۔ پس باوجود اس کے کہ ان کی اصل خدا تعالیٰ کی طرف سے تھی اور اپنی موجودہ صورت میں قابل عمل نہ رہے تھے اور ان پر اس امر میں اعتبار نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ ایک متلاشی کو خدا تک پہنچادیں گے۔

اللہ تعالیٰ کی صفات کے متعلق یہ بھی ایک سوال ہے کہ جس کا حل کرنا مذہبی کتب کا فرض ہے کہ خدا تعالیٰ نظر کیوں نہیں آتا؟ اب یہ کہہ دینا تو آسان ہے کہ ایک خدا ہے لیکن یہ مشکل ہے کہ خدا تعالیٰ کی مختلف صفات کو ثابت کیا جائے۔ قرآن کریم اس ذمہ داری کا اقرار کرتا ہے خدا تعالیٰ کی مختلف صفات کا ثبوت دیتا ہے مثلاً اسی امر کے متعلق کہ خدا تعالیٰ نظر نہیں آتا فرماتا ہے۔ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ [61]۔ خدا تعالیٰ کو انسانی آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں لیکن وہ خود انسانی آنکھوں کے پاس آتا ہے تاکہ وہ اسے دیکھیں اور وہ نہایت لطیف ہے کہ آنکھ اس کے دیکھنے سے قاصر ہے اور بندے کی حالت سے بھی خبردار ہے۔

کیسے مختصر الفاظ میں سارے سوال کو حل کر دیا ہے۔ لطیف چیزیں انسان کو نظر نہیں آتیں بجلی، ایتھر بلکہ خالص ہوا بھی انسان کو نظر نہیں آتی۔ پھر وہ خدا جو سب لطیف اشیاء سے بھی لطیف تر ہے اور مخلوق نہیں بلکہ خالق ہے کسی قسم کے مادہ سے نہیں بنا خواہ وہ کتنا بھی لطیف کیوں نہ ہو کس طرح نظر آسکتا ہے؟ مگر ایک طرف وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ اس کا بندہ اس کی ملاقات کا شائق ہے اور اس کے دیدار کے لئے تڑپتا ہے اس لئے وہ خود بندے کے پاس آجاتا ہے اور اس کی نظر کے سامنے اپنے آپ کو کر دیتا ہے یعنی وہ اپنی قدرتوں اور اپنی صفات کی جلوہ گری کے ذریعہ سے اپنی ذات کو بندہ پر ظاہر کرتا ہے اور اس طرح بندہ عقل کی آنکھوں سے خدا تعالیٰ کو دیکھ لیتا ہے۔

ثبوت ہستی باری تعالیٰ کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تَبَارَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُ ۨ الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۭ مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ۭ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ [۶۲]۔ بابرکت ہے وہ خدا جس کے قبضہ میں بادشاہت ہے اور وہ ہر ایک چیز پر قادر ہے وہ خدا جس نے موت اور زندگی کو اس لئے بنایا ہے تاکہ یہ دیکھے کہ تم میں سے کون شخص اچھے عمل کرتا ہے یعنی اس نے زندگی کو عمل کے لئے اور موت کو جزاء کے لئے بنایا ہے کیونکہ اس دنیا میں کامل جزاء نہیں مل سکتی تھی تا وہ لوگ جو ابھی عمل کی جدوجہد میں پڑے ہوئے ہیں جزاء و سزا کو دیکھ کر ان کے لئے ایمان بے حقیقت نہ رہ جائے اور وہ خدا غالب ہے بخشنے والا ہے۔ وہی ہے کہ جس نے سات بلندیوں کو اس طرح پیدا کیا ہے کہ ایک دوسری کو مدد دے رہی ہے تو رحمٰن کی پیدائش میں کسی قسم کا فرق نہیں پائے گا تو اپنی نظر پھیر کر دیکھ کیا تو کوئی کمی بھی دیکھتا ہے؟ پھر نظر کو پھرا اور پھر پھرا۔ مگر ہر دفعہ تیری نظر ناکام واپس آئے گی درآنحالیکہ وہ تھکی ہوئی ہوگی یعنی تمام کائنات پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ ہر ضرورت کا جواب موجود ہے۔ ہر چیز جس جس قسم کی طاقتوں کو لے کر پیدا ہوئی ہے اسی قسم کے سامان اسے میسر ہیں تا ان طاقتوں کو استعمال کر سکے۔ اس دنیا پر پیدا ہونے والے باریک جِرم کی ضروریات کروڑوں کروڑ میل پر چکر لگانے والے ستارے کے ذریعہ سے پوری ہو رہی ہیں۔ پس یہ دائرہ ضرورت اور اس کے ایفاء کا دیکھو اور اس سے معلوم کر لو کہ اس کائنات کا کوئی خالق ہے جس نے ادنیٰ ادنیٰ ضروریات کا لحاظ رکھا ہے اور ہر ایک خواہش کے پورا ہونے کا اور ہر سچی جستجو کا سامان پیدا کیا ہے۔

صفاتِ الٰہی کے متعلق یہ بھی سوال ہوتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ رحمٰن ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے تو اس نے مختلف قسم کے درندے اور کیڑے مکوڑے کیوں پیدا کئے ہیں؟ اور تکلیفات اور بیماریاں کیوں بنائی ہیں؟

اسلام نے اس سوال کو بھی حل کیا ہے اور صرف رحمٰن کہہ کر نہیں چھوڑ دیا چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ثُمَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ [۶۳]۔ یعنی سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے آسمان اور زمین پیدا کئے ہیں اور جس نے ہر قسم کی تاریکیوں اور نور کو پیدا کیا ہے پھر بھی وہ لوگ جو حقیقت کے منکر ہیں خدا کا شریک قرار دیتے ہیں۔ یعنی تمام قسم کی وہ چیزیں جو تکلیف دہ ہیں اور تاریکی کی فرزند کہلاتی ہیں جیسے سانپ، بچھو، درندے وغیرہ یا زہر وغیرہ یا بیماریاں تکلیف وغیرہ ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اور ان کی پیدائش اللہ تعالیٰ کے رحم کے خلاف نہیں بلکہ اس کے رحم کو ثابت کرتی ہے اور ان کی حقیقت کو مدنظر رکھ کر خدا تعالیٰ کی حمد ثابت ہوتی ہے نہ کہ اس پر الزام لگتا ہے مگر باوجود اس کے جو لوگ اس حقیقت سے ناواقف ہیں ان چیزوں کی پیدائش کو خدا تعالیٰ کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں اور خدا کا ایک اور شریک مقرر کر دیتے ہیں کہ ایسی ضرر رساں چیزوں کا پیدا کرنے والا کوئی اور ہے۔

دیکھو کس صفائی سے حقیقت کے منہ پر سے پردہ اٹھایا ہے اور کیسا لطیف جواب دیا ہے کہ جن چیزوں کو ضرر رساں کہا جاتا ہے ان کی پیدائش ضرر رساں نہیں ہے بلکہ پیدائش کی غرض تو نیک ہی ہے اور انسان کے فائدے کے لئے ہے اور اسے ان کی پیدائش پر خدا تعالیٰ کی حمد ہی کرنی چاہئے۔

اس انکشاف کے ماتحت اب ان چیزوں پر غور کیا جائے جو ضرر رساں معلوم دیتی ہیں تو بات ہی بالکل اور نظر آتی ہے۔ زہر بے شک انسان کو مارتا ہے لیکن کس قدر بیماریوں میں سنکھیا اور کچلا استعمال کیا جاتا ہے افیون دی جاتی ہے۔ کیا وہ لوگ جو سنکھیا اور کچلے یا افیون سے مرتے ہیں زیادہ ہیں یا وہ لوگ جو ان کے ذریعہ سے بچتے ہیں؟ یقیناً ان ادویہ کے ذریعہ سے ہر سال لاکھوں آدمی مرتے مرتے بچتے ہیں۔ پھر کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے یہ کیوں پیدا کی ہیں؟ اسی طرح سانپ، بچھو وغیرہ کا حال ہے ابھی تک خواص الاشیاء کے ماہرین نے ان کی طرف توجہ نہیں کی۔ ورنہ جب وہ توجہ کریں گے تو ان کو معلوم ہو گا کہ یہ جانور بھی طبعی طور پر نہایت مفید ہیں۔ علاوہ

ازیں انکی پیدائش جیسا کہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے انسان کی پیدائش کے لئے پیش خیمہ تھی اور زمین کے اوپر جوّ کی صفائی میں حشرات الارض کا بھی ایک بہت بڑا حصہ ہے اور در حقیقت یہ جانور پیدائش انسانی کی پہلی کڑیاں ہیں نہ اس طرح جس طرح آجکل بعض لوگ خیال کرتے ہیں بلکہ اس لحاظ سے کہ ان میں سے ہر ایک جانور زمین کے مختلف تغیرات پر دلالت کرتا ہے اور اس کی یادگار ہے۔

اسی طرح فرماتا ہے وَمِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِیْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ وَهُوَ عَلٰی جَمْعِهِمْ اِذَا یَشَآءُ قَدِیْرٌ ۝ وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِیْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَیْدِیْكُمْ وَیَعْفُوْا عَنْ كَثِیْرٍ ۝ [۴۶]

خدا تعالیٰ کے انعامات میں سے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان تمام چیزوں کی پیدائش بھی ہے اور وہ جب چاہے ان کو جمع کر سکتا ہے اور جو تکلیف تم کو پہنچتی ہے وہ تمہارے اپنے عمل کا نتیجہ ہے اور اللہ تعالیٰ تو تمہاری بہت سی غلطیوں کے بدنتائج کو مٹاتا رہتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے سورج' چاند' ستارے اور ان کے درمیان کی چیزیں پیدا کر کے زمین پر انسان کو حاکم بنادیا ہے اب اگر وہ بعض سامانوں سے فائدہ نہ اٹھاویں یا بعض کو غلط استعمال کر کے نقصان اٹھاویں تو یہ ان کا اپنا قصور ہے۔ اللہ تعالیٰ تو جو کچھ کرتا ہے یہ ہے کہ ان کی غلطیوں کے بدنتائج سے ان کو بچالیتا ہے۔ پس انسانی تکالیف خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہیں بلکہ اس قانون قدرت کے غلط استعمال کے سبب سے ہیں جو انسانوں کے فائدے کے لئے بنایا گیا تھا۔

بیماریاں بھی اسی قوت مؤثرہ اور متأثرہ کا نتیجہ ہیں جو انسانوں میں پیدا کی گئی ہے انسان کی تمام ترقیات اس کی ان قوتوں سے وابستہ ہیں۔ اگر اس میں قوت مؤثرہ اور متأثرہ نہ ہو تو انسان کبھی وہ نہ ہو جو اب ہے وہ ایک عام قانون قدرت کے ماتحت ہر اک اردگرد کی چیز پر اثر کرتا ہے اور اس سے خود متاثر ہوتا ہے اور جب کسی وقت اس تاثیر یا تاثر میں قانون توڑ بیٹھتا ہے تو بیمار ہو جاتا ہے یا تکلیف اُٹھاتا ہے پس بیماری کو خدا نے نہیں پیدا کیا بلکہ خدا نے اس قانون قدرت کو پیدا کیا ہے جس سے انسان کی ترقی وابستہ ہے۔ اس میں کمی بیشی کرنے پر انسان خود بیماری کو پیدا کرتا ہے اور بیماری جن قوانین کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے وہ اپنی جگہ چونکہ رحمت کا نتیجہ ہیں اس لئے بیماریوں وغیرہ کی پیدائش سے بھی خدا تعالیٰ کی ذات پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ جو حال بیماری کا ہے بعینہٖ وہی حال گناہ کا ہے۔ گناہ بھی بیماری کی طرح کوئی مستقل وجود نہیں رکھتا فقط قانون قدرت کے خلاف یا قانون شریعت کے خلاف آگے بڑھ جانے یا پیچھے رہ جانے کا نام گناہ

ہے۔ پس گناہ کی موجودگی میں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمانیت اور اس کی قدوسیت پر اعتراض نہیں پڑ سکتا۔

قرآن کریم میں جس قدر نام گناہ کے آتے ہیں وہ سب کے سب ایسے ہیں کہ جو یا افراط پر دلالت کرتے ہیں یا تفریط پر کوئی بھی لفظ ایسا نہیں جو اسمائے مثبتہ میں سے ہو جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک گناہ کی مستقل حقیقت کوئی نہیں بلکہ نیکی کے عدم کا نام گناہ ہے اور عدم بندے کے فعل کا نتیجہ ہوتا ہے جب وہ خدا تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت کو چھوڑ دیتا ہے یا دوسرے کے حق کو اٹھالیتا ہے تو وہ ایک چیز کو معدوم کرنے کا مرتکب ہوتا ہے نہ کہ اثبات کا۔

اس لطیف تعلیم کو جو قرآن کریم نے اس بارے میں دی ہے کہ باوجود ضرر رساں چیزوں کی موجودگی کے خدا تعالیٰ کی صفات حسنہ پر کوئی اعتراض نہیں پڑ سکتا دوسری کتب ہرگز پیش نہیں کرتیں اور نہ وہ اس طرح دعویٰ کے ساتھ دلیل دیتی ہیں۔ یہ صرف قرآن کریم کا کمال ہے کہ وہ نہ صرف خدا تعالیٰ کی صفات کو بیان کرتا ہے بلکہ ان کے متعلق ایسا تفصیلی علم دیتا ہے کہ دل اس کے ذریعہ سے محبت اور اطاعت کے جذبہ سے پُر ہو جاتا ہے اور دماغ سرشار ہو جاتا ہے اور آنکھیں مخمور ہو جاتی ہیں اور تمام شکوک و وساوس بالکل مٹ جاتے ہیں ورنہ اجمالی طور پر اسمائے الٰہی کا بیان کرنا کوئی کمال نہیں ہے۔

اسی طرح مثلاً خدا کی صفت رحم کے خلاف یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ بڑوں کو تو خیر ان کے اعمال کی وجہ سے تکلیف ہوتی ہے بچوں وغیرہ کو کیوں تکلیف ہوتی ہے؟ اس سوال کا جواب بھی مذکورہ بالا جواب میں آگیا ہے یعنی خدا تعالیٰ نے ایک قانون بنایا ہے اور اس قانون میں یہ بات رکھی ہے کہ ہر ایک چیز دوسرے سے اثر قبول کرتی ہے۔ اگر یہ قانون نہ ہوتا تو انسان ناقابل تغیر ہوتا اور جب وہ تغیر کو قبول نہ کرتا تو اب جو وہ ترقیات قبول کر رہا ہے یہ بھی نہ کرتا اسی قانون کے ماتحت بچے وغیرہ اپنے ماں باپ سے اچھی باتیں بھی قبول کرتے ہیں اور بُری باتیں بھی قبول کرتے ہیں۔ صحت بھی ان سے لیتے ہیں اور بیماری بھی۔ اگر بیماریاں یا تکالیف ان کو ماں باپ سے ورثہ میں نہ ملتیں تو اچھی طاقتیں بھی نہ ملتیں اور بجائے انسان کے ایک پتھر کا وجود ہوتا جو بُرے بھلے کسی اثر کو قبول نہ کرتا اور جو غرض انسان کی پیدائش کی ہے وہ باطل ہو جاتی اور انسان کی زندگی جانوروں سے بھی بدتر ہو جاتی۔ باقی رہا یہ سوال کہ اس تکلیف کا جو ان کو اس قانون قدرت کی وجہ سے ملتی ہے ان کو کیا بدلہ ملے گا؟ کیونکہ گو قانون قدرت انسان کی ترقی کے لئے ہے مگر پھر

بعض لوگوں کو بعض کی غلطیوں کے سبب تکلیف تو پہنچ جاتی ہے۔

اس کا جواب ہماری شریعت یہ دیتی ہے کہ ہر اک وہ تکلیف جو انسان کو ایسے امور کی وجہ سے ملتی ہے جن میں اس کا اپنا دخل نہیں اس کا موازنہ کرلیا جائے گا اور انسان کی روحانی ترقیات کے وقت اس کو مدنظر رکھا جائے گا۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَلْوَزْنُ یَوْمَئِذِ اِلْحَقُّ [۶۵]۔ اس جزائے عظیم کے وقت ان امور کو مدنظر رکھا جائے گا جو کسی انسان کی ترقی میں حائل تھے اور جن میں اس کا کوئی دخل نہ تھا۔ ایک دوسری جگہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَایَسْتَوِی الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ غَیْرُاُولِی الضَّرَرِ [۶۶]۔ یعنی مومنوں میں سے جو لوگ دین کی خدمت کرتے ہیں اور وہ جو نہیں کرتے وہ برابر نہیں ہو سکتے۔ مگر وہ لوگ جو خدمت میں اس لئے کوتاہی کرتے ہیں کہ ان کو کوئی طبعی نقصان پہنچ گیا ہے ان کے متعلق یہ حکم نہیں ہے۔ ان کی اس معذوری کو اللہ تعالیٰ مدنظر رکھے گا۔

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ مَایَزَالُ الْبَلَاءُ بِالْمُؤْمِنِ وَالْمُؤْمِنَۃِ فِیْ نَفْسِہٖ وَوَلَدِہٖ وَمَالِہٖ حَتّٰی یَلْقَی اللّٰہَ وَمَا عَلَیْہِ خَطِیْئَۃٌ [۶۷]۔ مومن مرد ہو یا عورت اس کو کوئی طبعی تکلیف نہیں پہنچتی۔ خواہ نفس کے متعلق خواہ اولاد کے متعلق خواہ مال کے متعلق مگر اس کے بدلہ میں اس کی خطائیں کم ہوتی جاتی ہیں اور ان تکالیف کو برداشت کرنے کے سبب سے ان کی روح میں پاکیزگی کی ایک ایسی طاقت پیدا ہوتی جاتی ہے کہ جب وہ اللہ تعالیٰ سے ملیں گے تو اس وقت تک پاک ہو چکے ہوں گے۔ اس جگہ یہ دھوکا نہ لگے کہ یہ حکم صرف مومنوں کے لئے ہے فائدہ ہر اک کو اپنے حق کے مطابق پہنچتا ہے۔ قرآن کریم کا فیصلہ عام ہے حدیث میں چونکہ مسلمانوں کے سوال کے جواب میں یہ بات بتائی گئی ہے اس لئے ان کو مخاطب کیا گیا ہے۔

اب دیکھو ایک ہی صفت کی تشریح میں مذاہب میں کہاں سے کہاں تک اختلاف پہنچ گیا ہے۔ اسلام نے اس کا مفہوم اور لیا ہے اور بعض دوسرے مذاہب نے اور۔ انہوں نے صفت رحم کو قائم رکھنے کے لئے تناسخ کا مسئلہ پیش کیا ہے حالانکہ ایک ادنیٰ تدبر سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اسلام کی تشریح بالکل طبعی اور قانون قدرت کے مطابق ہے اور دوسری تشریح کی بناء ہمیں بعض ایسے مفروضہ امور پر رکھنی پڑتی ہے جو ثابت نہیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی صفات عدل اور رحم بھی قابل توجہ ہیں۔ تمام مذاہب خدا تعالیٰ کو عادل بھی مانتے ہیں اور رحیم بھی لیکن تشریح میں بڑا اختلاف ہے اسلام کہتا ہے کہ ان دونوں صفات میں اختلاف

نہیں ہے۔ یہ ایک ہی وقت میں عمل کر سکتی ہیں اور کرتی ہیں عدل رحم کے خلاف نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر ہے چنانچہ قرآن کریم فرماتا ہے۔ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ [۶۸]۔ جو نیکی کرے گا اس کو دس گناہ بدلہ ملے گا اور جو بدی کرے گا اس کو اتنا ہی ملے گا جتنا اس نے عمل کیا ہے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اسلام کے نزدیک کسی کو اس کے حق سے زیادہ اجر دیدینا ظلم نہیں ہے بلکہ اس کے حق سے زیادہ سزا دینا ظلم ہے اور اس میں کیا شک ہے کہ ظلم کہتے ہیں کسی کو اس کے حق سے زیادہ سزا دے دینے یا اس کے حق سے کم اجر دینے یا اس کا حق کسی اور کو دیدینے کو۔ اور یہ کام کبھی اللہ تعالیٰ نہیں کرتا۔ نہ کبھی کسی کو اس کے حق سے زیادہ سزا دیتا ہے نہ اس کے اجر کو کم کر دیتا ہے نہ کسی کا حق کسی اور کو دیدیتا ہے بلکہ وہ جو کچھ کرتا ہے یہ ہے کہ ایک نادم اور پشیمان بندے کو جو اپنی غلطی کو محسوس کر کے اپنے بداعمال کو ترک کر کے ایک دھڑکتے ہوئے دل اور کانپتے ہوئے ہونٹوں اور چشمہ کی طرح جاری آنکھوں اور شرمندگی سے جھکی ہوئی گردن کے ساتھ اور آئندہ کے لئے کامل پاکیزگی اور طہارت کے خیالات سے جو متلاطم سمندر کی لہروں کی طرح جوش مار رہے ہوتے ہیں پُر دماغ سے اللہ تعالیٰ کے عرش پر جا کھڑا ہوتا ہے معاف کر کے نئی زندگی شروع کرنے کا موقع دیتا ہے اور اس باپ کی طرح جس کا بچہ آوارہ ہو گیا تھا اور مدت کے بعد پشیمان ہو کر واپس گھر آیا تھا اور اپنے کئے پر ایسا پشیمان تھا کہ باپ کے سامنے آنکھیں نہیں اٹھا سکتا تھا۔ محبت کے جذبات سے لبریز ہو کر اپنے سینہ سے لگالیتا ہے اور اس کو دھتکارتا نہیں بلکہ اس کے واپس لوٹنے پر خوشی کا اظہار کرتا ہے کیا باپ کے اس فعل پر دوسرے بیٹوں کو جو اپنے باپ کی خدمت میں لگے ہوئے تھے کوئی شکوہ کا موقع ہے؟ کیا ان کے لئے کسی اعتراض کی گنجائش ہے؟ بخدا نہیں اور ہرگز نہیں۔

بے شک سزا ایک بہت بڑا ذریعہ اصلاح کا ہے لیکن سچی ندامت اور حقیقی پشیمانی سے زیادہ سزا دوزخ کی آگ نہیں ہو سکتی۔ جو کام دوزخ کی آگ لاکھوں سالوں میں کر سکتی ہے سچی ندامت وہ کام منٹوں میں کر جاتی ہے اور جب کوئی شخص سچے طور پر اپنی بدیوں سے توبہ کر کے اور آئندہ اصلاح پر آمادہ ہو کر خدا تعالیٰ کے سامنے حاضر ہو تو اللہ تعالیٰ کی رحیمیت کا تقاضا ہے کہ اس پر رحم کرے۔ کیا رحیم و کریم خدا اپنے ایک عاجز بندے کو جو امید و آرزو کا مجسم نمونہ بن کر اور اپنے افعال سے بیزار ہو کر اس کی رحمت کے آستانے پر نڈھال ہو کر گر جاتا ہے دھتکار دے اور

اس کی طرف سے منہ پھیر لے؟ نہیں بخدا ہرگز نہیں۔

سب سے آخر میں میں اس صفت کو لیتا ہوں جو سب صفات سے زیادہ مشہور ہے لیکن جس میں تفصیلاً سب سے زیادہ اختلاف ہے۔ یہ صفت احدیت کی صفت ہے۔ دنیا میں آجکل ایک مذہب بھی نہیں جو دو خداؤں یا اس سے زیادہ خداؤں کا قائل ہے۔ توحید کے مسئلہ پر اصولی طور پر سب مذہب متفق ہو چکے ہیں بلکہ ایک مذہب کے پیرو دوسرے مذہب کے پیروؤں کے خلاف یہ حربہ چلاتے ہیں کہ یہ پوری طرح توحید کے قائل نہیں ہیں۔ میں نے بعض یورپین مصنّفین کی کتب دیکھی ہیں جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مسلمان مشرک ہیں اور میں نے سنا ہے کہ یورپ اور امریکہ میں بہت سے لوگ جو اسلامی لٹریچر سے ناواقف ہیں یہ خیال کرتے ہیں کہ مسلمان رسول کریم ﷺ کی پرستش کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عام طبائع اس امر کو محسوس کرتی ہیں کہ اب ایک سے زیادہ خداؤں کا مسئلہ پیش کرنا بالکل ناممکن ہے۔ دنیا اس کو سننے کے لئے تیار نہیں مگر باوجود توحید کے لفظ پر سب مذاہب کے اجتماع کے توحید کے متعلق تمام میں اختلاف ہے اور کئی مذاہب ہیں جو توحید کے نام کے نیچے ہر قسم کا شرک چھپائے بیٹھے ہیں مگر اسلام شرک سے کُلّی طور پر پاک ہے۔ اس نے ہر قسم کی مشرکانہ باتوں کا بکُلّی استیصال کیا ہے اور شرک کی اصل حقیقت کو کھول کر سامنے رکھ دیا ہے جس کی وجہ سے کسی کو دھوکا نہیں لگ سکتا۔ چنانچہ قرآن کریم شرک کو چار قسم میں تقسیم کرتا ہے۔

ایک قسم شرک کی تو فرماتا ہے کہ ندّ بنانا ہے یعنی یہ یقین کر لینا کہ خدا کی طرح کوئی اور خدا بھی ہے جو اس کے ساتھ ذات میں شریک ہے۔

دوسرے شریک قرار دینا یعنی یہ خیال کرنا کہ کوئی ہستی اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے سب یا بعض میں اس کے ساتھ شریک ہے خواہ اس کو معبود بنایا جائے یا نہ بنایا جائے۔ مثلاً یہ سمجھ لیا جائے کہ فلاں انسان مخلوق پیدا کر سکتا ہے یا مُردے زندہ کر سکتا ہے گو کسی شخص کو انسان قرار دے کر ہی یہ صفات اس کی طرف منسوب کی جائیں مگر یہ شرک ہوگا کیونکہ صرف نام کا فرق ہے حقیقتاً اس شخص کو خدا ہی قرار دیا گیا ہے۔

تیسری قسم کا شرک کسی کو اِلٰہ قرار دینا ہے یعنی کسی کی خدا کے سوا عبادت کرنی خواہ اس کو خدا نہ ہی سمجھا جائے یا خدا تعالیٰ کی صفات میں شریک قرار نہ دیا جائے جیسے کہ پرانے زمانہ میں بعض اقوام میں ماں باپ کی عبادت کی جاتی تھی۔

چوتھے کسی کو ربّ قرار دینا یعنی کسی بزرگ یا پیر کو ایسا سمجھ لینا کہ وہ بشریت کی غلطیوں سے بھی پاک ہے اور وہ جو کچھ حکم دے خواہ وہ کیسا ہی بُرا ہو اس کا ماننا ضروری ہے اور کسی بندہ کی بات کو خواہ وہ کتنا ہی بڑا ہو خدا تعالیٰ کی بات پر عملاً مقدم کرنا خواہ اعتقاداً اس کو خدا نہ سمجھے۔

قرآن کریم میں ان چاروں قسموں کے شرکوں کا ذکر اس آیت میں فرمایا ہے۔

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ [۶۹]۔ یعنی اے اہل کتاب اس امر میں تو ہم سے اتفاق کرو جس میں تم اور ہم اجمالاً متفق ہیں یعنی صرف اس خدا کی جس کا شریک فی الجوہر کوئی نہیں عبادت کریں اور کسی کو اس کی صفات میں شریک نہ کریں اور بندوں میں سے کسی کی بات کو اس کے حکم پر مقدم نہ کریں۔ اگر یہ لوگ بات نہ مانیں تو کہہ دو کہ ہم تو اس رنگ میں خدا کے فرمانبردار ہو کر رہیں گے۔ غور کرو کس طرح تمام اقسامِ شرک خواہ بڑی ہوں خواہ چھوٹی اس مختصر سے کلام میں جمع کر دی ہیں۔ اس حکم کے ماتحت جب ایک مسلمان یہ کہتا ہے کہ وہ ایک خدا کا قائل ہے تو وہ اس لفظ کے وہی معنے لیتا ہے جو زبان میں اس فقرے کے معنے ہوتے ہیں۔ وہ سوائے ایک خدا کے کسی کی عبادت نہیں کرتا وہ اس کی صفات کسی اور کو نہیں دیتا وہ اس کو ہر ایک قسم کی رشتہ داریوں سے پاک قرار دیتا ہے۔ وہ اسے حلول اور اوتار بننے کی حالتوں سے بالا سمجھتا ہے وہ اسے موت اور بھوک اور پیاس کے جذبات سے خواہ بطور تنزل ہی کیوں نہ ہوں پاک سمجھتا ہے۔ اس کا ماتھا کسی اور کے آگے نہیں جھکتا۔ وہ اپنی امیدوں کا ماٰویٰ اور کسی کو نہیں بناتا۔ وہ دعاؤں میں اور کسی کو مخاطب نہیں کرتا۔ وہ خدا کے نبیوں کا بڑا ادب کرنے والا ہے لیکن وہ ان کو بھی خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں انسانوں جیسا انسان خیال کرتا ہے اور یہی تعلیم ہے جو اسلام اسے دیتا ہے اور جس پر عمر بھر چلنے کی اسے تاکید کرتا ہے۔ اب اجمالاً تو سارے ہی مذہب اس کے ساتھ توحید باری کے اقرار میں متفق ہیں لیکن تفصیلات میں ہر ایک اپنا الگ الگ راستہ لے لیتا ہے اور سب مذاہب میں ایک عظیم الشان بُعد پیدا ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اسلام کی تعلیم اللہ تعالیٰ کی صفات کے متعلق نہایت مکمل ہے کیا بلحاظ اجمال کے اور کیا بلحاظ تفصیل کے اور اس تعلیم سے جو رغبت انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیدا ہو سکتی ہے اور کسی مذہب کے ذریعہ وہ رغبت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اور مزید خوبی یہ ہے کہ اسلام

تفصیل کے ساتھ ہر اک صفت کا ذکر کرتا ہے اور اس کا جو اثر روزانہ زندگی کے حالات پر پڑتا ہے اس کو بیان کرتا ہے اور مختلف صفات کے آپس میں تعلقات اور اس کے اثر کی حد بندیوں کو بھی بیان فرماتا ہے۔ یہاں تک کہ خدا تعالیٰ کا وجود بندہ کی عقل کی آنکھوں کے سامنے آکھڑا ہوتا ہے اور اس کا دل خدا کی محبت سے لبریز ہو کر بہہ پڑتا ہے اور اس کے ساتھ صفات الٰہیہ کے بیان کرنے میں جو دوسرے مذاہب کو اشتراک ہے وہ صرف نام کا ہے نہ حقیقت کا حالانکہ اصل چیز حقیقت ہوتی ہے نہ کہ محض نام۔

دوسرا سوال

خدا سے بندہ کا تعلق ذات و صفات باری کے متعلق جو اسلام کی تعلیم ہے اس کو مختصر بیان کر دینے کے بعد اب میں مقصد اول کے دوسرے سوال کو لیتا ہوں جو یہ ہے کہ بندے کو خدا سے کیا تعلق ہونا چاہئے؟

یاد رکھنا چاہئے کہ صرف کسی چیز کو مان لینا اور بات ہے تمام تعلیم یافتہ لوگ نارتھ پُول اور ساؤتھ پُول کے وجود پر یقین رکھتے ہیں لیکن ان سے تعلق سوائے ان چند لوگوں کے جو ان علاقوں کی مزید تحقیقات میں مشغول ہیں کسی کو نہیں ہے ان کے ذکر سے ان کے جذبات میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوتی لیکن ایک ایسے شخص کے ذکر سے جو ان سے کوئی حقیقی تعلق رکھتا ہے ان کے جذبات یک دم بھڑک اٹھتے ہیں۔ پس یہ بھی سوال ہے کہ کوئی مذہب اپنے پیروؤں سے خدا تعالیٰ کے متعلق کس قسم کے تعلق کا مطالبہ کرتا ہے کیونکہ اسی مطالبہ کے معیار پر کسی مذہب کی سچائی یا اس کی غلطی یا اس کی قبولیت یا اس کی ناکامی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اگر وہ ایسا مطالبہ اپنے متبعین سے کرتا ہے جو خدا تعالیٰ کی شان کے خلاف ہے تو ماننا پڑے گا کہ صفات الٰہیہ پر حقیقی ایمان نہیں رکھتا اور اگر مطالبہ تو صحیح ہے لیکن اس کے پیرو اس مطالبہ کو پورا نہیں کرتے تو ماننا پڑے گا کہ وہ مذہب اپنے مقصد کے پورا کرنے میں ناکام رہا ہے۔

میں جو اللہ تعالیٰ کی صفات پہلے بیان کر چکا ہوں اور جن پر تمام مذاہب قریباً متفق ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا اصل تعلق اللہ تعالیٰ سے ہی ہے کیونکہ ہمارے آرام اور ہماری ترقی اور ہماری کامیابی کے سب سامان اسی نے پیدا کئے ہیں۔ ہماری ہستی کے وجود میں لانے کا بھی وہی

باعث ہے اور ہماری آئندہ زندگی بھی اسی کے فضل سے وابستہ ہے۔ اس سے بڑھ کر نہ ہمارے والدین ہو سکتے ہیں نہ ہماری اولاد' نہ ہمارے بھائی' نہ ہماری بیویاں' نہ ہمارے خاوند' نہ ہمارے دوست' نہ ہمارے اہل ملک' نہ ہماری حکومت' نہ ہمارا ملک' نہ ہماری جائداد' نہ ہمارا عہدہ' نہ ہماری عزت' نہ خود ہماری جان کیونکہ یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کے عطیوں کا ایک جزو ہیں اور وہ اس کُل کا معطی ہے۔ درحقیقت ان صفات کو بیان کرنے کے بعد جو اوپر بیان ہو چکی ہیں وہی مذہب سچا ہو سکتا ہے جو انسان سے یہ مطالبہ کرے کہ وہ خدا تعالیٰ کی محبت اور اس کے ادب کو سب چیزوں کی محبت اور سب حاکموں کے ادب پر فوقیت دے اور خدا کی رضا کے لئے سب چیزوں کو قربان کرنا پڑے تو کر دے مگر خدا کی رضا کو کسی اور چیز پر قربان نہ کرے۔ وہ اس امر کا مطالبہ کرے کہ خدا تعالیٰ کی محبت انسان کے دل میں سب چیزوں سے زیادہ ہونی چاہئے اور اس کی یاد سب پیاروں کی یاد سے بڑھ کر ہونی چاہئے۔ اس کے وجود کو ایک دور کے ملک کے پہاڑ یا دریا کی طرح عالمِ موجودات کا ایک فرد نہیں سمجھ چھوڑنا چاہئے بلکہ اس کو ہر ایک زندگی کا سرچشمہ اور ایک امید کا مرکز اور ہر ایک نظر کا مطمح بنانا چاہئے۔

اسلام یہی تعلیم دیتا ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ [۲۷]۔ اے ہمارے رسول! کہہ دے اگر تمہارے ماں باپ اور تمہاری اولاد اور تمہارے بھائی بہنیں اور تمہاری بیویاں یا تمہارے خاوند یا تمہاری قوم یا تمہارے مال جن کو تم محنتوں سے کماتے ہو۔ یا تمہاری تجارتیں جن میں نقصان ہو جانے کا تمہیں خطرہ ہوتا ہے یا تمہارے گھر جن کو تم پسند کرتے ہو اللہ اور اس کے رسول اور اللہ کی رضا کے لئے کوشش کرنے کی نسبت تمہیں زیادہ پیارے ہیں تو تم مومن نہیں ہو۔ تم انتظار کرو اس وقت کا جب خدا تعالیٰ تمہارے متعلق کوئی فیصلہ کرے اور اللہ عہد شکن لوگوں کو کامیاب نہیں کرتا۔

ایک مسلمان ہرگز مسلمان نہیں کہلا سکتا جب تک اس کا اللہ تعالیٰ سے ایسا ہی تعلق نہ ہو جو اس آیت میں بیان ہوا ہے۔ اسے خدا کی رضا کے لئے ہر ایک دیگر چیز اور ہر ایک دوسرے جذبہ کو قربان کر دینا چاہئے۔ اس کی محبت ہر ایک دوسری چیز پر اسے مقدم ہونی چاہئے۔ ایک دوسری جگہ پر اللہ تعالیٰ محبت الٰہی کی علامت کا اس طرح ذکر فرماتا ہے اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا

وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ [71]۔ مومن وہ ہیں جو خدا تعالیٰ کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ کھڑے بھی اور بیٹھے بھی اور لیٹے ہوئے بھی۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت ان کے دلوں میں ایسی گھر کر جاتی ہے کہ وہ بار بار اس کی ملاقات اور اس کے قرب کی خواہش کرتا ہے اور جس طرح ایک عاشق اپنے معشوق کو ہر وقت یاد کرتا رہتا ہے اس سے بھی زیادہ ایسا انسان اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول رہتا ہے۔ اس کے احسانات اور اس کی خوبیاں اور اس کے قرب کی تمنا اور اس سے ایک ہو جانے کی خواہش اس کے دل میں بار بار جوش مارتی رہتی ہے حتیٰ کہ دن کو کام کے وقت یا آرام کی خاطر بیٹھنے کے وقت یا رات کو سوتے وقت بھی اس کی طرف بندہ کی توجہ پھرتی رہتی ہے۔

اسی طرح فرماتا ہے اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ [72]۔ مومن صرف وہ لوگ ہیں جن کے دل پر خدا تعالیٰ کا ایسا رُعب ہوتا ہے کہ اگر خدا تعالیٰ کا نام ان کی مجلس میں آجائے تو ان کے دلوں میں خشیت اللہ کی ایک لہر پیدا ہو جاتی ہے اور جب اللہ تعالیٰ کا کلام ان کے سامنے پڑھا جائے تو ان کا دل ایمان سے بھر جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر توکّل کرتے ہیں یعنی ہر اک کام کا انجام پانا اسی کی مدد پر موقوف سمجھتے ہیں اور اپنی کامیابیوں کو اسی کے فضل پر منحصر خیال کرتے ہیں۔

میں اس جگہ ایک شبہ کا ازالہ کر دینا مناسب سمجھتا ہوں جو عام طور پر اسلام کی نسبت کیا جاتا ہے اور وہ یہ کہ اسلام اس امر کی تعلیم دیتا ہے کہ اسباب سے انسان کو کوئی کام ہی نہیں لینا چاہئے اور اپنے کام خدا پر چھوڑ دینے چاہئیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض لوگوں میں ایسے خیالات پائے جاتے ہیں مگر اسلام کی ہر گز یہ تعلیم نہیں تمام قرآن ان آیات سے بھرا ہوا ہے کہ دنیا کی نعمتیں ہم نے انسان کے فائدے کے لئے پیدا کی ہیں۔ پس ان کو ترک کرنا اس کے منشاء کے مطابق کس طرح ہو سکتا ہے اور ایک جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا [73]۔ اور ہر کام کے لئے ہم نے جو طریق مقرر کئے ہیں ان کے ذریعہ سے وہ کام کرو یعنی اسباب اور ذرائع بھی اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں انہی کے ذریعہ سے کام کرنا چاہئے۔ اور فرمایا خُذُوْا حِذْرَكُمْ [74]۔ اے مسلمانو! تمام وہ سامان جن سے کامیابی ہو سکتی ہے اپنے پاس رکھو اور ایک جگہ فرمایا وَتَزَوَّدُوْا [75]۔ جب سفر کو نکلو تو اپنے پاس سفر کا سامان ضرور رکھا کرو اسی طرح رسول کریم ﷺ کی نسبت آتا ہے کہ ایک شخص آپ کے پاس آیا آپ نے اس سے پوچھا کہ تُو نے اونٹ کس کے حوالے کیا ہے اس نے کہا یا رسول اللہ! میں نے خدا پر توکّل کر کے اس کو چھوڑ دیا ہے۔

آپ نے فرمایا یہ توکل نہیں ہے۔ تو پہلے اونٹ کا گھٹنا باندھ پھر خدا پر توکل کر[۷۶]۔ آپ کا مطلب یہ ہے کہ توکل ترک اسباب کا نام نہیں بلکہ اس امر پر یقین کا نام ہے کہ خدا تعالیٰ ایک زندہ خدا ہے وہ دنیا کو پیدا کر کے خالی ہاتھ ہو کر نہیں بیٹھ گیا بلکہ اب بھی اس کا حکم دنیا میں چلتا ہے سب کاموں کے نتیجے اسی کے حکم سے نکلتے ہیں۔ وہ اس بندے کی جو اس پر یقین رکھتا ہے اس وقت حفاظت کرتا ہے جب وہ غافل ہوتا ہے اور اس حالت میں اس کے کام کی نگرانی کرتا ہے جب وہ سامنے نہیں ہوتا۔

غرض اس امر پر یقین کرنے کا نام کہ خدا تعالیٰ اب بھی اپنے بندوں کی مدد کرتا ہے اور ان کی بے کسی کی حالتوں میں ان کا ساتھ دیتا ہے اور باوجود سامانوں کی موجودگی کے اگر اس کا غضب نازل ہو تو کوئی کامیابی نہیں ہو سکتی توکّل ہے نہ ترک اسباب۔ گویا توکّل ایک دلی حالت کو کہتے ہیں نہ کسی ظاہری عمل یا ترکِ عمل کو۔

اسی طرح ایک جگہ فرماتا ہے وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ[۷۷]۔ اللہ تعالیٰ کی رضا سب سے مقدم ہے یعنی بندہ کو خدا تعالیٰ سے تعلق کی بنیاد کسی دنیوی یا اخروی انعام پر نہیں رکھنی چاہئے بلکہ جو چیز اس کے مدنظر ہونی چاہئے وہ محض اللہ تعالیٰ کی رضا ہے جب خدا تعالیٰ اس کا محبوب ہو تو اس کی رضا پر کسی اور چیز کو مقدم کرنا اپنی محبت کی ہتک کرنا ہے۔

مذکورہ بالا حوالوں سے جو صرف بطور نمونہ دیئے گئے ہیں یہ اچھی طرح معلوم ہو سکتا ہے کہ اسلام بندہ سے خدا تعالیٰ سے کس قسم کا تعلق رکھنے کی امید کرتا ہے اور جہاں تک میرا خیال ہے ہر ایک شخص جو خدا تعالیٰ کو فی الواقع مانتا ہے اس امر میں ہم سے متفق ہو گا کہ اگر کوئی خدا ہے تو اس سے ہمارا ایسا ہی تعلق ہونا چاہئے۔

تیسرا سوال

یعنی کن اعمال سے بندہ اپنے تعلق باللہ کا اظہار کرے؟

یا یہ کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے بندہ پر کیا کیا ذمہ داریاں ہیں؟

دوسرے سوال کا جواب دینے کے بعد میں تیسرے سوال کو لیتا ہوں اس سوال کا جواب

مختلف مذاہب نے مختلف طور پر دیا ہے اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس سوال کے متعلق مختلف مذاہب کا پہلے سوالوں کی نسبت زیادہ اختلاف ہے۔ اسلام اس سوال کا یہ جواب دیتا ہے اور یہی طبعی جواب ہے کہ انسان کو چاہئے کہ اس غرض کو پورا کرے جس غرض کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی معیت تلاش کرے اور اس کا کامل عبد بنے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ - هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ - قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَآءَنِيَ الْبَيِّنٰتُ مِنْ رَّبِّيْ وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ - [۴۸] یعنی اللہ وہ ذات ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو ایسا بنایا ہے کہ اس میں تمہاری ضرورتوں کے سب سامان مہیا ہیں اور آسمان کو تمہارے لئے موجب حفاظت بنایا ہے اور تم کو شکلیں دی ہیں اور ایسی شکلیں دی ہیں جو تمہارے کام کے مطابق ہیں اور پاکیزہ رزق تم کو عطا کیا ہے یہ تمہارا خدا ہے پس کیا ہی برکت والا ہے یہ خدا جو صرف تمہارا ہی رب نہیں بلکہ سب مخلوقات کا رب ہے وہ زندہ ہے اور دوسروں کو زندگی بخشا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پس اس کو پکارو اس طرح کہ سوائے اس کے اور کسی کی عبادت نہ کرو۔ سب تعریف اس خدا کے لئے ہے جو سب مخلوق کا رب ہے۔ تو کہہ دے مجھے منع کیا گیا ہے کہ میں ان کی عبادت کروں جن کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو بعد اس کے کہ میرے پاس میرے رب کے کھلے کھلے نشان آچکے ہیں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سب جہانوں کے رب کا پورا فرمانبردار ہو جاؤں۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس قلبی تعلق کے علاوہ جس کا پہلے ذکر آچکا ہے اپنے بندے سے ظاہری اعمال میں بھی اپنے احکام کی فرمانبرداری چاہتا ہے۔ یہ احکام جیسا کہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کئی قسم کے ہیں مگر اس جگہ میں صرف ان احکام کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو عبادت سے تعلق رکھتے ہیں یعنی جن میں اللہ تعالیٰ کے حضور میں اظہار عبودیت کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ بنی نوع انسان کے ساتھ ان کا براہ راست تعلق نہیں۔

یہ اعمال اسلام نے پانچ قسم کے مقرر کئے ہیں۔ (۱) نماز (۲) ذکر (۳) روزہ (۴) حج (۵) قربانی۔ اور ان پانچوں قسم کے احکام میں تمام مذاہب میں قریباً اشتراک پایا جاتا ہے یعنی ان میں ان پانچوں قسم کی عبادتوں کا وجود پایا جاتا ہے گو طریق عبادت مختلف ہیں۔ جدید تحقیق جو پرانے

مذاہب کے متعلق ہو رہی ہے وہ اور نئے نئے مذاہب کو ان مذاہب کی صف میں لاکر کھڑا کر رہی ہے جن میں مذکورہ بالا پانچ قسم کی عبادات پائی جاتی ہیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جبکہ نئی تحقیقات اس امر کو ثابت کر رہی ہیں کہ ان عبادات کا پتہ سب مذاہب میں ملتا ہے خیالات کی جدید رَو اس طرف جارہی ہے کہ ان عبادات کا کوئی فائدہ نہیں۔ خدا تعالیٰ کا ہرگز یہ منشاء نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے بندوں کو ان ظاہری شکلوں میں جکڑے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ آج ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں سے ظاہری عبادات کا اثر بہت کچھ مٹتا جاتا ہے اور اکثر مذاہب کے پیرو ظاہری عبادات کو بالکل ترک کرتے چلے جاتے ہیں۔ مگر اسلام جس طرح ہر زمانہ کی ضروریات کے لئے تعلیمات کا ذخیرہ رکھتا ہے اسی طرح اس کی یہ شان بھی ہے کہ اس کی قائم شدہ تعلیم بدلتی نہیں۔ وہ ایک چٹان کی طرح ہے جسے زمانہ کے سیلاب اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتے۔ وہ نیچر کی طرح نئے سے نئے انکشافات تو کرتا ہے مگر نیچر کی طرح اس میں یہ خاصیت بھی ہے کہ اس کا کوئی قانون بدلتا نہیں کیونکہ اس کے سب قوانین کی بنیاد عالم الغیب ہستی کی طرف سے حق اور حکمت پر رکھی گئی ہے۔

یاد رکھنا چاہئے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ تعلق کی بنیاد دل پر ہے اگر دل گندہ ہو اور محبت سے خالی ہو تو ظاہر میں کتنی ہی فروتنی دکھائی جائے یا اخلاص کا اظہار کیا جائے اس کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ ایسا فعل ایک لعنت ہے جو اپنے مرتکب کو تاریکی کے عمیق گڑھوں میں گرا دیتا ہے۔ قرآن کریم نہ صرف اس نکتہ کو تسلیم کرتا ہے بلکہ اس پر خاص طور سے زور دیتا ہے چنانچہ فرماتا ہے فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ۔ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ۔ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ [۷۹]۔ یعنی خدا تعالیٰ کا غضب نازل ہوگا ان لوگوں پر جو عبادت تو کرتے ہیں مگر اس کی حقیقت سے غافل ہیں اور صرف لوگوں کے دکھاوے کے لئے نماز پڑھ لیتے ہیں اسی طرح فرماتا ہے کہ جو لوگ صدقات دکھاوے کے طور پر دیتے ہیں مگر دل میں کوئی اخلاص نہیں ہوتا فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا [۸۰]۔ ان کی حالت اس پتھر کی طرح ہوتی ہے جس پر مٹی جمی ہوئی ہو اور جب بارش اس پر پڑے تو بجائے اس کے کہ دانہ اگے وہ مٹی کو بھی بہا دیتی ہے اور دانہ اگنے کا احتمال بھی باقی نہیں رہتا۔ اس قسم کا صدقہ دینے والا بھی بجائے کسی فضل کا وارث ہونے کے اپنی حالت کو اور بھی خراب کرلیتا ہے پس اسلام کے نزدیک جب تک دل ساتھ نہ ہو اس وقت تک عبادت نفع نہیں دیتی لیکن اسلام اس امر پر بھی زور دیتا ہے کہ دل کے ساتھ زبان اور جسم بھی عبادت میں شامل ہونے چاہئیں۔

قرآن کریم اور آنحضرت ﷺ کے ارشادات سے بالکل واضح طور سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کا کمال تین چیزوں یعنی دل اور زبان اور جوارح کے ایک ہو جانے سے پیدا ہوتا ہے جس شخص کا دل سچائی کو قبول نہیں کرتا اور زبان اور جوارح ایمان کا اظہار کرتے ہیں وہ بھی منافق ہے اور جس کا دل ایمان پر قائم ہے لیکن زبان اور جوارح مخالف ہیں وہ بھی جھوٹا ہے سچا وہی ہے جس کا دل بھی ایمان پر قائم ہو اور زبان اور جوارح بھی اس کے ساتھ شامل ہوں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ جب کسی انسان کو کسی شخص سے پیار ہو تو اس کے سامنے آنے یا اس کا ذکر آجانے سے اس کے چہرے پر فوراً ایک خاص قسم کا اثر محسوس ہوتا ہے اور ایک اجنبی شخص بھی جان لیتا ہے کہ اس کے دل میں اس دوسرے کی نسبت محبت ہے۔ ماں باپ اپنے بچوں کو پیار کرتے ہیں تو کیوں؟ کیا ان کے دل کی محبت کافی نہیں ہوتی؟ وہ اپنے بچہ کو کس لئے چومتے ہیں کس لئے اپنی گود میں اٹھاتے ہیں؟ لوگ اپنے دوستوں سے مصافحہ کیوں کرتے ہیں؟ یورپ کے لوگ جب بادشاہوں کے سامنے حاضر ہوتے ہیں تو سر ننگا کر دیتے ہیں یا ان کے سامنے گھٹنا ٹیکتے ہیں۔ ایسا کیوں کیا جاتا ہے؟ کیا ان مواقع پر دل کی محبت اور دل کا اخلاص کافی نہیں ہوتا؟ اگر کہا جائے کہ انسان چونکہ دلی حالت کو نہیں جانتا اس لئے اس کو دل کا حال بتانے کے لئے ظاہر میں بھی بعض نشانات ایسے قرار دیئے گئے ہیں جن سے کہ دل کی محبت کا اظہار کر دیا جاتا ہے اور ان کے ذریعہ سے دوسرے کو معلوم ہوتا ہے کہ فلاں شخص مجھ سے محبت رکھتا ہے۔ مگر یہ جواب درست نہیں کیونکہ ہر ایک شخص جانتا ہے کہ جب وہ اپنے بچہ کو پیار کرتا ہے یا اپنے کسی عزیز یا دوست کی طرف مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتا ہے تو اس وقت اس کا یہ فعل اس خیال کے ماتحت نہیں ہوتا کہ وہ اس پر اپنی محبت کا اظہار کرے۔ کیا نوزائیدہ بچے کو جو بالکل سمجھ نہیں رکھتا ماں پیار نہیں کرتی؟ یا سوئے ہوئے بچہ کو والدین بسا اوقات پیار نہیں کرتے؟ پس معلوم ہوا کہ محبت کو جسمانی علامات کے ذریعہ سے ظاہر کرنا ایک طبعی تقاضا ہے نہ کہ دل کی حالت جتانے کا ایک ذریعہ۔ پس جو شخص خدا تعالیٰ سے محبت رکھتا ہے اور فی الواقع اس کی طرف اس کے دل میں کشش ہے کس طرح ممکن ہے کہ اعمال اور زبان کے ذریعہ سے اس کی محبت ظاہر ہونے کی کوشش نہ کرے اور یہی غرض ہے کہ جو مذہب نے عبادات میں رکھی ہے۔ عبادت اس قلبی تعلق کا ایک ظاہری نشان ہے اور جو شخص سچے طور سے خدا تعالیٰ سے محبت رکھتا ہے وہ باوجود دوسری چیزوں کی محبت کو جسمانی علامات کے ذریعہ سے ظاہر کرنے کے عبادت کے متعلق کس طرح اعتراض کر سکتا ہے؟

عبادت پر اعتراض در حقیقت محبت کی کمی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔
گو مذکورہ بالا وجہ عبادات کی حقیقت کے سمجھانے کے لئے کافی تھی مگر اسلام نے اس سے بڑھ کر حکمتیں عبادت میں مدنظر رکھی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ قرآن کریم فرماتا ہے کہ ظاہری اعمال کا اثر باطن پر پڑتا ہے اور باطن کا ظاہر پر۔ چنانچہ فرماتا ہے وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ [81]۔ جو شخص ان مقامات کا ادب کرتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ کے جلال کا اظہار ہوا تھا تو ایسا ہونا ہی چاہئے کیونکہ دل کی خشیت کا ظاہر پر اثر ہوتا ہے۔ اس جگہ دلی پاکیزگی کے ظاہر پر طبعی طور پر اثر پیدا کر دینے کا ذکر ہے۔ دوسری جگہ ظاہر کے باطن پر اثر ہونے کا یوں ذکر فرماتا ہے كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ [82]۔ خبردار ہو جاؤ کہ ان لوگوں کے دلوں میں بوجہ ان کے ظاہری اعمال کے نقص پیدا ہو گیا ہے کہ پہلے یہ اپنے فوائد کے لئے ظاہری حق کے خلاف کرتے رہے آخر نتیجہ یہ نکلا کہ دل سے بھی حق کی محبت دور ہو گئی۔
علم سائیکالوجی [83]۔ کے ذریعہ سے مذکورہ بالا حقیقت آج کل بالکل یقینی طور پر ثابت ہو چکی ہے۔ میں نے ایک امریکن سائیکالوجسٹ کی کتاب میں پڑھا ہے کہ ایک امریکن کالج کا پرنسپل جو پہلے نہایت لائق سمجھا جاتا تھا پرنسپل ہو کر نہایت ناقابل ثابت ہوا آخر اسے ایک دوست نے مشورہ دیا کہ اس کا منہ کھلا رہتا ہے اگر وہ منہ بند کرنے کی عادت ڈالے تو اس سے اس کے اخلاق پر بھی اثر پڑے گا اور طبیعت میں انتظام کا مادہ زیادہ ہو جائے گا چنانچہ اس نے ایسا ہی کرنا شروع کیا اور آخر اس کی بے استقلالی جاتی رہی اور وہ نہایت کامیاب پرنسپل ہو گیا۔ ہم روز مرہ کے معاملات میں بھی دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص غصہ کی شکل بنائے تو تھوڑی دیر میں اس کے دل میں غصہ کے خیالات جوش میں آنے لگتے ہیں۔ اگر غصہ کی حالت میں کسی کو گدگدی کر کے یا اور کسی طرح ہنسا دیا جائے تو دیکھا جاتا ہے کہ اس کے دل کا غصہ بھی جاتا رہتا ہے۔ رونے کی شکل بنانے سے دل میں غم کے جذبات اور ہنسی کی شکل سے فرحت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اسی حکمت کو مدنظر رکھ کر شریعت اسلام نے نماز وغیرہ ظاہری عبادات مقرر کی ہیں کہ جب انسان ظاہر میں خشوع اور خضوع کی حالت اختیار کرتا ہے تو آہستہ آہستہ اس کے دل میں ایک محبت کا چشمہ پھوٹ پڑتا ہے اور آخر وہ اس طرح خدا تعالیٰ کی طرف کھنچا جاتا ہے جس طرح کہ مقناطیس کی کشش سے لوہا کھنچا جاتا ہے۔
ایک حکمت ظاہری عبادت میں یہ بھی ہے کہ اس سے قومی روح پیدا ہوتی ہے بچے یہ سبق

کہ اپنے بھائیوں سے اور رشتہ داروں سے محبت کرنی چاہئے انہی ظاہری تعلقات کو دیکھ کر سیکھتے ہیں جو وہ اپنے اردگرد کے لوگوں کے برتاؤ سے معلوم کرتے ہیں۔ اگر محبت اور غضب کے جذبات صرف قلب میں مخفی ہوتے تو کبھی بھی یہ عام رشتہ محبت کا جو رشتہ داروں میں پایا جاتا ہے پایا نہ جاتا کیونکہ دل کے خیالات کسی پر ظاہر نہیں ہوتے۔ بچہ کس طرح معلوم کر سکتا تھا کہ فلاں فلاں شخص سے میرے والدین کو یا دوسرے عزیزوں کو محبت کا تعلق ہے اور فلاں فلاں سے ان کو عداوت ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ سب ظاہری علامات سے ہی اسے معلوم ہوتا ہے اور اس طرح یہ جذبات نسلاً بعد نسلٍ محفوظ چلے جاتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کی محبت کے اظہار کی ظاہری علامات نہ مقرر کی جائیں اور اس کی شان اور اس کے رتبہ کا اقرار کسی جسمانی علامت سے نہ کیا جائے اور متواتر نہ کیا جائے تو یقیناً آئندہ نسلوں کے دلوں میں جنہوں نے پہلے نقوش اپنے ماں باپ کے حالات سے لئے ہیں وہ محبت اور اخلاص خدا تعالیٰ کی نسبت پیدا نہیں ہو سکتا جو اس صورت میں ہو سکتا ہے اگر وہ بعض ظاہری علامات کو روز دیکھتے اور ان کے اثر کو قبول کرتے ہیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جن قوموں میں ظاہری عبادات کی طرف سے بے رغبتی ہو رہی ہے ان میں دہریت اور خدا تعالیٰ سے بے پروائی کے خیالات بھی کثرت سے پھیلتے جاتے ہیں۔

پھر ایک فائدہ ظاہری عبادات کا یہ ہے کہ اس ذریعہ سے وہ تمام حصے انسان کے جو خدا تعالیٰ کے احسانوں کے نیچے دبے ہوئے ہیں اس کے احسانوں کا شکریہ ادا کرنے میں شامل ہو جاتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کا احسان جسم پر بھی ہے اور روح پر بھی ہے۔ پس جب عبادت میں جسم اور روح دونوں کو شامل کر لیا جاتا ہے تو وہ عبادت مکمل ہو جاتی ہے بغیر اس کے وہ ادھوری رہتی ہے اور کبھی محفوظ نہیں رہ سکتی کیونکہ قلبی عبادت مغز کی طرح ہے اور مغز کبھی بغیر چھلکے کے محفوظ نہیں رہتا۔ چھلکا خود مقصود نہیں ہوتا مگر مغز کے قائم رکھنے کے لئے وہ بہت ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص چھلکے کو لغو سمجھ کر پھینک دے تو وہ درحقیقت مغز کو بھی خراب کر دے گا۔

اس امر کو ثابت کر چکنے کے بعد کہ ظاہری عبادت بھی روحانیت کے قیام کے لئے ضروری ہے اب میں ان عبادات کا ذکر کرتا ہوں جو اسلام نے اپنے متبعین کے لئے مقرر فرمائی ہیں۔ سب سے بڑی عبادت تو نماز ہے جو گویا اسلامی عبادتوں کی جان ہے۔ پانچ وقت ایک مسلم کے لئے یہ فرض ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہو کر ان مقررہ قواعد کی رو سے جو اس کے لئے مقرر کئے گئے ہیں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے۔ پہلے وہ وضو کرتا ہے۔ یعنی ایک مقررہ طریق پر ہاتھ اور پاؤں

دھوتا ہے۔ اس میں علاوہ طہارت اور صفائی کے فائدہ کے جس پر اسلام نے خاص زور دیا ہے روحانی فائدہ بھی ہے اور وہ یہ کہ اس طرح ان تمام راستوں کی حفاظت ہو جاتی ہے جن کے ذریعہ سے خیالات پراگندہ ہوتے ہیں۔ یعنی حواس خمسہ کان' ناک' آنکھ' منہ اور قوت لامسہ کے قائم مقام ہاتھ اور پاؤں کی۔ جو لوگ روحانیت کا درک رکھتے ہیں وہ اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ بوجہ قلّتِ گنجائش مَیں تفصیل سے اس کو بیان نہیں کر سکتا۔ اسلام نے ان دونوں امور کی طرف خود اس کام کے نام سے اشارہ کیا ہے یعنی وضو کے لفظ سے جس کے معنی صفائی اور خوبصورتی کے ہیں۔ پس اس کا نام ہی دلالت کرتا ہے کہ اس فعل کے ذریعہ سے ظاہری صفائی بھی ہو جاتی ہے جو باطنی صفائی کے لئے نہایت ضروری ہے اور اس سے نماز بھی خوبصورت ہو جاتی ہے یعنی اس کے ذریعہ سے خیالات پراگندہ ہونے سے بچ جاتے ہیں اور نماز میں وہ حقیقت پیدا ہو جاتی ہے جس کے لئے وہ ادا کی جاتی ہے۔

وضو کرنے کے بعد انسان قبلہ رُخ ہو کر کھڑا ہو جاتا ہے جس سے اسے ابراہیمؑ کی قربانیوں اور ان کے نیک نتائج کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔ پھر وہ بعض مقررہ عبارات پڑھتا ہے جو تین روحانی امور پر مشتمل ہیں۔ اول خدا تعالیٰ کی تسبیح اور تحمید پر کہ اس سے خدا تعالیٰ کا صفاتی وجود اس کے سامنے آجاتا ہے اور اس کا دل جوشِ محبت اور غلبۂ اخلاص سے حرکت میں آجاتا ہے اور ایک خاص کشش اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسرے اس اقرار پر کہ بندہ اپنی تمام ترقیات میں اللہ تعالیٰ کی نصرت اور اس کی مدد کا محتاج ہے اس سے اس کے دل میں اپنی کمزوریوں پر اطلاع ملتی ہے اور وہ اپنی اصلاح اور اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرنے کی طرف مائل ہوتا ہے تیسرے دعا پر کہ جو گویا اصل جڑ ہے نماز کی۔ اس کے ذریعہ سے انسان اللہ تعالیٰ کے فضل کو جذب کرتا ہے اور اس کی محبت کی روح کو اپنی محبت کی روح پر ڈال کر اس سے وہ فیوض حاصل کرتا ہے جو روحانی طور پر بالکل اس مادۂ تناسل سے مشابہ ہیں جو ایک نر اور مادہ کے اجتماع سے پیدا ہوتا ہے اور ایک نئی مخلوق اس سے ظاہر ہوتی ہے غرض اسلامی نماز اپنے اندر ایسے کمالات رکھتی ہے کہ انسانی عقل اس کی خوبیوں کو دیکھ کر دنگ رہ جاتی ہے مگر شرط یہی ہے کہ ان شروط سے ادا کی جائے جو اسلام نے اس کے لئے مقرر کی ہیں ورنہ وہ کچھ اثر نہ کرے گی اور خواہ مخواہ نماز گزار نماز پر حرف گیری کرے گا۔

نماز کے ادا کرنے میں شریعتِ اسلام نے جو ظاہری علامات مقرر کی ہیں وہ بھی نہایت

پُر حکمت ہیں یعنی ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا' رکوع کرنا' ہاتھ چھوڑ کر کھڑا ہونا' سجدہ کرنا اور دو زانو بیٹھنا۔ یہ تمام حرکات وہ ہیں جو دنیا کے مختلف ممالک میں کمال تذلّل کے اظہار کے لئے اختیار کی جاتی ہیں۔ بعض ممالک میں لوگ انتہائی ادب کے اظہار کے لئے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں' بعض جگہ ہاتھ چھوڑ کر کھڑے ہوتے ہیں' مصر کے قدیم لوگ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر انتہائی ادب کا اظہار کیا کرتے تھے' ہندوستان میں سجدہ کا رواج تھا' یورپ میں گھٹنوں کے بل گرنے کا رواج ہے اسلام نے اپنی عبادت میں ان سب باتوں کو جمع کر لیا ہے۔

ان سب خوبیوں کے ساتھ یہ خوبی مل کر کہ نماز کے وقت جس کے لئے عام حکم یہی ہے کہ سب مسلمان مل کر نماز ادا کریں تا کہ اخوت کا جذبہ ترقی کرے۔ جس وقت بادشاہ اور ایک ادنیٰ مزدور پہلو بہ پہلو اکٹھے کھڑے ہوتے ہیں تو حقیقی طور پر دل محسوس کرتا ہے کہ یہ ایک حقیقت ہے بناوٹ نہیں۔ ایک ہستی کے سامنے سب لوگ کھڑے ہوئے ہیں جس کے حضور میں ایک بادشاہ بھی اپنی بادشاہت کا خیال بھول جاتا ہے اور ایک معمولی آدمی کے پہلو میں آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔

بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اسلام نے نماز کی تعلیم لالچ کے طور پر دی ہے کہ خدا تعالیٰ اس طرح ہمیں کچھ دے گا مگر یہ بالکل غلط ہے۔ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے اس خیال کو باطل کیا ہے اور بتایا ہے کہ اسلامی عبادات ایک دنیادار کی لالچی درخواستوں کی طرح نہیں ہیں بلکہ ان کی دو بڑی غرضیں ہیں ایک تو اللہ تعالیٰ کے احسانات کا شکریہ اور ان کا اقرار جو ایک صداقت کا اقرار ہے اور بغیر صداقت کے اقرار کے انسان انسان کہلانے کا مستحق ہی نہیں ہو سکتا۔ دوسرے روحانی ترقی کا حصول۔ چنانچہ ان دونوں باتوں کا ذکر قرآن کریم یوں فرماتا ہے۔ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ [۸۴]۔ اے لوگو! میری عبادت کرو تا کہ میں تم کو اپنی ملاقات کا شرف بخشوں اور میری نعمتوں کا شکریہ ادا کرو اور ناشکری نہ کرو یعنی عبادات کا ایک فائدہ تو روحانی ترقی ہے اور دوسرے احسانات باری تعالیٰ کا شکریہ۔ ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ [۸۵]۔ اسلامی نماز انسان کو بدیوں اور ناپسند باتوں سے بچاتی ہے۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم ﷺ سے بعض صحابہ نے پوچھا آپ اس قدر عبادت کیوں کرتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا اَفَلَا اَكُوْنُ عَبْدًا شَكُوْرًا [۸۶] کیا میں خدا تعالیٰ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔ قرآن میں ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ [۸۷]۔ نماز کے ذریعہ سے دل مطمئن ہوتے ہیں اور وہ عرفان ملتا

ہے جس سے شک کی حالت جاتی رہتی ہے پس نماز روحانی ترقیات کا ایک ذریعہ ہے جس طرح مادی دنیا میں مختلف کاموں کے حصول کے ذرائع مختلف ہوتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی نماز کی تعلیم زبردست حکمتوں پر مبنی ہے اور اس کے اندر اس قدر خوبیاں جمع ہیں کہ دوسرے مذاہب کی عبادات میں اس قدر خوبیاں نہیں ہیں۔ وہ تمام ضروریاتِ عبادت پر مشتمل ہے اس لئے ایک ہی ذریعہ حصولِ تقویٰ کا ہے اور جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ان کو ظاہری عبادت کی ضرورت نہیں ان کی غلطی ہے۔ بھلا یہ کونسی عقل تسلیم کر سکتی ہے کہ ابراہیم اپنے سارے تقویٰ کے ساتھ اور موسیٰ اپنی ساری قربانیوں کے ساتھ اور مسیح اپنی ساری فروتنی کے ساتھ اور محمد ﷺ باوجود اپنے جامع کمالات ہونے کے تو ظاہری عبادت کے محتاج رہے اور انہوں نے دل کی عبادت پر اکتفانہ کی لیکن بعض ایسے لوگ جو رات اور دن دنیوی شغلوں میں مشغول رہتے ہیں اور خدا کی یاد کبھی ان کے دلوں میں بھول کر بھی نہیں گھستی ان کے لئے کافی ہے کہ وہ دل میں خدا تعالیٰ کو یاد کر لیا کریں۔ درحقیقت یہ ایسا خیال ہے جو یا تو نفس کی سستی کی وجہ سے پیدا ہوا ہے اور نفس انسانی اس عذر کے ذریعہ سے اندرونی ملامت سے بچنا چاہتا ہے۔ یا پھر ایک بہانہ ہے جس کے ذریعہ سے بیرونی اعتراضوں کے مقابلہ میں اپنی بے دینی کو بعض لوگ چھپاتے ہیں۔

دوسری قسم عبادت کی ذکر ہے یہ عبادت اسلام نے اس حکمت کے ماتحت بتائی ہے کہ نماز جو خاص شکل اور خاص شرائط کے ساتھ ادا کی جاتی ہے اسے آدمی ہر وقت نہیں پڑھ سکتا۔ مگر جس طرح انسان کا جسم تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد پانی کا محتاج ہوتا ہے اور بغیر پانی کے اس کے اندر ایک قسم کی تھکان اور خشکی محسوس ہونے لگتی ہے اسی طرح اس کی روح بھی روحانی پانی کی محتاج ہے کیونکہ دنیوی کاموں اور مادی امور کے پیچھے سارا دن پڑا رہنے کے سبب سے روح اپنی غذا سے محروم ہو جاتی ہے پس اس کے لئے اسلام نے یہ بتایا ہے کہ چاہئے کہ وقتاً فوقتاً اللہ تعالیٰ کی صفات کو یاد کر کے انسان ان پر غور کر لیا کرے تاکہ اسے کُلّی طور پر دنیا میں ہی انہماک نہ رہے بلکہ خدا تعالیٰ بھی اس کو یاد آتا رہے اور قلب میں اس کی محبت کی چنگاری بھی سُلگتی رہے۔ اس ذکر کے وقت فوائد بھی وہی ہیں جو اوپر بیان ہو چکے ہیں۔

تیسری قسم کی عبادت جس کا اسلام نے حکم دیا ہے وہ روزہ ہے۔ روزوں کا حکم بھی قریباً سب مذاہب میں مشترک ہے مگر جس صورت اور جس شکل میں اسلام نے اس کو پیش کیا ہے اور محفوظ

رکھا ہے وہ باقی مذاہب سے نرالی ہے۔ اسلام میں روزوں کی یہ صورت ہے کہ ہر بالغ عاقل کو برابر ایک مہینہ کے روزے رکھنے کا حکم ہے سوائے اس صورت کے کہ کوئی شخص بیمار ہو یا اسے بیماری کا یقین ہو یا سفر پر ہو یا بالکل بوڑھا اور کمزور ہو گیا ہو۔ ایسے لوگ جو بیمار ہوں یا سفر پر ہوں ان کے لئے حکم ہے کہ وہ دوسرے اوقات پر روزہ رکھیں اور جو بالکل معذور ہو گئے ہوں ان کے لئے کوئی روزہ نہیں۔ روزہ کی یہ صورت ہے کہ پو پھٹنے سے لے کر سورج کے غروب تک کوئی چیز کھائے نہ پئے نہ کم نہ زیادہ اور نہ مخصوص تعلقات کی طرف توجہ کرے۔ پو پھٹنے سے پہلے چاہئے کہ کھانا کھالے اور پانی پی لے تا جسم پر غیر معمولی بوجھ نہ پڑے صرف شام ہی کو کھانا کھا کر متواتر روزے رکھنے کو شریعت نے ناپسند کیا ہے۔

روزہ کی حکمتیں قرآن کریم نے یہ بتائی ہیں۔ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ [۸۸]۔ تاکہ تم اللہ تعالیٰ کی بڑائی کا اظہار کرو اس وجہ سے کہ اس نے تم کو سچا راستہ دکھایا ہے اور تاکہ تم میں شکر کرنے کا مادہ پیدا ہو یعنی ایک فائدہ تو یہ مدنظر ہے کہ تم ان دنوں میں بوجہ سارا دن کھانے پینے کے شغلوں سے فارغ رہنے کے اور مادیت کی طرف سے توجہ کے ہٹ جانے کے اللہ تعالیٰ کا ذکر زیادہ کرو گے۔ دوسرے یہ فائدہ مدنظر ہے کہ اس طرح بھوک کی تکلیف محسوس کر کے تمہارے دل میں شکر گذاری کا مادہ پیدا ہو گا۔ کیونکہ انسان کا قاعدہ ہے کہ جب تک اس کے پاس کوئی نعمت ہوتی ہے اس کی اسے قدر نہیں ہوتی جب چھن جائے تو اس کی قدر محسوس ہوتی ہے۔ بہت سے آنکھوں والے آدمیوں کے کبھی ساری عمر ذہن میں نہیں آتا کہ آنکھیں بھی کوئی بڑی نعمت ہیں لیکن جب کسی کی آنکھیں جاتی رہتی ہیں تب اسے معلوم ہوتا ہے کہ آنکھیں اللہ تعالیٰ کی کیسی نعمت ہیں۔ اسی طرح روزہ میں جب انسان بھوکا رہتا ہے اور اسے بھوک کی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ تو تب اسے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے اسے کیسا آرام بخشا ہے اور یہ کہ اسے اس آرام کی زندگی کو نیک اور مفید کاموں میں صرف کرنا چاہئے نہ کہ لہو لعب میں۔

پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ روزہ کی حکمت یہ ہے کہ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ [۸۹]۔ تاکہ تم کو تقویٰ حاصل ہو یہ تَتَّقُوْنَ کا لفظ قرآن کریم میں تین معنوں میں استعمال ہوتا ہے ایک دکھوں سے بچنے کے معنے میں، دوسرے گناہ سے بچنے کے معنوں میں اور تیسرے روحانیت کے اعلیٰ مدارج کے حاصل کرنے کے متعلق۔ پس اس لفظ کے ذریعہ سے تین حکمتیں اللہ تعالیٰ نے روزہ کی بیان

فرمائی ہیں- پہلی حکمت یہ کہ انسان روزہ کے ذریعہ دکھوں سے بچ جاتا ہے بظاہر یہ امر قابل تعجب معلوم ہوتا ہے کہ روزے سے انسان دکھ سے بچے کیونکہ روزہ سے تو انسان اور بھی تکلیف پاتا ہے مگر جب غور سے دیکھا جائے تو روزہ در حقیقت انسان کو دو سبق دیتا ہے جس سے اس کی قومی حفاظت ہوتی ہے اول سبق تو یہ ہے کہ مالدار لوگ جو سال بھر عمدہ سے عمدہ غذائیں کھاتے رہتے ہیں ان کو اپنے غریب بھائیوں کی تکلیفوں کا جو فاقوں سے دن گذارتے ہیں احساس بھی نہیں ہوتا نہ انہوں نے بھوک کی تکلیف کبھی دیکھی ہوتی ہے نہ بھوک کی تکلیف کا وہ اندازہ لگا سکتے ہیں لیکن اسلام کے حکم کے ماتحت بڑے سے بڑے امراء کو روزے رکھنے پڑتے ہیں اور تب انکو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ بھوک کی تکلیف کیسی ہوتی ہے اور اپنے غریب بھائیوں کی حالت کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے اور ان کی ہمدردی کا جوش دلوں میں پیدا ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ قوم کی ترقی اور حفاظت ہوتا ہے اور قوم کی حفاظت در حقیقت فرد کی حفاظت ہی ہوتی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اسلام نہیں چاہتا کہ لوگ ست اور غافل ہوں اور تکلیف برداشت کرنے کی ان میں عادت نہ ہو بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ ضرورت کے وقت وہ ہر قسم کی مشقّت برداشت کرنے کی قابلیت رکھتے ہوں- اور روزے ہر سال مسلمانوں کے اندر یہ مادہ پیدا کر جاتے ہیں اور جو لوگ اسلام کے اس حکم پر عمل کرنے والے ہوں وہ کبھی عیاشی اور غفلت میں مبتلاء ہو کر ہلاک نہیں ہو سکتے۔

دوسرا امر کہ روزوں سے انسان گناہ سے بچتا ہے اس طرح متحقق ہوتا ہے کہ گناہ در حقیقت مادی لذات کی طرف جھکنے کا نام ہے اور یہ قاعدہ دیکھا گیا ہے کہ جب انسان کسی کام کا عادی ہو جائے تو وہ اس کو چھوڑ نہیں سکتا۔ مگر جب اس میں یہ طاقت ہو کہ اپنی مرضی پر اس کو چھوڑ بھی دے تو پھر وہ خواہش اس پر غلبہ نہیں مارتی۔ جب کوئی شخص روزوں میں تمام ان لذتوں کو جو اس کو بعض اوقات گناہ کی طرف کھینچتی ہیں خدا کے لئے چھوڑ دیتا ہے اور ایک مہینہ تک برابر اپنے نفس پر قابو پانے کی عادت ڈالتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ ان لالچوں کا مقابلہ آسانی سے کر سکتا ہے جو اسے گناہ کی طرف کھینچتی ہیں۔

تقویٰ کے قیام میں روزوں سے اس طرح مدد ملتی ہے کہ ان دنوں میں چونکہ رات کو کھانا کھانے کے لئے اٹھنا پڑتا ہے زیادہ عبادت اور دعاؤں کا موقع ملتا ہے اور دوسرے جب بندہ خدا تعالیٰ کے لئے اپنے آرام کو چھوڑتا ہے تو خدا تعالیٰ بھی اس کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور اس کی

روح کو طاقت بخشتا ہے۔

چوتھی عبادت حج ہے اس عبادت کی بھی اغراض روزے اور نماز سے ملتی ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے لئے اپنا وطن چھوڑنے کی عادت ڈالنی اور اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے الگ ہونے کا خوگر بنانا۔ علاوہ ازیں قرآن کریم نے خصوصاً یہ وجہ بتائی ہے کہ اس عبادت سے شعائر اللہ کی عظمت ہوتی ہے اور ان کی یاد تازہ ہوتی رہتی ہے۔ حج دراصل اس واقعہ کی یاد تازہ کرتا ہے جو ابراہیم علیہ السلام کو اپنے بیٹے اسماعیل کو جنگل میں چھوڑ دینے کے سبب سے پیش آیا۔ اور دوسرے خانہ کعبہ کی نسبت قرآن کریم فرماتا ہے کہ وہ سب سے پہلا گھر ہے جو خدائے واحد کی عبادت کے لئے بنایا گیا۔[۹۰] پس حج میں جاکر انسان کے سامنے وہ نقشہ کھنچ جاتا ہے کہ کس طرح خدا کے لئے قربانی کرنے والے بچائے جاتے ہیں اور ان کو اللہ تعالیٰ عزت دیتا ہے اور حج کرنے والے کے دل میں خدا کا جلال اور اس کی ذات کا یقین بڑھتا ہے دوسرے وہ اپنے آپ کو اس گھر میں دیکھ کر جو ابتدائے دنیا سے خدا تعالیٰ کی یاد کے لئے بنایا گیا ہے ایک عجیب روحانی تعلق ان لوگوں سے پاتا ہے جو ہزاروں لاکھوں سال پہلے اس روحانی سِلک میں پروئے چلے آتے رہے ہیں جس میں یہ شخص پرویا ہوا ہے یعنی خدا تعالیٰ کی یاد اور اس کی محبت کا رشتہ جو سب کو باندھے ہوئے ہے خواہ پرانے ہوں خواہ نئے۔

علاوہ ازیں حج میں سیاسی فائدہ بھی ہے کہ ذی اثر لوگوں میں سے ایک جماعت سال میں جمع ہو کر تمام عالم کے مسلمانوں کی حالت سے واقف ہوتی رہتی ہے اور اخوت اور محبت ترقی کرتی ہے اور ایک دوسرے کی مشکلات سے آگاہ ہونے اور آپس کے تعاون اور ایک دوسرے کی خوبیوں کے اخذ کرنے کا موقع ملتا ہے گو افسوس ہے کہ اس وقت اس غرض سے فائدہ نہیں اٹھایا جاتا۔

پانچویں عبادت قربانی ہے۔ بہت لوگ اسلامی قربانی کی حقیقت کو نہیں سمجھتے اور خیال کرتے ہیں کہ قربانی کا حکم اسلام نے اس لئے دیا ہے تاکہ قربانی' قربانی کرنے والے کا گناہ اٹھالے لیکن یہ بات درست نہیں۔ اسلام ہرگز یہ تعلیم نہیں دیتا۔ قربانی قرب سے نکلی ہے قربانی درحقیقت ایک نہایت لطیف عملی زبان ہے جس کے نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگوں کو دھوکا لگا ہے۔ یہ بات تو ظاہر ہی ہے کہ دنیا میں کثرت سے تصویری اور عملی زبانوں کا رواج ہے اور باوجود زبانوں کے ترقی کر جانے اور علم و ادب کے کمال کو پہنچ جانے کے یہ قدیم طریق اظہارِ خیالات کا اب تک دنیا

میں قائم ہے اور اس کے اثر کو لوگ قبول کرتے ہیں۔ تمدن کے تمام شعبوں میں اس کا اثر پایا جاتا ہے مثلاً جب دو آدمی مصافحہ کرتے ہیں تو کوئی ان کو نہیں کہتا کہ تم لغو فعل کر رہے ہو اور نہ کوئی اتنا غور کرتا ہے کہ ہاتھ کے ملانے سے دونوں کو کیا خوشی ہوئی ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ یہ ہاتھوں کا ملانا ایک تصویری زبان ہے جو قدیم رسوم کے اثر کے نیچے اب تک چلی جاتی ہے اور اب گو اس کی وجہ لوگوں کو معلوم نہیں مگر اس کا رواج چلا جا رہا ہے اور دنیا کے بہترین اعمال میں سے ایک عمل ہے کیونکہ محبتوں کے قیام اور تعلقات کے اظہار میں مُمِدّ ہے۔ مگر پہلے پہل جب اس کا رواج ہوا تو اس طرح سے ہوا تھا کہ دو آدمی جب آپس میں اس امر کا معاہدہ کرتے تھے کہ ایک دوسرے کی مدد کرے گا اور حسب ضرورت اس کی طرف سے ہو کر لڑے گا تو چونکہ دفاع اور حملہ دونوں ہاتھوں کے ذریعہ سے ہوتے تھے اس لئے وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑتے تھے کہ اب جس پر تیرا ہاتھ اٹھے گا میرا اٹھے گا۔ اب ہم دونوں کے ہاتھ ایک ہو گئے ہیں حملہ اور بچاؤ دونوں صورتوں میں یہ جمع رہیں گے دیکھو شروع میں کیسے خطرناک معاہدہ کے لئے یہ رسم جاری کی گئی مگر اب عام محبت کے اظہار کے لئے اس کا استعمال ہوتا ہے مگر پھر بھی ایک حد تک دنیا کو اس سے فائدہ پہنچ رہا ہے اور اس کو چھوڑنے کے لئے لوگ تیار نہیں۔

اسی طرح بوسہ کی رسم کی اصل وجہ بھی تصویری زبان ہے بوسہ درحقیقت چوسنے کی حرکت کے مشابہ ہے دراصل اس امر کے ذریعہ سے فطرت حیوانی (میں فطرت حیوانی اس لئے کہتا ہوں کہ جانوروں میں بھی اس کا وجود پایا جاتا ہے) اس امر کا اظہار کرتی ہے کہ میں اس شخص کے وجود کو جس کو میں بوسہ دیتی ہوں اپنے سے جدا رہنے دینا نہیں چاہتی بلکہ چاہتی ہوں کہ یہ میرے جسم کا حصہ بن جائے۔

غرض اشارات کی زبان ہمارے روز مرہ کے کاموں میں استعمال ہو رہی ہے اور اس سے عظیم الشان فوائد حاصل کئے جا رہے ہیں انہی میں قربانی ہے۔ اگر غور کر کے دیکھا جائے تو جان کا قربان کرنا کوئی معمولی امر نہیں ہے اور طبیعت پر ایک گہرا اثر ڈالتا ہے سوائے ان لوگوں کے جو ذبح کرنے کے عادی ہو چکے ہیں دوسرے شخص کی طبیعت پر ضرور ذبح کرنے کا اثر ہوتا ہے اور اس وقت اس کے خیالات میں ایک وسیع ہیجان پیدا ہوتا ہے حتی کہ اسی کے اثر کے ماتحت بعض قوموں نے قربانی کو ظلم قرار دیا ہے۔ یہ ان کا فعل تو کمزوری کی علامت ہے مگر اس میں شک نہیں کہ قربانی کا اثر طبیعت پر ضرور ہوتا ہے اسی اثر کو پیدا کرنے کے لئے قربانی کو عبادت میں شامل کیا

گیا ہے اور اس سے یہ غرض ہوتی ہے کہ قربانی کرنے والا اس امر کا اقرار گویا قربانی کے ذریعہ سے اشارہ کی زبان میں کرتا ہے کہ جس طرح یہ جانور جو مجھ سے ادنیٰ ہے میرے لئے قربان ہوا ہے اسی طرح میں اقرار کرتا ہوں کہ اگر مجھ سے اعلیٰ چیزوں کے لئے مجھے جان دینی پڑے گی تو میں خوشی سے جان دوں گا۔

اب غور کرو کہ جو شخص قربانی کی اس حکمت کو سمجھ کر قربانی کرتا ہے اس کی طبیعت پر اس کا کس قدر گہرا اثر پڑے گا اور کس طرح وہ اپنے فرض کو یاد رکھے گا جو اس پر اس کے پیدا کرنے والے کی طرف سے عائد ہے؟ اس ذبح کی یاد ہمیشہ اس کے دل میں تازہ رہے گی اور اس کا دل اسے کہتا رہے گا کہ دیکھ تو نے اپنے ہاتھوں سے بکرے کو ذبح کر کے اس امر کا اقرار کیا تھا کہ ادنیٰ چیز اعلیٰ کے لئے قربان کی جاتی ہے پس تجھے بھی اس قربانی کے لئے تیار رہنا چاہئے جو صداقتوں کے قیام یا بنی نوع انسان کی تکالیف کو دور کرنے کے لئے تجھے کرنی پڑے۔ اسی مضمون کی طرف قرآن کریم اشارہ کرتا ہے جب وہ فرماتا ہے لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ [۹۱]۔ اللہ تعالیٰ کو نہ تمہاری قربانیوں کا گوشت پہنچتا ہے نہ خون لیکن اللہ تعالیٰ کو وہ ارادہ جو خشیت اللہ کو مدنظر رکھ کر تم نے کیا تھا وہ پہنچتا ہے یعنی اگر اس غرض کو پورا کرو گے جس کے لئے قربانی کی ہے تو قربانی کا فائدہ ہوگا ورنہ صرف گوشت کھانے اور خون بہانے کا کام تم سے ہوا ہے اور کوئی حقیقی فائدہ تم کو نہ ہوگا۔

اس بیان سے آپ لوگوں پر اچھی طرح واضح ہوگیا ہوگا کہ اسلام کے نزدیک قربانیوں کی ہرگز وہ وجہ نہیں ہے جو دوسری قوموں میں ہے۔ اسلام اس مقصد کو محفوظ رکھ رہا ہے جس کی وجہ سے اس اشاروں کی زبان کو جاری کیا گیا تھا مگر دوسرے مذاہب اصل زبان کو بھول کر قربانی کے اور ہی مقصد تجویز کر رہے ہیں۔

مقصد اول کا سوال چہارم

مقصد اول کا سوال چہارم یہ ہے کہ کیا خدا بندہ کو مل سکتا ہے؟ اور کیا کوئی مذہب خدا سے ملانے کا دعویدار ہے اور خدا تعالیٰ سے بندہ کو ملا دیتا ہے؟

یہ سوال جیسا کہ ظاہر ہے سب سے اہم ہے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو مذہب کا فائدہ اصل میں اسی سوال کے ساتھ وابستہ ہے۔ جو شخص بھی صحیفۂ فطرت کی صحیح راہنمائی سے گریز نہیں کرتا اور اس کی ہدایت سے آنکھیں بند نہیں کرلیتا اپنے دل میں محسوس کرتا ہوگا کہ اگر مذہب کی کوئی غرض ہے تو یہی کہ خدا سے ملنے کا راستہ بتائے بلکہ خدا سے ملا دے۔ باقی سب سوال اس سوال کے مبادی یا ضمنی سوال ہیں۔

اگر کوئی مذہب خدا تعالیٰ کی صفات بھی بیان کرے' اس کی توحید پر بھی خوب زور دے' خدا سے اخلاص کا تعلق رکھنے کے لئے بھی اپنے پیروؤں کو تاکید کرے' طریق عبادت بھی ان کو بتائے لیکن وہ اس امر پر آکر بالکل خاموش ہو جائے کہ کیا وہ خدا کو ملا بھی سکتا ہے اور اسی دنیا میں ملا سکتا ہے تو اس کی سب پہلی تقریریں محض لفّاظی اور روقت کا ضیاع اور بنی نوع انسان سے ایک ہنسی اور تمسخر ہونگی۔

اس مذہب کی مثال بالکل اس شخص کی ہوگی جو نقاروں اور بگل کے ساتھ اعلان کرائے کہ ایک عظیم الشان دریافت ہوئی ہے لوگ جمع ہو جائیں تاکہ ان کو وہ بات سنائی جائے اور چاہئے کہ کوئی پیچھے نہ رہے کیونکہ وہ ایسی اہم دریافت ہے کہ ویسی دریافت کبھی نہ ہوئی تھی اور وہ ایسی دریافت ہے کہ سب انسانوں کے لئے اس کا سننا ضروری ہے اور وہ سب کے لئے مفید ہے اور اس کا فائدہ اس قدر زیادہ ہے کہ آج تک کسی چیز کا اس قدر فائدہ نہیں ہوا اور اس دریافت سے فائدہ نہ اٹھانا شقاوت اور بدبختی ہے۔ جب لوگ اس شخص کے اعلان پر دور اور نزدیک سے جمع ہو جائیں اور اشتیاق کی وجہ سے اپنے کام چھوڑ چھوڑ کر چلے آویں تو سب لوگوں کے جمع ہونے پر وہ شخص تقریر کرے کہ ایک نیا ملک دریافت ہوا جس میں اس قدر وسعت ہے کہ سب لوگ وہاں جاکر آرام سے بس سکتے ہیں۔ وہ دور بھی نہیں ہر ایک کے دروازے کے نزدیک ہے اس میں جگہ بہ جگہ چشمے پھوٹ رہے ہیں اور پھول اور پھل اور میوے کثرت سے ہیں اور ہر ایک چیز کی بہتات ہے حتّٰی کہ جو لوگ بھی اس میں بسیں وہ اپنے حصہ کی فراوانی کے سبب سے ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے کو فضول سمجھیں گے کیونکہ وہاں ہر ایک کے پاس بہت کچھ ہوگا۔ اور میں کیا بتاؤں کہ وہاں کیسا آرام ہے اس کا چمکتا ہوا سورج جو اپنے نور سے سطح زمین کو منور کرتا ہے اور اس کا گھنا سایہ جو اس کی تمازت سے آرام دیتا ہے ایسے دلکش ہیں کہ اس سرزمین میں جاکر پھر کسی کا نکلنے کو دل نہیں چاہتا۔ جب لوگوں کا شوق تیز ہو جائے اور ان کی امیدیں وسیع ہو جائیں

اور وہ کہیں کہ اچھا وہ ملک کہاں ہے کہ ہم وہاں جائیں اور اس کے میوے چکھیں اور اس کا پانی پئیں؟ تو وہ شخص کہے کہ ملک تو وہ ایسا ہی ہے مگر افسوس ہے کہ مجھے معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے اور کس طرح وہاں جاتے ہیں۔ میں نے اپنے باپ دادا کی لائبریری میں ایک کتاب دیکھی تھی اس میں دیکھا تھا کہ ایک نیا ملک ہے پس میں نے نہ چاہا کہ آپ اس عظیم الشان دریافت کے علم سے ناواقف رہیں۔ آپ لوگ قیاس کرسکتے ہیں کہ اس شخص کے ساتھ سامعین کیا سلوک کریں گے؟ مگر تعجب ہے کہ مذہب کے بارے میں لوگوں سے اسی قسم کا تمسخر کیا جاتا ہے اور کوئی نہیں پوچھتا کہ ایسا کیوں کیا جاتا ہے؟ خدا تعالیٰ کی طرف بلایا جاتا ہے مگر جب کوئی آئے تو اس کو کچھ بھی نہیں ملتا۔ وہ جہاں تھا وہیں کا وہیں رہتا ہے صرف خلش اور حسرت کی زیادتی ہو جاتی ہے۔

کسی نے آج تک نہ سنا ہوگا کہ بِلا دیکھے کسی خیالی صنم سے کسی کو عشق ہو جائے۔ عشق تو حسن دیکھ کر ہوتا ہے نہ کہ محض حسن کا ذکر سن کر تو پھر اس قدر محبت جس کی امید کی جاتی ہے کہ بندہ خدا سے کرے بِلا خدا تعالیٰ کو دیکھنے کے کس طرح پیدا ہو سکتی ہے؟ محبت تو دل کے گداز ہو جانے کا نام ہے مگر جب آگ ہی نہ ہو تو کوئی چیز گداز کس طرح ہوگی؟ پہلے ضروری ہے کہ ایک سورج کی طرح چمکتا ہوا چہرہ ہو تا وہ اپنی روشنی کی گرمی سے دلوں کو گداز کرے تب اس کے نتیجہ میں محبت بھی پیدا ہوگی۔ پس کوئی مذہب سچا عشق خدا سے نہیں پیدا کرا سکتا جب تک کہ وہ خدا کی ملاقات کا راستہ نہیں کھولتا۔

زمانہ کی حالت کو دیکھ لو۔ آج کتنے لوگ خدا تعالیٰ کی محبت اور اس کی الفت کو دل میں رکھتے ہیں یقیناً دس فیصدی بھی نہیں اور یہ دس فیصدی بھی وہ ہیں جو خیال کرتے ہیں کہ خدا سے محبت ہے مگر حقیقتاً وہ قدیم رسوم اور باپ دادوں کی بنائی ہوئی راہ پر چل رہے ہیں۔ چاروں طرف دنیا میں تاریکی اور ظلمت ہی نظر آتی ہے خدا کے لئے قربانی کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہے دین کے نام پر جو قربانیاں ہیں ان کے پیچھے بھی قوم پرستی کا جذبہ منڈلاتا نظر آتا ہے۔ ابھی اگزیبشن (EXHIBITION) ہو رہی ہے کس قدر دور دور سے لوگ اسے دیکھنے کے لئے آرہے ہیں مگر خدا کو دیکھنے کے لئے کوئی نہیں گھر سے نکلتا اس لئے کہ لوگ جانتے ہیں کہ وہ نہ گھر میں نظر آتا ہے نہ باہر۔ پس جب لوگوں کو کچھ نظر ہی نہیں آتا تو وہ مجبور ہیں۔ دین کا معاملہ ایسا ہے کہ اس کو آخرت پر نہیں چھوڑا جائے گا کیونکہ انسان دو دفعہ دنیا میں نہیں آتا اور یقیناً نہیں پھر اگر اس دنیا میں انسان کو کچھ نظر نہ آئے اور اگلے جہان میں اس کو معلوم ہو کہ وہ جس راستہ پر چل رہا تھا غلط

تھا تو وہ کیا کرے؟ اور اگر بالفرض یہی بات ہو کہ نہ خدا ہے نہ کوئی زندگی مابعد الموت تو بھی اس شخص کی زندگی ایک وہم کی نذر ہوئی۔

اس امر کا دعویٰ تو ہر مذہب کو ہے کہ بعد الموت خدا اس کے ذریعہ سے مل جائے گا لیکن ایسے بڑے اہم معاملہ کو کوئی شخص حسن ظنی پر کس طرح چھوڑ سکتا ہے؟ جو کچھ لوگوں کو بتایا جاتا ہے وہ تو صرف یہ ہے کہ تم کو چاہئے کہ یوں کرو اور یوں کرو لیکن اصل میں تو اس امر کی ضرورت ہے کہ ہمارے ان افعال کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کیا کرے گا؟ ہمارے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی دروازہ پر دستک دے مگر سوال یہ ہے کہ جیسا کہ اس مقدس وجود نے جس نے آج سے انیس سو سال پہلے دنیا کو اپنی کرنوں سے منور کر دیا تھا اشارہ کیا ہے کہ وہ دروازہ ہمارے لئے کھولا بھی جائے گا؟ اگر وہ دروازہ کھولا نہیں جائے گا اور اگر ہماری دستک اس قسم کا اشارہ نہیں رکھتی جس پر دروازہ کھولا جاتا ہے تو بتانے والے نے کیا بتایا؟ یونہی شور تو ہم خود بھی بغیر کسی کی دستگیری کے مچا سکتے تھے اس نے تو صرف یہ پوری ہونے والی امیدیں ہمارے دلوں میں پیدا کر کے ہمیں اور بھی تڑپا دیا۔ اس کے بتانے کا فائدہ تو تب تھا کہ جب وہ ہمیں وہ اشارہ سکھاتا جس پر دروازہ کھل جاتا اور اسی دنیا میں کھل جاتا تاکہ پیشتر اس کے کہ ہمارے لئے واپس لوٹنے کا راستہ نہ رہے ہمیں یہ تسلی ہو جاتی کہ ہم صحیح راستہ پر چل رہے ہیں۔

اے بہنو اور بھائیو! خواہ تم کسی ملک کے ہو میں آپ کو بشارت دیتا ہوں کہ اسلام یا دوسرے لفظوں میں احمدیت اس امر کا دعویٰ کرتی ہے کہ وہ اس اشارہ کو سکھاتی ہے جس سے دروازہ کھولا جاتا ہے۔ نہیں نہیں وہ اس سے بڑھ کر اس امر کی مدعی ہے کہ وہ پہلے بھی کئی لوگوں کو اس کام میں پورا اتار چکی ہے۔ کئی ہیں جن پر خدا تعالیٰ نے احمدیت کے ذریعہ سے دروازہ کھولا ہے اور وہ اسی زندگی میں اُن کو مل گیا ہے۔ پس اگر آپ لوگ اس کی ملاقات کے متلاشی ہیں تو اس کی طرف آئیں کہ وہ آپ کی اس خواہش کو پورا کرے گی اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰہُ۔

پیشتر اس کے کہ میں اس امر کی تشریح کروں کہ احمدیت کس طرح خدا تعالیٰ سے ملاتی ہے میں یہ بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ خدا سے ملانے سے کیا مراد ہے؟

سو یاد رکھنا چاہئے کہ خدا سے ملنے سے مراد یہ نہیں ہے کہ خدا تعالیٰ کوئی مادی وجود ہے جس کو انسان اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے بلکہ اس سے مراد یہ امر ہے کہ انسان خدا تعالیٰ کو روحانی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے مگر جب میں کہتا ہوں کہ روحانی آنکھوں سے دیکھتا ہے تو اس سے بھی

میری مراد یہ نہیں کہ وہ خیال کی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور سمجھ لیتا ہے کہ وہ دیکھ رہا ہے جیسا کہ وہ لوگ جو اپنے دماغ کو خاص قسم کی مشقوں میں لگا دیتے ہیں کبھی کبھی خیال کر لیتے ہیں بلکہ میری مراد حقیقتاً دیکھنے سے ہے جس طرح کہ ہم سورج کو دیکھتے ہیں یا چاند کو دیکھتے ہیں یا اور چیزوں کو دیکھتے ہیں حتّٰی کہ ہمیں ان کے وجود میں کوئی شک نہیں رہتا۔ اگر دس کروڑ آدمی بھی ہمارے پاس آکر کہے کہ سورج حقیقتاً ہمارے سامنے نہیں آتا بلکہ ہمیں خیال ہو جاتا ہے کہ سورج سامنے ہے تو ہم یہ سمجھیں گے کہ یہ دس کروڑ آدمی پاگل ہو گیا ہے مگر یہ کبھی خیال نہیں کریں گے کہ ہم نے سورج کو نہیں دیکھا اس لئے کہ ہم سورج کو ان طریقوں سے دیکھ چکے ہیں کہ جن طریقوں سے دیکھنے کے بعد شک پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔

خیال اور واقع میں یہ فرق ہوتا ہے کہ خیال میں عام طور پر صرف ایک حِسّ شامل ہوتی ہے اور علم میں کئی حِسّیں شامل ہوتی ہیں۔ مثلاً جب کوئی شخص یہ خیال کرتا ہے کہ فلاں جگہ ایک شخص کھڑا ہے لیکن وہ فی الواقع کھڑا نہیں تو اگر وہ اس شخص کو پکڑنے کے لئے ہاتھ مارے گا تو اس پر ظاہر ہو جائے گا کہ اس کی غلطی تھی کیونکہ اس کے ہاتھ کو کچھ محسوس نہ ہو گا۔ مگر جب وہاں فی الواقع کوئی شخص کھڑا ہو گا تو قوت لامسہ بینائی کی طاقت کی تائید کرے گی اور اس کو ہاتھ مارنے سے کوئی ٹھوس چیز محسوس بھی ہو گی۔ گو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ واہمہ کئی حِسّوں پر بھی قبضہ کر لیتا ہے مگر یہ حالت جنون کی ہوتی ہے جس کا نقص خود ہی ظاہر ہو جاتا ہے۔

مگر اس دھوکے کی اصلاح کا بھی ایک راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر ایک شخص کو وہم ہو تو وہ اپنے وہم کے ماتحت خواہ خود کچھ بھی دیکھے مگر وہ دوسروں کو وہ چیز نہیں دکھا سکتا لیکن جب حقیقت ہوتی ہے تو وہ دوسروں کو بھی اس کا نشان دکھا سکتا ہے پس جب میں کہتا ہوں کہ اسلام یعنی احمدیت خدا تعالیٰ سے انسان کو ملا دیتی ہے تو اس سے مراد میری قوت واہمہ کا عمل نہیں کہ اس کے ذریعہ سے تو آج بھی ہر ایک مذہب کے پیرو خدا سے مل رہے ہیں بلکہ میری مراد ایسی ہی یقینی ملاقات سے ہے جیسی کہ یقینی چیزیں ہوا کرتی ہیں یعنی کئی حواس اس کی تصدیق کرتے ہیں اور اس کے اثر لوگوں کو بھی دکھائے جا سکتے ہیں۔ مگر یہ بات ضرور ہے کہ رؤیت عرفان کی ہوتی ہے نہ کہ جسمانی آنکھ کی۔

اس امر کے ثبوت میں کہ اسلام سوال زیر بحث کا جواب اثبات میں دیتا ہے اور خدا تعالیٰ سے ملا دینے کا دعویٰ کرتا ہے مفصّلہ ذیل آیات پیش کی جا سکتی ہیں۔ قرآن کریم کے شروع میں اللہ

تعالیٰ فرماتا ہے ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ [۹۲] یہ کتاب وہ موعود کتاب ہے جس کا وعدہ پہلی کتب میں دیا گیا تھا اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں چنانچہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ کتاب متقیوں کو راستہ دکھاتی ہے اور ان کے مقام سے ان کو اوپر لے جاتی ہے۔ مطلب یہ کہ باقی مذاہب تو صرف متقی بنانے کا دعویٰ کرتے ہیں یعنی کہتے ہیں کہ جو شخص ہمارے طریق پر چلے گا وہ متقی ہو جائے گا لیکن اسلام صرف متقی بنانے کا دعویٰ نہیں کرتا بلکہ متقی سے اوپر لے جاتا ہے۔ وہ صرف انسان کو وہی کام نہیں بتاتا جو اس کے ذمہ ہیں بلکہ جب وہ اسلام کے احکام پر عمل کرکے اپنی طرف سے تمام کوششیں کر چکتا ہے تو پھر اس کو اسلام اوپر لے جاتا ہے یعنی اللہ کی طرف سے بھی اس کی طرف توجہ ہوتی ہے اور محبت اور کوشش صرف ایک طرف سے نہیں رہتی بلکہ دونوں طرف سے اس کا ظہور ہونے لگتا ہے۔

اسی طرح ایک جگہ فرماتا ہے۔ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا۔ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا۔ [۹۳] جو لوگ اللہ اور اس کے اس رسول یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کی کامل فرمانبرداری کریں گے اللہ تعالیٰ ان کو چار مدارج عطا کرے گا جن کو وہ علیٰ قدر مراتب حاصل کریں گے۔ جو سب سے اعلیٰ درجہ کے فرمانبردار ہوں گے ان کو نبیوں کا درجہ عطا کرے گا اور جو ان سے کم ہوں گے ان کو صدیقوں کا یعنی مقرب لوگوں کا درجہ دے گا اور جو ان سے کم ہونگے ان کو شہداء یعنی ان لوگوں کا کہ جنکی آنکھوں سے حجاب تو اٹھ گیا ہے مگر وہ اس مقام پر نہیں پہنچے کہ اَخصّ دوستوں میں سے کہلا سکیں اور جو ان سے بھی کم ہونگے ان کو نیکوں کا یعنی وہ اپنے اعمال کو تو درست کر رہے ہیں مگر ابھی ان پر خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی کھڑکی نہیں کھولی گئی۔ پھر فرمایا کہ یہ لوگ بطور مصاحبت کے اچھے ہیں۔ اگر انسان انکی صحبت حاصل کرے تو وہ بھی اصلاح پا سکتا ہے یہ مدارج جن کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ دیا گیا ہے خاص فضل کے طور پر ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو خوب جانتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ اس امر سے آگاہ ہے کہ اسی کی پیدا کی ہوئی غیر محدود ترقی کی خواہش انسان کے اندر موجود ہے اور محبوب سے ملنے کی تڑپ ان کے اندر ودیعت کی گئی ہے پس اس خواہش کو پورا کرنا اللہ تعالیٰ کے لئے ضروری تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے فضل کا سامان مہیا کر دیا ہے اب جو بندہ چاہے اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

ایک اور جگہ پر فرماتا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا

بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ۔ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔ [۹۴]۔ ضرور وہ لوگ کہ انہیں ہم سے ملنے کی خواہش نہیں ہے اور مادی اسباب اور مادی ترقیات پر راضی ہو گئے ہیں اور اسی پر مطمئن ہیں دنیا مل جائے تو سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہمیں ملنا تھا مل چکا اب ہمیں کسی اور چیز کی حاجت نہیں اور وہ لوگ جو ہمارے نشانات کو دیکھ کر بھی جو ہم اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے دکھاتے ہیں غفلت میں ہی پڑے رہتے ہیں یہ لوگ وہ ہیں کہ چونکہ حقیقی آرام کے سرچشمہ سے خود دور ہوئے ہیں ان کو کبھی سچی راحت نہیں ملے گی بلکہ اپنے اعمال کے نتیجہ میں روحانی طور پر تکلیف ہی پاتے رہیں گے۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ [۹۵]۔ جو لوگ اپنے رب کے درجہ کو سمجھ لیتے ہیں اور اس کے مطابق عمل کرتے ہیں ان کو دو جنتیں دی جاتی ہیں یعنی ایک اس دنیا میں اور ایک مرنے کے بعد۔ اور ایک دوسرے مقام پر جنت کے اعلیٰ انعامات میں سے یہ انعام بیان فرماتا ہے وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ [۹۶]۔ بعض چہرے یعنی وہ لوگ جو جنت میں داخل ہوں گے بہت خوش ہوں گے کیونکہ وہ اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے اس جہان میں جنت مل جانے کے یہ معنے ہیں کہ اس جہان میں ان کو خدا تعالیٰ کا دیدار اور رؤیت نصیب ہو جائے گی اور اپنی روحانی آنکھوں سے اس کی صفات کا عرفان حاصل کر لیں گے اور ان کو اپنے نفس کے اندر جاری پائیں گے۔

ایک جگہ فرماتا ہے فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ [۹۷]۔ یعنی تم مجھے یاد کرو تو میں تم کو لقاء کے مقام پر ترقی دوں گا اور میرا شکر کرو اور میری نعمتوں کا کفران نہ کرو۔ یعنی جب دنیا کے آرام کے لئے میں نے اس قدر سامان بہم پہنچائے تو اس اصل خواہش کو جس کے لئے انسان کو پیدا کیا گیا ہے کیوں پورا نہیں کروں گا۔

اب یہ سوال ہوتا ہے کہ اس لقاء اور رؤیت کی اسلام کیفیت کیا بتاتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسی لطیف چیز کی کیفیت بتانی تو طاقت انسانی سے بالا ہے۔ وہ کیفیت تو صرف دل کے سمجھنے سے تعلق رکھتی ہے جو شخص اس کیفیت کو حاصل کرتا ہے وہی اس کو سمجھ سکتا ہے دوسرے شخص کو اس کا سمجھانا آسان کام نہیں ہے کیونکہ وہ نئی کیفیت ہے اور لوگ انہی کیفیات کو سمجھ سکتے ہیں جو ان پر طاری ہو چکی ہوں۔ مثلاً جس نے میٹھا کھایا ہے اس کو تو ہم یہ بتا سکتے ہیں کہ میٹھے کا لطف کیا ہے۔ جب ہم یہ کہیں گے کہ فلاں چیز میں بہت میٹھا تھا فوراً اس شخص کے ذہن میں وہ کیفیت جو

اس پر میٹھے کے کھانے سے طاری ہوتی ہے آجائے گی لیکن وہ شخص جس نے کبھی میٹھا نہیں چکھا اسے میٹھے کی کیفیت سمجھانی ناممکن ہے سوائے اس کے کہ اسے اشاروں میں سمجھایا جائے مگر پھر بھی وہ اس حالت کو اچھی طرح نہیں سمجھے گا ہاں بعض اثرات جو میٹھے کے دوسری چیزوں پر پڑتے ہیں جیسے لَزُوْجَتْ اور رطوبت وغیرہ ان کے ذریعہ سے ہم اسکو یہ سمجھا سکیں گے کہ میٹھا نمکین وغیرہ سے علیحدہ قسم کا مزہ رکھتا ہے۔ اور اصل سمجھانے کا طریق یہی ہوگا کہ اس کے منہ میں ایک ڈلی میٹھے کی رکھ دی جائے اور کہا جائے کہ یہ میٹھا ہے۔ اسی طرح لقاء اللہ کی کیفیت بھی لفظوں میں نہیں سمجھائی جاسکتی ہاں چونکہ یہ مضمون انسان کے ایمان سے تعلق رکھتا ہے اور اس پر انسان کی تمام روحانی ترقیات کا مدار ہے اس کے آثار اللہ تعالیٰ نے ایسے پیدا کر دیئے ہیں کہ جن کے ذریعہ سے یہ بات خوب روشن ہو جاتی ہے کہ ایک زندہ خدا کی رؤیت اور اس سے تعلق فلاں شخص کو حاصل ہو گیا ہے بعینہٖ اسی طرح جس طرح کہ ایک دھات کی بنی ہوئی مشین کو جب بجلی سے جوڑ دیا جاتا ہے تو اس کے اندر ایک طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ دیکھنے والے سمجھ جاتے ہیں کہ اب اس کا تعلق کسی بڑی طاقت کی چیز سے قائم ہو گیا ہے۔ قدیم سے اسی طرح لقاء اللہ کے آثار ظاہر ہوتے چلے آئے ہیں اور اب بھی اسی طرح ہوتے ہیں۔ نوح ' ابراہیم ' موسیٰ ' مسیح اور محمد صَلَوٰتُ اللّٰہِ عَلَیْہِمْ اور باقی تمام نبیوں کے تعلق باللہ کا حال خدا تعالیٰ کی صفات کی جلوہ گری سے ہی ظاہر ہوا ورنہ جو تعلق ان کو خدا تعالیٰ سے تھا اس کی کیفیت نہ ان کے زمانہ میں کوئی سمجھ سکا نہ اب سمجھ سکتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات وراء الوراء ہے اس کا تعلق اور اس کی رؤیت ہوتی ہی صفات کے انعکاس سے ہے چنانچہ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔

تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ [۹۸]۔ یعنی تم خدا سے ملنا چاہتے ہو تو خدا تعالیٰ کی صفات اپنے اندر جذب کرو اور اپنے اخلاق صفات الٰہیہ کے مطابق بناؤ۔

یاد رکھنا چاہئے کہ ان وجودوں سے تعلق جو وراء الوراء ہوں عرفان کے ذریعہ سے ہی ہو سکتا ہے اور عرفان جیسا کہ قرآن کریم نے اس کی تفصیل بیان فرمائی ہے تین قسم کا ہوتا ہے۔ اول علم الیقین یعنی کسی چیز کا پتہ صرف اس کے آثار سے ظاہر ہو خود نہ دیکھی ہو۔ اور دوسرا درجہ عرفان کا عین الیقین ہے کہ اس چیز کو خود بھی دیکھ لے صرف آثار تک بس نہ رہے لیکن ابھی اس کی حقیقت سے پوری طرح واقف نہ ہو۔ تیسرا درجہ عرفان کا یہ ہے کہ اس کی حقیقت

سے اس حد تک واقف ہو جائے جس حد تک کہ اس کے ابنائے جنس کے لئے اس کی حقیقت سے آگاہ ہونا ممکن ہے اور اس کے اثرات کو اپنی ذات پر پڑتا ہوا مشاہدہ کرے۔

ان تینوں علموں کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص مثلاً دور سے دُھواں دیکھے تو اسے یقین ہو جائے گا کہ وہاں آگ جل رہی ہے مگر پھر بھی اسے کامل یقین نہ ہو گا کہ بعض دفعہ آنکھ دھوکا کھاتی ہے اور گرد و غبار کو دُھواں سمجھ لیتی ہے لیکن اگر وہ قریب ہو جائے اور آگ کو شعلے مارتا ہوا اپنی آنکھوں سے دیکھ لے تو اس کا یقین آگے بڑھ جائے گا مگر پھر بھی خود اس کے نفس کو آگ دیکھنے سے آگ کی پوری کیفیت نہ معلوم ہو گی۔ مگر وہ اگر اس کے اندر ہاتھ ڈال کر دیکھے اور اس کے جلانے کی کیفیت کو ملاحظہ کرے تو پھر اس کا یقین اپنے کمال کو پہنچ جائے گا گو ان تینوں قسم کے یقینوں کے پھر اور بھی مدارج ہیں لیکن بڑی تقسیم یہی ہے اور ان مدارج کے حصول کی خواہش طبیعت میں رکھی گئی ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بچے جب ذرا ہوش سنبھالتے ہیں تو ضرور ایک دفعہ آگ کے شعلے میں ہاتھ ڈال کر دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس کا اثر کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ایک بچہ بھی شاید دنیا میں ایسا نہ ہو گا جس نے کبھی نہ کبھی اس خواہش میں اپنا ہاتھ نہ جلایا ہو۔

مذکورہ بالا تینوں مدارجِ عرفان کو اسلام پیش کرتا ہے پہلا درجہ عرفانِ الٰہی کا یہ ہے کہ انسان اس کی صفات کے متعلق لوگوں سے سنتا ہے کہ وہ اس طرح ظاہر ہوا کرتی تھیں مثلاً پہلے بزرگوں کے واقعات کو پڑھتا ہے کہ ان کے ساتھ خدا تعالیٰ کا اس طرح کا معاملہ تھا تو اس کے دل میں ایک حد تک یقین پیدا ہوتا ہے کہ فی الواقع کوئی بات ضرور ہے۔ لیکن یہ یقین ایک عارضی جوش پیدا کر سکتا ہے زیادہ نہیں کیونکہ جب وہ خود اس کوچے کی طرف قدم اٹھاتا ہے اور اس شخص کی طرح جو دور سے دُھواں دیکھ کر آگ کی تلاش میں چل پڑتا ہے لیکن جس قدر دور چلتا جائے دُھواں ہی دُھواں اسے نظر آتا ہے آگ کا پتہ کچھ نہیں ملتا آخر مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے اور خیال کر لیتا ہے کہ یہ دُھواں میری آنکھوں کا دھوکا ہے شاید کہ کوئی بادل کا ٹکڑا ہو یا کچھ اور۔ اسی طرح وہ شخص جو ان پرانے قصوں کے حاصل ہوئے ہوئے علم سے تسلی پا کر خود کوشش کرنے لگتا ہے آخر مایوس ہو جاتا ہے صرف وہی لوگ ان قصوں سے تسلی پاتے ہیں جو خود کچھ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے اور اس وجہ سے ان کے یقین کے باطل ہونے کا ان کو موقع ہی نہیں ملتا مگر یہ حالت ہرگز قابلِ رشک نہیں۔

اسلام صرف پہلے ہی درجہ تک انسان کے عرفان کو محدود نہیں کرتا بلکہ جیسا کہ بتایا گیا ہے وہ

تینوں قسم کے عرفان کا دروازہ ہمیشہ کے لئے کھلا رکھتا ہے اور اس کا دعویٰ ہے کہ جب بھی کوئی خدا تعالیٰ کی طرف سے اسلام کے بتائے ہوئے قواعد کے مطابق قدم بڑھاتا ہے وہ اپنی کوشش کے مطابق عرفان پالیتا ہے اور کوئی عرفان کا مقام نہیں جو خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے اب بند کر دیا ہو حالانکہ وہ پہلے لوگوں کے لئے کھلا تھا۔

میں بتا چکا ہوں کہ اصل عرفان تو وہ کیفیت خالص ہے جو انسان کے قلب میں پیدا ہوتی ہے اور وہ روحانی بینائی کی جدت ہے جس سے وہ خدا تعالیٰ کی صفات کو ایک نئے رنگ میں دیکھتا ہے اور وہ احساسات کی تیزی ہے جن سے انسان اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کی صفات میں لپٹا ہوا پاتا ہے۔ مگر جس طرح ہر ایک چیز کے کچھ آثار ہوتے ہیں خدا تعالیٰ کے لقاء کے بھی کچھ آثار ہیں جن کے ذریعہ سے بندہ اس کے تعلق کو محسوس کرتا ہے اور دوسرے لوگ بھی اس کے تعلق کو محسوس کرتے ہیں کیونکہ یہ ظاہر بات ہے کہ جب کوئی چیز کسی دوسری چیز کے قریب ہوتی ہے تو اگر وہ دوسری چیز اپنے اندر کوئی خاص خصوصیت رکھتی ہے تو اس کا اثر اس پر بھی پڑتا ہے مثلاً آگ کے پاس بیٹھ کر انسان کو گرمی محسوس ہوتی ہے برف کے پاس بیٹھے تو اس کی سردی کا اثر اس پر پڑنے لگتا ہے خوشبودار چیز سے چُھوئے تو اس کے کپڑوں میں سے بھی خوشبو آنے لگتی ہے یا بولنے والی ہستی سے قریب ہو جائے تو اس کی آواز کی پیدا کی ہوئی لہریں اس کے کان کے پردوں سے بھی ٹکرانے لگتی ہیں اور یہ اس بولنے والے کے علم سے حصہ لینے لگتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ اگر کوئی شخص خدا تعالیٰ کا لقاء حاصل کرے تو کچھ آثار اس کی ذات میں ایسے پائے جائیں جو اس پر دالّ ہوں کہ اسے فی الواقع خدا تعالیٰ کا قرب حاصل ہوا ہے ورنہ اگر منہ کے دعویٰ سے کچھ زیادہ نہ ہو تو ایک مکّار فریبی اور راستباز خدا پرست کے دعوؤں میں کیا فرق رہے اور دوسرے لوگ لقاء کے مقام والے کو دیکھ کر کیا فائدہ حاصل کریں۔ اسلام نے تین مدارج لقاء کے بتائے ہیں جن کے آثار سے ان کی کیفیت معلوم ہو جاتی ہے۔

وہ ایک طرف تو لقاء ہیں اور دوسری طرف خدا تعالیٰ پر یقین بڑھانے کا ایک ذریعہ (۱) پہلا درجہ دعا کی قبولیت کا ہے۔ (۲) دوسرا درجہ کلام الٰہی کا ہے (۳) تیسرا درجہ صفات الٰہیہ کے بندے کو اپنی آغوش میں ڈھانپ لینے کا ہے۔

پہلا درجہ یعنی دعا کی قبولیت کا

اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اپنی ذات کا یقین دلانے کے لئے اور اپنے وجود کا علم دینے کے

لئے اور اپنی طرف کھینچنے کے لئے دعا کا دروازہ کھولا ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ سے اگر کوئی انسان دعا کرتا ہے تو خدا تعالیٰ اسے قبول کرتا ہے بشرطیکہ دعا اس طریق پر ہو اور اس حد تک ہو جس حد تک کہ دعا ہونی چاہئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَیَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَیَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِیْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ۔[99] وہ کون ہے جو مضطر کی دعا سنتا ہے جب وہ اسے پکارتا ہے اور اس دعا کو قبول کر کے اس پکارنے والے کی تکلیف کو دور کرتا ہے اور جو ظالم ہو اس کے ظلم کو دور کر کے اس مظلوم فریادی کو اس کی جگہ پر قائم کر دیتا ہے۔ کیا اس خدا کی طاقت کا کوئی اور بھی ہے؟ مگر تم لوگ نصیحت نہیں حاصل کرتے۔

اس درجہ کو اللہ تعالیٰ نے سب کے لئے کھلا چھوڑا ہے یعنی خواہ کسی مذہب کا آدمی ہو اس کی دعاؤں کو جب وہ سخت گھبراہٹ میں کی جائیں سنتا ہے اور اس طرح اس امر کا موقع دیتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی زندگی اور اس کے تعلق کو محسوس کریں اور شک وشبہ کی حالت سے نکلیں۔ اور اس میں کیا شک ہے کہ انسان کو خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ عرفان ہر حالت کے لوگوں کو ملنا چاہئے کیونکہ انسان توجہ بھی تبھی کرتا ہے جب اس کے دل میں کسی چیز کی اہمیت پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ مقام جیسا کہ میں نے بتایا ہے سب مذاہب کے لوگوں کے لئے کھلا ہے۔ ہر مذہب کے لوگ خدا سے دعا کر کے دیکھ سکتے ہیں وہ اس کا فائدہ محسوس کریں گے اور ان کو معلوم ہو گا کہ بہت سی مشکلات جن سے وہ پہلے تکلیف پاتے تھے دعا کے ذریعہ سے حل ہو جائیں گی۔ مگر یہ درجہ عرفان کا بہت ہی ناقص درجہ ہے کیونکہ ہر وقت یہ شبہ انسان کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے کہ شاید جو کام دعا کے بعد ہو گیا ہے اس نے یوں بھی ہو ہی جانا تھا اور شاید جو مصیبت رک گئی اس نے یوں بھی رک جانا تھا کیونکہ بسا اوقات ہم دیکھتے ہیں کہ اتفاقات ایسے پیدا ہو جاتے ہیں کہ ہوتا ہوا کام رک جاتا ہے اور مشکل کام ہو جاتا ہے اور اس کے لئے دعا بھی کوئی نہیں کی گئی ہوتی بلکہ بعض اوقات وہ شخص جس سے یہ معاملہ گذر رہا ہوتا ہے دعا کا قائل ہی نہیں ہوتا۔

علاوہ ازیں اس درجہ میں ایک یہ بھی نقص ہوتا ہے کہ یہ بعض طبعی قوانین سے مشابہ ہے یعنی مسمریزم اور ہپناٹزم اور ان دونوں طبعی قوانین کے ذریعہ ہم دیکھتے ہیں کہ کئی بیماریاں دور ہو جاتی ہیں اور کئی تکالیف رفع ہو جاتی ہیں۔ پس شبہ پڑتا ہے کہ شاید دعا اسی قسم کی کوئی چیز ہو خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی مدد نہ آتی ہو بلکہ صرف اجتماع توجہ کے سبب سے بعض نتائج پیدا

ہو جاتے ہوں۔ گویہ شبہات اس درجہ کی دعا کے متعلق پیدا ہو سکتے ہیں لیکن پھر بھی بحیثیت مجموعی یہ ایک حد تک یقین کا ذریعہ ہے اور لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ میں نے جو یہ کہا ہے کہ اس درجہ کی دعا کے متعلق یہ شبہات ہو سکتے ہیں تو میرا یہ مطلب ہے کہ ایک درجہ دعا کا اور ہے جو بالکل یقینی ہے مگر وہ اگلی قسم کے عرفانوں میں شامل ہے اس کا ذکر انہی کے ساتھ کروں گا۔

دوسرا درجہ عرفان کا کلام الٰہی ہے

اسلام اس درجہ کے متعلق خاص زور دیتا ہے دوسرے مذاہب عام طور پر اس دروازہ کو بند سمجھتے ہیں لیکن عقل اس امر کو تسلیم نہیں کر سکتی کہ وہ خدا جو اپنے بندوں کو اپنی ہستی کا یقین دلانے کے لئے پہلے کلام کرتا تھا اب اس نے کلام کرنا بالکل بند کر دیا ہے۔ خدا تعالیٰ کی صفات تو ہمیشہ قائم رہتی ہیں۔ وہ تو نقص اور زوال سے پاک ہے پھر یہ خاموشی جو سینکڑوں سال سے شروع ہو کر اب ہزاروں تک پہنچنے والی ہے کیوں ہے؟ اگر وہ کلام نہیں کرتا تو کیونکر سمجھا جائے کہ وہ سنتا ہے؟ اور پھر کیونکر سمجھا جائے کہ اس کی باقی صفات درست ہیں؟ کیا کسی کا حق نہیں کہ اس کے کلام کے بند ہو جانے پر یہ سوال کرے کہ کیوں یہ نہ سمجھا جائے کہ اب وہ دیکھتا بھی نہیں اور اس کا علم بھی جاتا رہا ہے اور وہ حفاظت بھی اب نہیں کر سکتا بلکہ دنیا کا کارخانہ اب آپ ہی آپ چل رہا ہے؟ اگر باقی صفات اس کی اسی طرح کام کر رہی ہیں کہ جس طرح پہلے کام کرتی تھیں تو اس کے کلام کا سلسلہ کیوں بند ہو گیا ہے؟ وہ وراء الوراء ہے اور اس کی ذات کا یقین دلانے کے لئے اس کی رؤیت تو ممکن ہی نہیں ایک اس کا کلام تھا جو لوگوں کو اس کے موجود ہونے کا علم دیا کرتا تھا اب یہ راستہ بھی اگر بند ہو گیا ہے تو پھر اس پر یقین دلانے کا اور کونسا راستہ کھلا ہے؟ اے بھائیو اور بہنو! اسلام کہتا ہے کہ یہ خیال کہ خدا کے کلام کا سلسلہ بند ہو گیا ہے درست نہیں۔ وہ اب بھی اسی طرح بولتا ہے جس طرح پہلے بولتا تھا وہ اب بھی اسی طرح اپنے بندوں کو یاد کرتا ہے جس طرح پہلے یاد کرتا تھا بلکہ اس نے اپنی طرف ہدایت دینے کے لئے کلام کا سلسلہ بھی دعا کے سلسلہ کی طرح وسیع کیا ہوا ہے اور ایسے لوگوں کو بھی جو خدا کے دین سے دور ہو جاتے ہیں کبھی الہام ہو جاتا ہے تاکہ وہ راستبازوں کے کلام پر شک نہ کریں بلکہ ان کی صداقت پر گواہ ہوں۔

قرآن کریم فرماتا ہے اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ○ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ [100] ۔ وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ

خدا ہمارا رب ہے پھر اس امر پر قائم ہو جاتے ہیں۔ کوئی مصیبت ان کو ڈراتی نہیں۔ ان پر فرشتے یہ کلام لے کر نازل ہوتے ہیں کہ ڈرو نہیں اور نہ اپنے نقصانات پر غم کھاؤ بلکہ خوش ہو اس جنت پر کہ جس کا تم کو وعدہ دیا گیا ہے ہم تمہارے ورلی زندگی میں بھی دوست ہیں اور مرنے کے بعد کی زندگی میں بھی دوست رہیں گے۔ اور تمہیں وہ چیز ملے گی جو تمہارے نفسوں کی خواہش ہے اور جو کچھ مانگو گے وہ ملے گا یعنی لقائے الٰہی کی خواہش جو مومنوں کی اصل خواہش ہوتی ہے اعلیٰ اور اکمل طور سے پوری ہوگی۔

اس آیت سے ظاہر ہے کہ اسلام کلام الٰہی کے نزول کا دروازہ کھلا سمجھتا ہے بلکہ اس کا وعدہ کرتا ہے اور یہ امر ظاہر ہے کہ جس سے خدا تعالیٰ براہ راست یا بذریعہ ملائکہ کلام کرے گا اس کا یقین اور ایمان اللہ تعالیٰ پر کس قدر بڑھ جائے گا اور اس کے دل کو کس قدر تقویت حاصل ہو جائے گی کیونکہ کلام سننا بھی ایک قسم کی رؤیت ہی ہے اگر جنگل میں کوئی دوست جدا ہو جائے اور وہ ہمیں آواز دیدے کہ میں فلاں جگہ موجود ہوں تو ہمارا خطرہ اسی طرح دور ہو جاتا ہے جس طرح کہ دیکھ لینے سے۔ پس جس شخص سے اللہ تعالیٰ کلام کرے اس کے دل کو خدا تعالیٰ پر ایسا یقین ہو جانا چاہئے جیسا کہ دیکھی ہوئی چیز کا ہوتا ہے۔

اسلام کا یہ دعویٰ ہی نہیں بلکہ تیرہ سو سال سے برابر آج تک مسلمانوں میں ایسے انسان پیدا ہوتے چلے آئے ہیں کہ جن سے خدا نے کلام کیا ہے اور یہ امر تواتر کی حد تک پہنچا ہوا ہے۔ پس اس کے متعلق شک کرنا گویا سَفُسْطَۃ (وہم۔ مرتب) کا دروازہ کھولنا ہے۔ اس زمانہ میں حضرت مسیح موعود پر خدا کا کلام نازل ہوا اور آپ کی قوت قدسیہ کے اثر سے اور ہزاروں آدمیوں کو اس جماعت میں سے خدا کا کلام سننا میسر ہوا حتیٰ کہ میں سمجھتا ہوں کہ کم سے کم پچاس فیصدی احمدی ہوں گے جنہوں نے کسی نہ کسی رنگ میں خدا تعالیٰ کا کلام سنا ہو گا اور ان کے ایمان اور یقین کو اس سے تقویت حاصل ہوئی ہوگی۔

ایک بات اس جگہ یاد رکھنی چاہئے کہ خدا کے کلام سے مراد وہ تشریح نہیں ہے جو آج کل لوگ سمجھتے ہیں یعنی کوئی خیال نیک ان کے دل میں زور سے پڑ جائے تو وہ اسے الہام الٰہی قرار دے لیتے ہیں بلکہ بعض لوگ ناواقفیت کی وجہ سے اس قدر ترقی کر گئے ہیں کہ وہ خیال کرتے ہیں کہ کبھی خدا تعالیٰ کا کلام الفاظ میں نازل نہیں ہوا۔ بلکہ نبیوں کے دلی خیالات کا نام ہی کلام الٰہی رکھ لیا گیا ہے اسلام اس امر کا ہرگز قائل نہیں بلکہ اسلام ہمیں یہ بتاتا ہے کہ الہام الٰہی الفاظ میں

نازل ہوتا ہے اور اسی طرح بندے سے خدا ہم کلام ہوتا ہے جس طرح کہ ایک انسان دوسرے انسان سے ہمکلام ہوتا ہے۔ ایسی ہی آواز پیدا ہوتی ہے جس طرح کہ انسانوں کے کلام میں پیدا ہوا کرتی ہے اور اسی طرح انسان آواز کو سنتا ہے جس طرح کہ وہ روز مرہ کلام سنتا ہے صرف فرق یہ ہے کہ الہامی آواز نہایت شاندار ہوتی ہے اور اس کے اندر رعب ہوتا ہے اور باوجود رُعب کے اس کے اندر ایسی لذت اور راحت ہوتی ہے کہ انسان پر ایک ربودگی کی حالت طاری ہو جاتی ہے اور وہ خیال کرتا ہے کہ وہ گویا اوپر کی طرف کھینچا گیا ہے اور کوئی بڑی طاقت اس پر مستولی ہو گئی ہے تب کوئی لطیف کلام یا اس کے کانوں پر ڈالا جاتا ہے جسے وہ سنتا ہے یا اس کی زبان پر نازل کیا جاتا ہے جسے وہ پڑھتا ہے یا لکھا ہوا اس کے سامنے پیش کیا جاتا ہے جسے وہ یاد کرلیتا ہے مگر اس تمام عرصہ میں اس پر ایک حالت ربودگی طاری رہتی ہے تا کہ اس امر کا ثبوت رہے کہ یہ سب اس کا وہم اور خیال نہیں ہے بلکہ ایک بالائی طاقت کی طرف سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔

الہام کی ان اقسام کے علاوہ دو اور اقسام بھی ہیں جو بجائے الفاظ کے تصویری زبان میں نازل ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک قسم خواب کہلاتی ہے جو کامل نیند کے عرصہ میں ہوتی ہے اور اس میں کوئی امر بطور استعارہ کے کسی شکل میں دکھایا جاتا ہے جیسے مثلاً دودھ دکھایا گیا تو اس سے مراد علم ہو گا اور بھینس دکھائی گئی تو اس سے مراد وبا اور بیماری ہو گی۔ دوسری قسم کشف کی ہے جو اس طرح ظاہر ہوتی ہے کہ انسان کامل ہوش میں بعض وفات یافتوں سے روحانی ملاقات کرلیتا ہے یا بعض امور جو کہیں اور جگہ پر ہو رہے ہیں دیکھ لیتا ہے حالانکہ وہ اپنی جگہ اپنے کام میں مشغول ہوتا ہے۔ اس قسم کے نظارہ کو اسلامی اصطلاح میں کشف کہتے ہیں یہ سب اقسام قرآن کریم سے ثابت ہیں مگر ان کا تفصیلی ذکر مضمون کو بہت لمبا کر دے گا۔

غرض یہ کہ اسلام الہام کی تشریح یہ نہیں کرتا کہ یونہی دل میں ایک خیال پیدا ہو جائے۔ ایسا خیال محض الہام کی نعمت سے دوری کی وجہ سے پیدا ہوا ہے اور اگر اس کو صحیح تسلیم کرلیا جائے تو الہام کی حقیقت کچھ باقی ہی نہیں رہتی۔ خالی خیال اور تحریک قلبی تو دنیا کے ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتے رہتے ہیں اور اگر یہ الہام ہے تو پھر جو خیال کسی کے دل میں پیدا ہو وہ اسے الہام قرار دے سکتا ہے تب تو دنیا کی کوئی کتاب ایسی نہیں جو الہام سے خالی ہو۔ کلام الٰہی تو وہ ہونا چاہئے جو یقین اور وثوق کی راہ پیدا کرے نہ کہ وساوس اور شبہات کا دروازہ کھولے۔ اور اگر الہام

دل کے خیال یا تحریک کا نام ہو اور لفظی الہام نہ ہوتا ہو تب تو بہت سے لوگ اس مصیبت میں مبتلاء ہو جائیں گے کہ جو خیال ان کے دل میں پیدا ہو گا وہ اسے الہام سمجھ لیں گے۔ آخر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بات آتی ہے اس کے اندر اس قدر امتیاز تو ہونا چاہئے کہ محض خیال اور وہم اس کا مقابلہ نہ کر سکیں اور یہ نہ ہو کہ بِلاوجہ اور بِلاقصور لوگ گرفت میں آجائیں۔ آخر وہ کونسا امتیاز ہو گا جس سے انسان یہ سمجھے کہ یہ میرے دل کا خیال ہے الہام نہیں یا یہ کہ الہام ہے دل کا خیال نہیں یا میری تحریر ہے خدا کی نہیں یا خدا کی ہے میری نہیں۔ اگر کہو کہ اس وقت ساتھ ہی یہ بھی خیال ہو گا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے میری طرف سے نہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب ہم دلی خیال کو الہام کہنے لگیں تو دماغ کو یہ خیال پیدا کرتے کونسی دیر لگے گی کہ یہ تیرا خیال نہیں بلکہ الہام ہے؟ درحقیقت اس قسم کا خیال نہ صرف مذاہب کے اعتبار کو کھونے والا ہے بلکہ وہم اور وسوسہ اور خدا پر جرأت کو اس قدر بڑھانے والا ہے کہ اس قسم کے خیال والوں کے لئے خطرہ ہے کہ وہ تھوڑے تھوڑے دھوکا سے ایک نیا مذہب بنالیں اور حقیقت سے دور جاکر خود بھی ٹھوکر کھائیں اور دوسروں کو بھی ٹھوکر کھلائیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ لفظی الہام کے متعلق بھی بعض لوگوں کو وسوسہ ہو سکتا ہے کیونکہ دماغ کے بعض نقص ایسے بھی ہیں کہ جن کی وجہ سے انسان کو مختلف نظارے نظر آجاتے ہیں یا بعض دفعہ الفاظ بھی سنائی دیتے ہیں۔ مگر اس میں ایک بچاؤ ہے اور وہ یہ کہ اس صورت الہام سے تو اسی کو دھوکا لگ سکتا ہے جو پاگل ہو اور اس کے دماغ میں نقص ہو لیکن صورت اول میں تو ایک تھوڑے سے وسوسہ سے بالکل سمجھدار آدمی اپنے خیالات کو الہام قرار دے سکتا ہے اور اس کے دھوکے کو دور کرنے کی کوئی صورت ہی اس کے پاس باقی نہیں رہتی۔

غرض جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ یہ وسوسہ کہ الہام دلی خیال کا نام ہے الہام سے دوری کے سبب سے ہوا ہے۔ اگر ایسے لوگوں کو خدا تعالیٰ کا الہام ایک دفعہ بھی ہوتا تو یہ اس دھوکے میں نہ پڑتے اور سمجھ جاتے کہ اللہ تعالیٰ پُرہیبت اور ساتھ ہی دلکش آواز میں لفظوں میں کلام نازل کرتا ہے جسے اس کے بندے اسی طرح سنتے ہیں جس طرح دوسرے کلاموں کو اور اس میں کسی وہم یا خیال کا گمان نہیں ہو سکتا۔ خدا تعالیٰ کے فضل سے راقم مضمون بھی اس کا تجربہ کار ہے اور اپنے تجربہ کی بناء پر کہہ سکتا ہے کہ خدا کا کلام الفاظ میں نازل ہوتا ہے محض خیال کے طور پر نہیں۔

اس جگہ پر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ قرآن کریم کے نزدیک ہر ایک الہام یا خواب یا کشف

خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوتا بلکہ اسلام اس امر کو تسلیم کرتا ہے کہ الہام یا خوابیں کئی اقسام کی ہوتی ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى مَاضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى - وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى [۱۱] ہم اس بے جڑ بوٹی کو بطور شہادت پیش کرتے ہیں جب وہ گر جائے یعنی جس طرح وہ بوٹی جس کی جڑھ نہ ہو اگر اونچی ہو تو گر جاتی ہے اسی طرح جو شخص نبوت کے دعویٰ میں جھوٹا ہوتا ہے خواہ الہام کا بنانے والا ہو خواہ دھوکا خوردہ ہو۔ چونکہ اس کی تعلیم کی بنیاد ان روحانی علوم پر نہیں ہوتی جو کسی سلسلہ کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہیں اس لئے جب اس کی جماعت بڑھنے لگتی ہے تو اس میں انحطاط کے آثار پیدا ہونے لگ جاتے ہیں اور وہ بلند و بالا نہیں ہو سکتی یعنی ایک مستقل مذہب کی صورت اختیار کرنے سے پہلے اس کی تباہی شروع ہو جاتی ہے۔ وہ دوسرے مذاہب کے مقابل سر اونچا کر کے نہیں کھڑا ہو سکتا بلکہ ایک فرقہ کی ہی صورت میں ہوتا ہے کہ اس کا سر نیچے ہو جاتا ہے۔ پھر فرماتا ہے تمہارا ساتھی گمراہ نہیں ہوا اور نہ وہ شرارت سے یہ دعویٰ کرتا ہے یعنی نہ تو اس کو دھوکا لگا ہے اور نہ یہ جانتے ہوئے کہ مجھے کوئی الہام نہیں ہوتا فریب سے الہام بناتا ہے اور نہ وہ اپنی خواہشات کے سبب سے کلام کرتا ہے یعنی ایسا نہیں ہوا کہ اس کی خواہشات نے اس کے سامنے بعض نظارے بنا کر دکھلائے ہوں اور وہ ان کو الہام سمجھ بیٹھا ہو بلکہ اس کو الہام ہوا ہے جو کسی اور طاقت نے کیا ہے مگر یہ شبہ نہ کرنا کہ شیطان کی طرف سے الہام ہوا ہے بلکہ اس کا الہام کرنے والا وہ طاقتور خدا ہے جس کے ہاتھ میں سب کچھ ہے۔ پس وہ اپنی قوت اور طاقت کے اظہار سے اس امر کو ثابت کر دے گا کہ اس کا الہام سچا ہے۔ اور خدا کی طرف سے ہے اور اس کی جماعت بڑھے گی اور تنے والے درخت کی طرح اونچی ہوگی اور تمام طبائع اور علوم کے لوگ اس میں داخل ہوں گے اور زمانہ اس کو مٹا نہیں سکے گا اور وہ دوسرے کثیر التعداد مذاہب کے سامنے سر اونچا کر کے کھڑا ہو گا اور ان میں سے گِنا جائے گا۔

اس آیت میں الہام کی چار قسمیں بیان فرمائی ہیں ایک وہ الہام جس کے منبع کا پتہ لگانا انسان کے لئے مشکل ہوتا ہے یعنی جو دماغ کی خرابی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ دوسرے وہ الہام جو نفسانی خواہشات کا نتیجہ ہوتا ہے اور انسان سوچے تو معلوم کر سکتا ہے کہ جو خیالات میرے دل میں پیدا ہوتے تھے انہی کے مطابق میں نے نظارہ دیکھ لیا ہے تیسرے وہ الہام جو شیطانی ہوتا ہے یعنی جس میں روحانیت کے خلاف بے دینی اور بدی کی تعلیم ہوتی ہے اور چوتھے وہ الہام جو خدا تعالیٰ کی

طرف سے نازل ہوتا ہے۔

پس جب میں یہ کہتا ہوں کہ الہام کو اسلام خدا تعالیٰ کی ملاقات کا ایک ذریعہ قرار دیتا ہے تو اس سے میری یہ مراد نہیں کہ ہر خواب اور الہام ایسا ہے۔ میں اس امر کو تسلیم کرتا ہوں اور قرآن کریم جدید تحقیق سے بہت پہلے خوابوں کے متعلق بیان فرما چکا ہے کہ ان کی دو قسمیں طبعی ہیں۔ ایک تو وہ جو دماغی خرابی کے نتیجہ میں آتی ہیں اور دوسری وہ جو خواہشات نفسانی کے نتیجہ میں آتی ہیں بلکہ میرا مطلب صرف ان الہامات سے ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے آتے ہیں اور نفسانی یا خواہشات سے پیدا ہونے والے الہاموں سے ممتاز ہوتے ہیں۔

مگر بہرحال چونکہ الہامات کی اور اقسام بھی ہیں اس لئے عام الہام بھی عرفان کے لئے اس قدر مفید نہیں کیونکہ کامل عرفان کے لئے ذریعہ بھی ایسا یقینی ہونا چاہئے کہ جو اپنی ذات میں کامل ہو اور اس کے بعد شک و شبہ کی گنجائش ہی نہ رہے۔

یاد رکھنا چاہئے کہ میں نے عام الہام کے الفاظ اس لئے استعمال کئے ہیں کہ مذکورہ بالا شبہات صرف عام الہام کے متعلق ہی پیدا ہو سکتے ہیں ورنہ دعا کی طرح الہام اور وحی کا بھی ایک ایسا ہی درجہ ہے جو تیسری قسم کا عرفان پیدا کرتا ہے اور جسے اس تیسری قسم کے نیچے بیان کیا جائے گا۔ ورنہ عام الہام دوسری قسم کا عرفان تو پیدا کر سکتا ہے یعنی عین الیقین تک تو پہنچا دیتا ہے مگر اس سے اوپر نہیں لے جاتا۔

دونوں قسموں کے عرفانوں کو بیان کرنے کے بعد اب میں تیسری قسم کے عرفان کو بیان کرتا ہوں۔ اسلام اس قسم کے عرفان یعنی حق الیقین کے پیدا کرنے کا بھی دعویدار ہے اور اس پر بڑے زور سے اصرار کرتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کو حکم ہے کہ پانچوں نمازوں میں دن رات میں کوئی چالیس پچاس دفعہ یہ دعا خدا تعالیٰ سے کیا کریں کہ اے خدا تُو ہمیں صراط مستقیم دکھا اور وہ صراط مستقیم دکھا جس پر پہلے لوگ گذر چکے ہیں جن پر تُو نے انعام کیا تھا۔ اور قرآن کریم میں دوسری جگہ فرمایا ہے کہ انعام والے لوگوں سے وہ لوگ مراد ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے نبوت کے مقام پر یا صدیقیت یا شہادت یا صالحیت کے مقام پر کھڑا کیا ہے یعنی یا تو وہ نبی ہیں یا نبیوں کے قریب پہنچے ہوئے ہیں۔ یا وہ نبوت کے مقام کے قریب تو نہیں مگر ہیں خدا تعالیٰ کی صفات سے حصہ لینے والے اور اس رتبہ پر پہنچے ہوئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے عملی اثرات کو لوگوں کے سامنے پیش کر سکتے ہیں اور اپنے تجربہ کی بناء پر لوگوں کو خدا تعالیٰ کی صفات کی طرف راہنمائی کر سکتے ہیں۔ یا وہ

شہادت کے درجہ کی قابلیت پیدا کر رہے ہیں ان مقامات میں سے پہلے تین مقامات ہی دراصل وہ مقامات ہیں جن پر پہنچ کر انسان شک و شبہ سے پاک ہو جاتا ہے۔

ہمیں کیا فائدہ ہے اس امر پر زور دینے کا کہ خدا تعالیٰ علیم ہے جب تک کہ اس کے علم کا ہم کو یقینی ثبوت نہیں ملتا؟ جب تک ہم اپنی آنکھوں سے اس کے علم کا مشاہدہ نہ کریں۔ ہم کس طرح تسلی سے بلکہ میں کہتا ہوں دیانتداری سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ فی الواقع علیم ہے۔ خدا تعالیٰ کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ زندہ کرتا ہے اگر ہم اس کا کوئی ثبوت نہیں دیکھتے کہ وہ زندہ کر سکتا ہے تو ہم کس طرح یقین سے بلکہ میں کہتا ہوں دیانتداری سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ فی الواقع مُردوں کو زندہ کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ خالق ہے لیکن ہم تو دیکھتے ہیں کہ ایک خاص قانون کے ماتحت سب کچھ ہو رہا ہے پھر ہم کس طرح مانیں کہ اس پیدائش میں خدا کا بھی کوئی دخل ہے اور ہم کس طرح وثوق سے بلکہ میں کہتا ہوں دیانتداری سے کہہ سکتے ہیں کہ واقع میں خدا خالق ہے۔ پھر ہم کہتے ہیں کہ ہر ایک چیز اس کے قبضہ میں ہے لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہزاروں انسان اس کی ذات کا بھی انکار کرنے والے موجود ہیں پھر جبکہ ہم اس کے تصرف کا ظاہر میں کوئی نشان نہیں دیکھتے تو ہم کس طرح علم کی بناء پر بلکہ میں کہتا ہوں کہ دیانتداری سے کہہ سکتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کو دنیا کی چیزوں پر تصرّف حاصل ہے۔ یہی حال سب صفات کا ہے جب تک ہم اس امر کا یقینی ثبوت نہ رکھتے ہوں کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ان صفات کا ظہور اس رنگ میں ہوتا ہے کہ ہم اس کو اتفاق کی طرف منسوب ہی نہیں کر سکتے ہم کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ یہ صفات خدا تعالیٰ میں ہیں۔ بلکہ حق یہ ہے کہ جب کہ خدا تعالیٰ کی ذات تو نظر نہیں آتی اس کا علم اس کی صفات کے ہی ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے تو جبکہ ہمارے پاس کوئی یقینی ثبوت اس کی صفات کے ظہور کا نہ ہو ہم دیانتداری سے یہ بھی کب کہہ سکتے ہیں کہ کوئی خدا بھی موجود ہے اور جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے یہ سب کسی بے جان قانون قدرت کا جو کسی غیر معلوم پیچ در پیچ جوڑ کے ساتھ نہایت ہی مکمل طور پر چل رہا ہے نتیجہ نہیں ہے۔

اس شبہ کا ازالہ صرف اسلام ہی کرتا ہے۔ اس کی تعلیم پر چل کر ایسے لوگ پیدا ہوتے رہتے ہیں جو کہ صفات الٰہیہ کے مظہر ہوتے ہیں اور جو پہلے خود اپنی ذات پر صفات الٰہیہ کا پَرتَو ڈالتے اور پھر دوسروں کو اس کا نشان دکھاتے ہیں اور ہستی باری تعالیٰ کا کامل عرفان بخشتے ہیں۔ چنانچہ اس زمانے میں بھی اللہ تعالیٰ نے اس غرض کے لئے کہ لوگ اس کے وجود کو پہچانیں اور شک و شبہ کی زندگی

سے پاک ہوں حضرت مسیح موعود کو بھیجا تھا جو کہ اسلام کی تعلیم پر عمل کر کے اس مقام پر پہنچے جس پر قدیم سے نبی پہنچتے چلے آئے ہیں بلکہ بہت سے نبیوں کے مقام سے بھی اوپر قرآن نے اس مقام تک آپ کی راہنمائی کی جس تک ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور مسیحؑ کو راہنمائی حاصل نہ ہوئی تھی اور آپ نے اپنی قوت قدسیہ سے خدا تعالیٰ کی صفات کو ایسے یقینی رنگ میں ثابت کیا کہ ہر ایک جو دیکھتا ہے حیران ہو جاتا ہے اور جو سنتا ہے دنگ رہ جاتا ہے۔ لاکھوں ہیں جو ان نشانات کے ذریعہ سے زندہ کئے گئے ہیں اور لاکھوں ہیں جو ان معجزات کے ذریعہ سے بیماریوں سے شفا دیئے گئے ہیں۔ آپ نے وہ درجہ عرفان کا پایا جس کے بعد کوئی شک اور شبہ باقی نہیں رہتا اور اس طرح خدا سے ملے کہ جس کے بعد کوئی دوری باقی نہیں رہتی اور ایسی پیوستگی حاصل کی کہ اس کے بعد کوئی افتراق نہیں اور خدا تعالیٰ کے رنگ میں ایسے رنگین ہوئے کہ اور کوئی رنگ آپ پر باقی نہ رہا۔ آپ دنیا سے بکُلّی منقطع ہو کر اسی یارِ ازل کے ہو گئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ یارِ ازل آپ کا ہو گیا۔ غرض اسلام کی تعلیم کا ایک ایک حکم آپ نے خود تجربہ کر کے دیکھا اور اس کو صحیح پایا اور اس کے نیک نتائج آپ نے محسوس کئے اور آپ پر خدا تعالیٰ نے اپنی صفات کی چادر ظلّی طور پر اُڑھائی اور آپ اس سے مزین ہو کر دنیا کی طرف واپس لوٹے تا کہ لوگوں کو خدا کی طرف لے جائیں۔ آپ ہی کا حق تھا کہ آپ لوگوں کو خدا تعالیٰ کی طرف لے جاتے کیونکہ یہ قدیم سے سنت چلی آتی ہے کہ وہی اوپر جاسکتے ہیں کہ جو اوپر سے آتے ہیں۔ حضرت مسیحؑ فرماتے ہیں "اور کوئی آدمی آسمان پر نہیں جاتا لیکن وہی جو آسمان سے آتا ہے"[۱۰۲] اور میں اس پر یہ زیادہ کرتا ہوں کہ کوئی شخص آسمان پر نہیں جاسکتا مگر وہ جو آسمان سے بھیجا جاتا ہے۔ پس حضرت مسیح موعود جن کو بطور عطیہ کے خدا تعالیٰ نے اپنے جلال کی چادر اُڑھائی اور پھر دنیا کی ہدایت کے لئے دنیا میں واپس بھیجا آپ ہی کا حق تھا کہ لوگوں کو خدا تعالیٰ تک پہنچائیں۔ چنانچہ آپ نے اللہ تعالیٰ کی ایک ایک صفت کو اپنے وجود سے ظاہر کیا اور خدا تعالیٰ کو لوگوں سے قریب کر کے لوگوں کو خدا سے قریب کر دیا۔ قرآن کریم میں آتا ہے وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ[۱۰۳] خدا بندوں کی کمزوری کو دیکھ کر خود ان کے قریب ہوتا ہے۔ چنانچہ جس طرح قدیم زمانہ سے اس کی سنت ہے وہ اب بھی مسیح موعود پر ظاہر ہوا۔ اور اس کے ذریعہ سے اس نے اپنے آپ کو دوسری دنیا پر ظاہر کیا تا ثابت ہو کہ وہ خدا زندوں کا خدا ہے۔ وہ جس طرح ابرہام کا خدا تھا' موسیٰ کا خدا تھا' مسیح کا خدا تھا' آنحضرت ﷺ کا خدا تھا' اب بھی وہ ہمارا خدا ہے۔ اس نے ہم کو نہیں چھوڑا بلکہ ہم

نے اپنی جہالت سے اس کو چھوڑا ہوا تھا۔

یہ تو مشکل ہے کہ میں خدا تعالیٰ کی ایک ایک صفت کے متعلق بیان کروں کہ کس طرح مسیح موعود نے عرفان کامل کے حصول کے بعد اس کو دنیا کے سامنے پیش کیا اور ثابت کیا مگر میں بطور مثال کے چند صفات کو لے لیتا ہوں۔

اول ایک صفت جسے چھوٹے بڑے پیش کرتے ہیں علم کی صفت ہے۔ ہر مذہب کے لوگ کہتے ہیں کہ خدا علیم ہے ہر اک چھوٹی بڑی بات کو جانتا ہے مگر باوجود اس کے کوئی نہیں بتاتا کہ کیونکر معلوم ہو کہ خدا علیم ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اس صفت کو عملی ثبوتوں سے دنیا پر ثابت کیا۔ چنانچہ آپ نے ایسے علوم دنیا پر ظاہر کئے جن میں سے بعض دنیا کی نظروں سے مخفی تھے۔ بعض ایسے تھے کہ ان کا طریقِ حصول غیر معمولی تھا اور بعض ایسے تھے کہ ان کا جاننا ہی انسانی طاقت سے بالا تھا۔ امرِ اول کی مثال تو مثلاً وہ تعلیم ہی ہے جو آپ نے دی ہے اور جس کا کچھ حصہ مختصراً بطور نمونہ کے میں اوپر ذکر کر چکا ہوں اور کچھ حصہ آگے بیان کروں گا اور امر دوم اور سوم کی مثالیں میں ذیل میں بیان کرتا ہوں۔

شاید آپ لوگوں میں سے اکثر اس امر سے ناواقف ہوں کہ آپ ہندوستان کے اس گوشہ کے رہنے والے تھے جس پر سکھ حکمران تھے جن کے زیرِ حکومت علم کا نام و نشان نہ ملتا تھا۔ آپ کسی مدرسہ میں نہیں پڑھے دس دن کے لئے بھی آپ نے کسی درسگاہ میں تعلیم نہیں حاصل کی۔ آپ کے والد صاحب نے معمولی مدرّسوں کے ذریعہ سے چند ابتدائی کتب آپ کو پڑھوا دی تھیں مگر جب آپ کو اللہ تعالیٰ نے مقام نبوت پر ممتاز کیا تو ایک ہی رات میں آپ کو عربی کا علم اس شان کے ساتھ سکھا دیا کہ عرب اور مصر کے علماء اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز آ گئے۔ آپ نے عربی زبان میں بڑی تحدّی کے ساتھ کتب لکھی ہیں اور اپنے مخالفوں کو بار بار چیلنج دیا ہے کہ اگر وہ آپ کی تصنیفات کو انسانی علم کا نتیجہ بتاتے ہیں تو ان کے مقابلہ میں ویسی ہی کتب لکھ کر دکھا دیں۔ مگر باوجود بار بار چیلنج دینے کے اور مقابلہ کی دعوت دینے کے ایک شخص بھی مقابلہ پر نہیں آیا۔ نہ کوئی مصر کا عالم نہ عرب کا نہ ہندوستان کا۔ اب یہ نشان جو آپ سے ظاہر ہوا۔ اگر اللہ تعالیٰ کے علیم ہونے کا ثبوت نہیں تو اور کیا ہے؟ کیا عقل اس امر کو تسلیم کر سکتی ہے کہ محض وہم کے ساتھ ایک شخص ایسا کمال پیدا کر سکتا ہے؟ پنجاب کا ملک عرب سے اس قدر دور ہے اور علمی مراکز سے اتنے فاصلہ پر ہے کہ کوئی صورتِ امکان نہیں کہ آپ نے دوسرے لوگوں سے مل کر عربی سیکھ لی

ہو۔ اور اگر سیکھ بھی لی ہو تو جبکہ پنجاب کی باقاعدہ درسگاہوں میں پڑھے ہوئے لوگ چند صفحے عربی کے نہیں لکھ سکتے تو آپ نے پنجاب میں بیٹھے بیٹھے چند دن کی صحبت میں عربی پر اس قدر عبور کہاں سے حاصل کر لیا کہ عربی میں پچیس کے قریب کتب لکھ دیں اور پھر سب علماء کو چیلنج بھی دیا مگر کوئی شخص مقابل نہیں آیا۔ بے شک بعض لوگ اپنی فصاحت و بلاغت میں بے نظیر سمجھے جاتے ہیں۔ جیسے شیکسپیئر[103] ڈنٹی[104] وغیرہ۔ مگر ان کی مثال اس جگہ پیش نہیں کی جا سکتی کیونکہ وہ لوگ پہلے دعویٰ کر کے نہیں کھڑے ہوئے۔ پہلے تو خود ان کو بھی علم نہیں تھا کہ ان کی کتب کیا رتبہ پائیں گی مگر جب وہ کتب مشہور ہوئیں تو معلوم ہوا کہ وہ نہایت اعلیٰ درجہ کی ہیں۔ جب چند آدمی دوڑتے ہیں تو ان میں سے کوئی نہ کوئی تو اول نکل ہی آتا ہے پس جو اول نکلے اس کا حق نہیں کہ وہ اس امر کو کوئی غیر معمولی کام قرار دے۔ مگر ایک کمزور اور نحیف آدمی جو اچھی طرح چل بھی نہ سکتا ہو وہ ایک دوڑ میں شامل ہو اور پہلے سے کہہ دے کہ میں اول رہوں گا اور پھر اول رہے تو اس کا اول رہنا بے شک ایک معجزہ ہو گا اور کسی بالا طاقت کی طرف منسوب کیا جائے گا۔

خدا تعالیٰ اسی طرح اپنی صفتِ علم کا اظہار کیا کرتا ہے چنانچہ اعمال باب ۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ حواریوں کے ذریعہ سے بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت علم کا اظہار اسی طرح کیا تھا کہ ان کو دوسرے قبائل کی زبانیں سکھا دی تھیں۔ مگر فرق یہ ہے کہ ان کو جیسا کہ اعمال سے ظاہر ہوتا ہے یہودی قبائل کی زبانیں سکھائی گئی تھیں اور وہ ان کے بولنے میں غلطیاں بھی کرتے تھے لیکن مسیح موعود کو غیر ملک کی زبان سکھائی گئی تھی اور ایسے کامل طور پر سکھائی گئی تھی کہ خود اہل زبان باوجود بار بار چیلنج دینے کے مقابلہ پر نہیں آسکے۔

خدا تعالیٰ کے علیم ہونے کا ایک اور ثبوت جو حضرت مسیح موعود کے ذریعہ سے ظاہر ہوا۔ یہ مذہبی کانفرنس ہے جس کے لئے آج آپ لوگ جمع ہوئے ہیں آج سے چونتیس سال پہلے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو ایک کشف ہوا تھا جس میں ولایت میں آپ کے سلسلہ کی اشاعت کا ذکر تھا اس کشف کو آپ نے اپنی کتاب ازالہ اوہام میں جو ۱۸۹۱ء میں طبع ہوئی ہے شائع بھی کر دیا۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔

"مغرب کی طرف سے آفتاب کا چڑھنا یہ معنی رکھتا ہے کہ ممالک مغربی جو قدیم سے ظلمت کفر و ضلالت میں ہیں آفتابِ صداقت سے منور کئے جائیں گے اور ان کو اسلام سے حصہ ملے گا اور میں نے دیکھا کہ میں شہر لنڈن میں ایک ممبر پر کھڑا ہوں اور

انگریزی زبان میں ایک نہایت مدلّل بیان سے اسلام کی صداقت ظاہر کر رہا ہوں۔ بعد اس کے میں نے بہت سے پرندے پکڑے جو چھوٹے چھوٹے درختوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے رنگ سفید تھے اور شاید تیتر کے جسم کے موافق ان کا جسم ہو گا۔ سو میں نے اس کی یہ تعبیر کی کہ اگرچہ میں نہیں مگر میری تحریریں ان لوگوں میں پھیلیں گی اور بہت سے راستباز انگریز صداقت کا شکار ہو جائیں گے۔ درحقیقت آج تک مغربی ملکوں کی مناسبت دینی سچائیوں کے ساتھ بہت کم رہی ہے گویا خدا تعالیٰ نے دین کی عقل تمام ایشیا کو دیدی اور دنیا کی عقل تمام یورپ اور امریکہ کو۔ نبیوں کا سلسلہ بھی اول سے آخر تک ایشیا کے ہی حصہ میں رہا اور ولایت کے کمالات بھی انہی لوگوں کو ملے۔ اب خدا تعالیٰ ان لوگوں پر نظر رحمت ڈالنا چاہتا ہے۔" ☆☆ [۱۰۴]

مضمون صاف ہے اور مطلب واضح ہے خدا تعالیٰ نے آج سے چونتیس سال پہلے اطلاع دی کہ آپ یورپ میں جاکر اسلام کی تبلیغ کریں گے اور آپ کی تقریریں اشاعت اسلام کا موجب ہونگی اور آخر مغرب اسی طرح دین سے حصہ پائے گا جس طرح کہ آج وہ دنیا سے حصہ پا رہا ہے۔ بے شک اس خواب میں آپ نے اپنے آپ کو تقریر کرتے ہوئے دیکھا لیکن نبی سے مراد اس کی امت ہوتی ہے اور ان میں سے خاص طور پر اس کے خلفاء۔ پس اس خواب میں آپ کے یا آپ کے کسی خلیفہ کے انگلستان جاکر لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے کی خبر دی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ ایک سٹیج پر سے لوگوں کو احمدیت کی تبلیغ کی جائے گی اور اسلام کی دعوت دی جائے گی اور لوگ احمدیت کو قبول کریں گے اور خدا ان کو برکت دے گا۔ اے بھائیو اور بہنو! اس رؤیا کے پورا ہونے کو معمولی بات نہ سمجھو کیونکہ کسی چیز کی حقیقت اس کے پورے حالات کے معلوم ہونے سے ظاہر ہوتی ہے۔ ان حالات کو مدنظر رکھو جس وقت یہ خبر دی گئی تھی اور اس امر کو دیکھو کہ خبر دینے والا کون تھا؟

حالات تو یہ تھے کہ جس وقت یہ خبر دی گئی تھی اس وقت مسیحیت کا اس قدر غلبہ تھا کہ مسلمان مسیحیت سے بالکل مرعوب ہو چکے تھے۔ یورپ کے مصنف تو خیر لکھتے ہی تھے بعض مسلمان مصنف بھی یہ تسلیم کرنے لگ گئے تھے کہ اسلام مسیحیت سے سو سال کے عرصہ میں مغلوب ہو جائے گا۔ اور بعض لوگوں نے تو مذہبی ریفارم کے نام سے یہ تحریک شروع کر دی تھی کہ اسلام اور مسیحیت کی صلح کروا دی جائے اور یہ تسلیم کر لیا جائے کہ مسیحیت بھی سچی ہے اور اسلام

بھی سچا ہے اور دونوں میں تصادم نہیں ہونا چاہئے کیونکہ وہ ڈرتے تھے کہ اسلام مسیحیت کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔ اور بعض لوگوں نے یورپ کے سامنے ان مسائل کے متعلق جن کو یورپ قابلِ اعتراض سمجھتا تھا معذرت کرنی شروع کر دی تھی کہ اسلام کا وہ منشاء نہیں جو وہ خیال کرتے ہیں بلکہ اصل میں اسلام بھی وہی کہتا ہے جو وہ کہتے ہیں یا اس قسم کے عذر پیش کرنے شروع کر دیئے تھے کہ اسلام ایسے تاریک زمانہ میں آیا تھا جب عرب کی حالت نہایت نازک تھی اس لئے ان لوگوں کی تدریجی اصلاح کے لئے بعض احکام دیئے گئے تھے جو اصل مقصود نہ تھے۔ اب مسلمان علماء کی مجالس ان کو منسوخ کر دیں گی یا یہ کہنے لگے تھے کہ رسول کریم ﷺ عرب کے قومی خیالات کا لحاظ کر کے انہی کے اعتقادات کے مطابق کلام کرتے تھے اور اصل میں آپ کی مراد اس سے اور ہوتی تھی۔ غرض مسلمانوں نے اپنے عمل اور اپنے قول سے اس امر کو تسلیم کر لیا تھا کہ اب اسلام کی زندگی چند روزہ ہے اور وہ حملہ تو الگ رہا دفاع کی بھی طاقت اپنے اندر محسوس نہیں کرتے تھے اور ہتھیار رکھنے پر آمادہ تھے اور صرف اسی امر کے منتظر تھے کہ زیادہ اچھی شرائط پر مسیحیت سے انکی صلح ہو جائے اور ہمیں بالکل ہی وحشی نہ قرار دیا جائے۔

یہ تو قومی حالت تھی۔ خود پیشگوئی کرنے والے کا یہ حال تھا کہ اس کے ساتھ کوئی جماعت نہ تھی اس نے مسیحیت کا دعویٰ ابھی نیا نیا کیا تھا اور اس کی وجہ سے سب دنیا اس کی مخالف ہو گئی تھی۔ حکومت اس کی مخالف تھی' رعایا اس کے مخالف تھی' مسیحی اس کے مخالف تھے' ہندو اس کے مخالف تھے اور وہ قوم جس کے مذہب کی تائید کے لئے وہ کھڑا ہوا تھا وہ بھی اس کے مخالف تھی اور سب سے زیادہ مخالف تھی دعویٰ اس کا بالکل نرالا تھا مسلمان ایک خونی مہدی اور ایک آسمان سے آنے والے مسیح کے منتظر تھے اور وہ یہ پیش کرتا تھا کہ خونی مہدی نہیں بلکہ صلح کرنے والا مہدی مقرر ہے اور مہدی اور مسیح الگ الگ نہیں بلکہ ایک ہی شخص کے دو نام ہیں اور آسمان سے نہیں بلکہ اسی دنیا سے انہوں نے ظاہر ہونا ہے اور سب پر طُرّہ یہ کہ وہ کہتا تھا کہ وہ موعود میں ہی ہوں جسے علم' رتبہ' عزت کسی بات میں بھی دوسروں پر فضیلت نہیں۔ پھر غیر ممالک میں جانے آنے اور وہاں شہرت پانے کے لئے روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے اس کا حال یہ تھا کہ صرف چالیس پچاس آدمی اس کے ساتھ تھے جن میں سے سوائے دو کے جو کسی قدر آسودہ تھے باقی سب نہایت غریب اور شکستہ حالت کے آدمی تھے حتیٰ کہ ان کی ماہوار آمدنیاں پندرہ روپیہ سے بھی کم تھیں جن میں ان کو اپنی اور اپنے رشتہ داروں کی سب ضروریات پوری کرنی پڑتی

تھیں۔ ان چند غریبوں کی جماعت کے ساتھ وہ کھڑا ہوا اور مذکورہ بالا حالات میں وہ مغرب سے چھ ہزار میل کے فاصلہ پر ہندوستان میں سے جو انگریزوں کی حکومت میں شامل ہے اور اس وقت کے خیالات کے مطابق نہایت حقیر حیثیت میں تھا ایک ایسے صوبہ میں سے جو علمی حیثیت میں سب ہندوستان سے کم سمجھا جاتا ہے اور ساحل سمندر سے سینکڑوں میل کے فاصلے پر ہے اور ایک ایسے گاؤں میں سے جو ریل سے گیارہ میل کے فاصلہ پر ہے اور جہاں ڈاک بھی ہفتہ میں صرف دو بار آتی تھی اور سکول کا ایک مدرّس کچھ الاؤنس لے کر ڈاک کا کام کر دیتا تھا اور جس جگہ علم کی انتہائی منزل ورنیکلر پرائمری تھی کیونکہ اس سے زیادہ تعلیم دینے والا کوئی سکول وہاں موجود نہ تھا۔ یہ سب نقشہ اس وقت کی قادیان کا ہے جس وقت یہ پیشگوئی شائع کی گئی تھی اس نے یہ اعلان کیا کہ خدا میری تعلیم کو مغرب میں پہنچائے گا اور سٹیجوں پر سے مری تعلیم پڑھ کر سنائی جائے گی اور مغرب کے لوگ اس کی صداقت کو قبول کریں گے اور میرے سلسلہ میں داخل ہوں گے اور ایسا ہی ہوا۔ اس کا سلسلہ ترقی کرتا گیا اور مغرب تک جا پہنچا ہر قسم کے لوگ اس میں داخل ہوئے اور آخر مغرب کی صداقت پسند ارواح کو بھی اس نے اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔

مذہبی کانفرنس کی دعوت سب سلسلوں کے لئے تو ایک معمولی دعوت ہے جو ایسے موقع پر دی جاتی ہے کیونکہ آخر مذہبی کانفرنس نے بھی تو اپنی سٹیج کو رونق دینی تھی مگر ہمارے لئے اس کی حیثیت بالکل اور ہے کیونکہ اس دعوت نے اس کشف کو جو بالکل مخالف حالات میں شائع کیا گیا تھا پورا کر دیا ہے۔ کیونکہ اگر یہ سلسلہ ایک طبعی راہ اختیار کرتا تو آج یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ لندن کی ریلیجنز کانفرنس اس کو دعوت دیتی۔ اسے کبھی کا فنا ہو جانا چاہئے تھا مگر خدا نے اس کشف کے مطابق اسے بڑھایا اور آخر اسی طرح ہوا جس طرح کہا گیا تھا اور ثابت ہوا کہ خدا علیم ہے وہ ایسی باتیں بتاتا ہے جن کا علم انسان کو حاصل نہیں ہو سکتا اور اس وقت بتاتا ہے جب لوگ ان کو عقل کے خلاف سمجھتے ہیں۔

میں ان ثبوتوں میں سے جو آپ نے صفت علم کے ثبوت میں پیش کئے ایک اور ثبوت کے پیش کرنے سے نہیں رک سکتا کیونکہ وہ بھی یورپ سے تعلق رکھتا ہے اور اس کا نہایت گہرا اثر یورپ اور امریکہ پر آج تک چلا آتا ہے اور وہ آپ کی وہ پیشگوئی ہے جو جنگ یورپ اور زار روس کے انجام کے متعلق تھی۔ یہ پیشگوئی مختلف اوقات میں ٹکڑے ٹکڑے کرکے کی گئی ہے اور ۱۹۰۴ء سے ۱۹۰۸ء تک مکمل ہوئی ہے آپ فرماتے ہیں کہ مجھے خدا تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ

ایک شدید زلزلہ آنے والا ہے جس کی نسبت آپ لکھتے ہیں کہ ضروری نہیں کہ زلزلہ سے یہ مراد ہو کہ زمین ہلے گی بلکہ اس سے مراد کوئی ایسی آفت ہو سکتی ہے جس سے جانوں کا نقصان ہو گا اور مکانات گریں گے اور خون کی ندیاں بہیں گی اور لوگوں میں سخت گھبراہٹ پڑے گی۔[105]

پھر اس زلزلہ کی جو کیفیات آپ نے بتائی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ در حقیقت اس سے ایک جنگ عظیم مراد تھی کیونکہ آپ فرماتے ہیں مجھے بتایا گیا ہے کہ اس زلزلہ شدید کے وقت تمام دنیا میں گھبراہٹ پڑ جائے گی۔ مسافروں کے لئے وہ سخت تکلیف کا وقت ہو گا۔(یہ شرط صاف ظاہر کرتی ہے کہ جنگ مراد ہے کیونکہ زلزلہ کا اثر مسافروں پر کوئی خاص نہیں ہوتا) ندیاں خون سے سرخ ہو جائیں گی۔ یہ آفت یکدم اور اچانک آئے گی لوگوں کو اس کی پہلے سے کچھ خبر نہ ہو گی اس صدمہ سے جوان بوڑھے ہو جائیں گے پہاڑ اپنی جگہوں سے اڑا دیئے جائیں گے بہت سے لوگ صدمہ سے دیوانے ہو جائیں گے سب دنیا پر اس کا اثر ہو گا۔ زار روس کی حالت اس وقت نہایت ہی زار ہو گی تمام حکومتیں اس کے صدمہ سے کمزور ہو جائیں گی جنگی بیڑے تیار رکھے جائیں گے اور کثرت سے ادھر ادھر چکر لگائیں گے تا دشمنوں کے بیڑے ان کو ملیں اور وہ ان سے جنگ کریں زمین الٹا دی جائے گی خدا تعالیٰ اپنی فوجوں سمیت اترے گا تا ان لوگوں کو ان کے ظلموں کی سزا دے۔ اس مصیبت کا اثر پرندوں پر بھی پڑے گا۔ عرب بھی اس وقت اپنے قومی فوائد کو مدنظر رکھ کر جنگ کے لئے نکلیں گے۔ ترک شام کے میدان میں شکست کھائیں گے لیکن اپنی شکست کے بعد پھر اپنی ضائع شدہ طاقت کا ایک حصہ واپس لے لیں گے یہ زلزلہ جس وقت ظاہر ہو گا اس سے کچھ عرصہ پہلے اس کے آثار ظاہر ہونگے۔ مگر اللہ تعالیٰ اس کو روک کر کچھ سال پیچھے ڈال دے گا۔ مگر یہ آفت پیشگوئی کے شیوع (اشاعت۔ مرتب) کے سولہ سال کے عرصہ میں آئے گی اور پھر یہ کہ حضرت مسیح موعود کی وفات کے واقعہ ہونے کے بعد ہو گی۔

کس زور اور کس طاقت کے ساتھ یہ امور پورے ہوئے ہیں۔ وہ زلزلہ جس کی خبر دی گئی تھی۔ کیسی شدت کے ساتھ آیا اور اس نے کس طرح دنیا کو ہلا دیا؟ زلزلہ سے جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں زلزلہ ہی مراد نہ تھا یہ لفظ قرآن کریم میں جنگ کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے[106] اور بائیبل میں بھی جنگ کے لئے زلزلہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے[107] کس طرح اس کی تمام تفاصیل پوری ہوئیں؟ کس طرح اچانک یہ جنگ چھڑی؟ تمام دنیا اس کی لپیٹ میں آ گئی۔ ۱۹۰۵ء میں یہ پیشگوئی شائع کی گئی تھی پس پورے نو سال بعد جنگ شروع ہوئی اور رہوئی بھی حضور علیہ السلام کی

وفات کے بعد جو ۱۹۰۸ء میں واقع ہوئی ساری دنیا پر اس کا ایسا خطرناک اثر پڑا کہ کوئی اس کی زد سے نہیں بچا۔ جو حکومتیں اس جنگ میں شامل ہوئیں ان پر تو اس کا اثر ہونا ہی تھا۔ دوسری حکومتیں بھی اس کے اثر سے محفوظ نہیں رہیں۔ مسافروں کے لئے اس کا اثر ایسا سخت تھا کہ اس کا خیال کرنے سے دل کانپتا ہے جس وقت یہ جنگ شروع ہوئی ہے اس وقت لڑنے والی قوموں کے جو لوگ مخالف قوموں کے ملکوں میں تھے وہ جس جس مصیبت میں مبتلاء ہوئے ہیں اور جن جن مشکلات میں پڑ کر بھاگے ہیں یا آخر قید ہوئے ہیں وہ ایک دردناک قصہ ہے ہزاروں تھے جن کو سالوں تک اپنے رشتہ داروں کی اور ان کے رشتہ داروں کی اطلاع نہیں ملی کہ وہ کس حال میں ہیں۔ پہاڑ اس طرح اڑائے گئے جس طرح ٹیلے اڑائے جاتے ہیں فرانس کی بعض پہاڑیاں جو جنگ کے میدان میں تھیں قریباً برابر کر دی گئیں بارہا ایسی خونریزی ہوئی کہ عملاً خون کی ندیاں بہہ گئیں اور دریا سرخ ہو گئے کئی لوگ اس کے صدمہ سے قبل از وقت بوڑھے ہو گئے اور جیسا کہ کہا گیا تھا کہ بہت سے لوگ پاگل ہو گئے بلکہ پاگلوں کی تعداد اس قدر بڑھ گئی کہ SHELL SHOCK (جنگی جنون) ایک نئی بیماری قرار دی گئی۔ ہزاروں آدمی اس بیماری کا شکار ہوئے اور مہینوں بلکہ سالوں ناقابلِ کار ہو گئے۔ جنگی بیڑے اس کثرت سے چکر لگاتے پھرے کہ تا اپنا شکار تلاش کریں کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ زمین ایسی الٹائی گئی کہ اب تک فرانس اپنے تباہ شدہ علاقوں کو درست نہیں کر سکا پرندوں پر اس کا ایسا اثر پڑا کہ ان دنوں خبریں شائع ہوئی تھیں کہ شور اور گولہ باری کی وجہ سے پرندے ہوا میں اڑنے لگ جاتے اور بیٹھ نہیں سکتے تھے اور بہت سے پرندے تھک کر زمین پر گر جاتے اور مر جاتے تھے۔

اس جنگ کے آثار مطابق پیشگوئی ایک وقت پہلے ظاہر ہو کر رک گئے تھے۔ یعنی جولائی ۱۹۱۱ء میں جبکہ جرمن نے اپنا جہاز پینتھر مراکو کے بندر AGADIR (اغادیر) کی طرف بھیجا تھا کہ تا اس بندر پر قبضہ کرے۔ اگر انگریزی حکومت سختی سے دخل نہ دیتی اور بعض یورپین مدبّر یہ خیال کر لیتے کہ اس وقت ان کے ملک جنگ کے لئے تیار نہیں ہیں۔ تو یہ جنگ بجائے ۱۹۱۴ء کے ۱۹۱۱ء میں ہی واقع ہو جاتی۔

جیسا کہ بتایا گیا تھا عرب بھی اس جنگ میں اتحادیوں کے ساتھ شامل ہو گئے اور اپنے ملک کے مصالح کو مدنظر رکھ کر انہوں نے ترکوں سے علیحدگی کر لی۔ آخر بمطابق پیشگوئی جبکہ درّہ دانیال اور عراق میں تمام کوششیں ناکام رہیں حالانکہ یہی اصل محاذ جنگ سمجھے جاتے تھے مطابق پیشگوئی

ترکوں کو شام میں شکست ہوئی اور جنگ کا خاتمہ ہوا۔ مگر پھر ترکوں کو مصطفیٰ کمال پاشا کے ذریعہ قوت حاصل ہوئی اور جیسا کہ خبر دی گئی تھی انہوں نے اپنی گم شدہ عزت کا ایک حصہ واپس لیا۔

مگر سب سے زیادہ ہیبت ناک حصہ اس پیشگوئی کا وہ ہے جو زار روس کے متعلق ہے تمام بادشاہوں سے قطع نظر کر کے زار روس کی نسبت خبر دی گئی تھی اور بتایا گیا تھا کہ اس کی حالت زار ہوگی یعنی وہ صرف حکومت سے ہی علیحدہ نہیں کیا جائے بلکہ اور صدمہ بھی دیکھے گا یعنی نہ مرے گا اور نہ مارا جائے گا بلکہ زندہ رہے گا اور نہایت تکلیف دہ مصیبت میں مبتلاء رہے گا۔ کس طرح ایک ایک لفظ ایک ایک اشارہ اس پیشگوئی کا پورا ہوا ہے؟ پہلے اس کی حکومت گئی لیکن اس کی جان بچالی گئی پھر ایک اور تغیر اور تنگی کے ساتھ کچھ دے دے کر اس کو مارا گیا۔ اسکی بیوی اور لڑکیوں کی اس کے سامنے ہتک کی گئی جبکہ وہ بالکل بے بس اور بے طاقت تھا۔

جسم ان مصائب کا خیال کر کے جو زار کو پہنچے کانپ جاتا ہے اور بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں مگر ساتھ ہی اس خدائے علیم پر کس قدر یقین بڑھ جاتا ہے جس نے چودہ سال پہلے ان واقعات کی خبر دی تھی جب کہ ان واقعات میں سے بہتوں کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

کیا یہ واقعات اس امر کے ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں کہ اسلام کا خدا علیم خدا ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہو اسلام ہی وہ مذہب ہے جس کے ذریعہ سے علیم خدا کی معرفت حاصل ہو سکتی ہے اور وہی وہ مذہب ہے جس کے ذریعہ سے انسان خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا کر سکتا ہے۔

صفات الٰہیہ میں سے دوسری صفت جو ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر ہے اور جس پر اکثر مذاہب متفق ہیں وہ خلق کی صفت ہے۔ اکثر مذاہب دعویدار ہیں کہ وہ خدا جسے وہ پیش کرتے ہیں دنیا کا خالق ہے تمام انسان اور حیوان اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ ایک ایک ذرہ اسی کا بنایا ہوا ہے مگر وہ کیا ثبوت ہے جسے وہ اس امر کی تائید میں پیش کرتے ہیں یقیناً کوئی بھی نہیں۔ ان کے دعویٰ کی بناء صرف اس امر پر ہے کہ اگر خدا تعالیٰ دنیا کا خالق نہیں تو پھر اور کون ہے؟ مگر یہی دلیل دہریہ کے سامنے بھی موجود ہے وہ قوانین نیچر کا زیادہ گہرا واقف ہے کیونکہ اس کی دنیا اور اس کا دین صرف قوانین قدرت کا مطالعہ ہے وہ باوجود اس گہرے مطالعہ کے پھر اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ یہ سب کارخانہ قدرت آپ ہی آپ چل رہا ہے۔ تو جب وہ لوگ جو اپنی عمر کو قانون قدرت کے مطالعہ پر ہی خرچ کرتے ہیں اس کی رہنمائی سے فائدہ نہیں اٹھا سکے تو دوسرے لوگ اس سے کیا

نفع اٹھاسکتے ہیں اور اس پر کیا یقین کرسکتے ہیں؟ پھر یہ بھی تو دیکھنا چاہئے کہ زیادہ سے زیادہ جو بات اس قانون قدرت سے ہمیں معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ کوئی خدا اس دنیا کا خالق ہونا چاہئے مگر ہونا چاہئے ایک ظن ہے یہ استدلال ہمیں یقین کے مقام تک ہرگز نہیں پہنچا سکتا۔

ہم روزانہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ ایک بات جس کا سبب ہمیں معلوم نہیں ہوتا ہم عقل سے اس کا ایک سبب دریافت کرتے ہیں لیکن بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اصل سبب اور ہی ہے اور ہمارے خیالات بالکل غلط ثابت ہوجاتے ہیں۔ پس کیا یہ ممکن نہیں ہوسکتا کہ ہم چونکہ ابھی تک مادہ اور اس کی بناوٹ اور اس کی خصوصیات اور اس کے محرکاتِ عمل سے پوری طرح واقف نہیں اس لئے یہ خیال کرتے ہوں کہ اس کارخانہ عالم کے چلانے کے لئے علاوہ قوانین قدرت کے کوئی اور مدبر بھی ہونا چاہئے لیکن درحقیقت مادہ کی بعض خصوصیات اور اس کے محرکاتِ عمل ایسے ہوں جن کی وجہ سے وہ کسی بیرونی مدبر کا محتاج نہ ہو بلکہ خود بخود ہی سب کام کرسکتا ہو؟ پس جب ایسے احتمالات موجود ہیں تو یہ دلیل ہمیں کب تسلی دے سکتی ہے؟ تسلی وہی دلیل دے سکتی ہے جو ہونا چاہئے کے مقام سے بلند کرکے ہمیں ہے کے مقام تک پہنچادے اور شک و شبہ کا احتمال مٹادے اور یہ اسی طرح ہوسکتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی صفت خلق کا ہم اپنی آنکھوں سے مطالعہ کرلیں اور خود دیکھ لیں کہ وہ پیدا کرتا ہے۔ مگر یہ یقین ہمیں کوئی مذہب دلانے کے لئے تیار نہیں سوائے حضرت مسیح موعود کے جو ہمیں اس یقین کے مقام تک پہنچاتے ہیں اور اس عرفان سے ہمیں حصہ دیتے ہیں آپ ہمیں یہ نہیں کہتے کہ مان لو کہ کوئی خدا ہے اور وہ خالق ہے بلکہ یہ فرماتے ہیں کہ آؤ میں تمہیں خدا تعالیٰ پیدا کرتا ہوا دکھادوں اور اس امر کا یقین دلادوں کہ نیچر نہیں بلکہ نیچر کا پیدا کرنے والا خدا پیدا کرتا ہے اس قسم کے ثبوت جو آپ نے دیئے ہیں گو بہت سے ہیں مگر مثال کے طور پر میں دو تین پیش کردیتا ہوں۔

یاد رکھنا چاہئے کہ کسی شخص کے کسی کام کا سبب ہونے کا مکمل ثبوت تبھی مل سکتا ہے جب ہم اس کی طاقت کا دو طرح نمونہ دیکھیں ایک تو یہ کہ جب وہ چاہے تو وہ کام ہوجائے اور دوسرے یہ کہ جب وہ نہ چاہے تو نہ ہو۔ اگر صرف ایک پہلو ظاہر ہو۔ یعنی جب وہ چاہے تب وہ کام ہوجائے تب بھی ہمارے دل میں یہ شبہ پیدا ہوسکتا ہے کہ شاید اس کام کے مدبّر ایک سے زیادہ ہوں اور وہ بھی اسی طرح اس کام کو کرسکتے ہوں۔ پس جب ہم کہتے ہیں کہ یہ کام صرف فلاں شخص کرسکتا ہے تو ہمیں دو قسم کے ثبوت دینے چاہئیں۔ ایک تو یہ کہ ہم ثابت کریں کہ اس کام کے کرنے پر وہ

قادر ہے اور دوسرے یہ کہ جب وہ اس کام کو نہ کرے تو وہ کام نہیں ہوگا۔ اس ثبوت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے میں خدا تعالیٰ کے خالق ہونے کے ثبوت میں اثبات اور نفی کے جو ثبوت حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے پیش کئے ہیں پیش کرتا ہوں۔

پہلے میں اس امر کا ثبوت پیش کرتا ہوں کہ آپ نے کون سے ایسے نشانات دکھلائے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خدا خالق ہے؟ اور میں سب سے پہلے اس کے متعلق ایک صاحب کا اپنا بیان جو کتاب "سیرۃ المہدی" میں شائع ہوا ہے پیش کرتا ہوں۔ ان صاحب کا نام عطا محمد ہے اور یہ پٹواری کا کام کرتے ہیں وہ بیان کرتے ہیں۔

"جب میں غیر احمدی تھا اور ونجواں ضلع گورداسپور میں پٹواری ہوتا تھا تو قاضی نعمت اللہ صاحب خطیب بٹالوی جن کے ساتھ میرا ملنا جلنا تھا مجھے حضرت صاحب کے متعلق بہت تبلیغ کیا کرتے تھے مگر میں پروا نہیں کرتا تھا ایک دن انہوں نے مجھے بہت تنگ کیا میں نے کہا اچھا میں تمہارے مرزا کو خط لکھ کر ایک بات کے متعلق دعا کراتا ہوں اگر وہ کام ہو گیا تو میں سمجھ لوں گا کہ وہ سچے ہیں۔

چنانچہ میں نے حضرت صاحب کو خط لکھا کہ آپ مسیح موعود اور ولی اللہ ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں اور ولیوں کی دعائیں سنی جاتی ہیں۔ آپ میرے لئے دعا کریں کہ خدا مجھے خوبصورت صاحب اقبال لڑکا جس بیوی سے میں چاہوں عطا کرے اور نیچے میں نے لکھ دیا کہ میری تین بیویاں ہیں مگر کئی سال ہو گئے آج تک کسی کے اولاد نہیں ہوئی میں چاہتا ہوں کہ بڑی بیوی کے بطن سے لڑکا ہو (انکا منشاء یہ تھا کہ چونکہ وہ زیادہ عمر رسیدہ تھی اس لئے اس کے ہاں لڑکا ہونا اور بھی مشکل ہو گا) حضرت صاحب کی طرف سے مجھے مولوی عبد الکریم صاحب مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط گیا۔ (مولوی صاحب مرحوم جو جماعت احمدیہ کے عمائد میں سے تھے حضرت کے صیغہ ڈاک کے افسر تھے) کہ مولیٰ کے حضور دعا کی گئی ہے اللہ تعالیٰ آپ کو فرزند ارجمند صاحب اقبال خوبصورت لڑکا جس بیوی سے آپ چاہتے ہیں عطا کرے گا۔ مگر شرط یہ ہے کہ آپ زکریاؑ والی توبہ کریں۔

منشی عطا محمد صاحب بیان کرتے ہیں کہ میں ان دنوں سخت بے دین اور شرابی کبابی راشی مرتشی ہوتا تھا چنانچہ میں نے جب مسجد میں جاکر ملّاں سے پوچھا کہ زکریا والی توبہ

کیسی تھی؟ تو لوگوں نے تعجب کیا کہ یہ شیطان مسجد میں کس طرح آگیا ہے۔ مگر وہ ملّاں مجھے جواب نہ دے سکا پھر میں نے دھرم کوٹ کے مولوی فتح دین صاحب مرحوم احمدی سے پوچھا انہوں نے کہا کہ ذکریا والی توبہ بس یہی ہے کہ بے دینی چھوڑ دو' حلال کھاؤ' نماز روزہ کے پابند ہو جاؤ اور مسجد میں زیادہ آیا جایا کرو۔ یہ سن کر میں نے ایسا کرنا شروع کر دیا۔ شراب وغیرہ چھوڑ دی' رشوت بھی بالکل ترک کر دی اور صلوٰۃ و صوم کا پابند ہو گیا۔

چار پانچ ماہ کا عرصہ گذرا ہو گا کہ میں ایک دن گھر گیا تو اپنی بڑی بیوی کو روتے ہوئے پایا۔ سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ پہلے مجھ پر یہ مصیبت تھی کہ میرے اولاد نہیں ہوتی تھی آپ نے میرے پر دو بیویاں کیں لیکن اب یہ مصیبت آئی ہے کہ میرے حیض آنا بند ہو گیا ہے (گویا اولاد کی کوئی امید ہی نہیں رہی) ان دنوں میں اس کا بھائی امرتسر میں تھانیدار تھا۔ چنانچہ اس نے مجھے کہا کہ مجھے میرے بھائی کے پاس بھیج دو کہ میں کچھ علاج کرواؤں میں نے کہا وہاں کیا جاؤ گی یہیں دائی کو بُلوا کر دکھلاؤ اور اس کا علاج کرواؤ۔

چنانچہ اس نے دائی کو بُلوایا اور کہا کہ مجھے کچھ دوا وغیرہ دو۔ دائی نے سرسری دیکھ کر کہا۔ میں تو دوا نہیں دیتی نہ ہاتھ لگاتی ہوں مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا تیرے اندر بھول گیا ہے (یعنی تو تو بانجھ تھی مگر اب تیرے پیٹ میں بچہ معلوم ہوتا ہے پس خدا نے تجھے (نَعُوْذُ بِاللہ) بھول کر حمل کروا دیا ہے۔ مؤلف سیرۃ) اور اس نے گھر سے باہر آکر بھی یہی کہنا شروع کیا کہ خدا بھول گیا ہے مگر میں نے اسے کہا کہ ایسا نہ کہو بلکہ میں نے مرزا صاحب سے دعا کروائی تھی۔

"پھر منشی صاحب بیان کرتے ہیں کہ کچھ عرصہ میں حمل کے پورے آثار ظاہر ہو گئے اور میں نے ارد گرد سب کو کہنا شروع کیا کہ اب دیکھ لینا کہ میرے لڑکا پیدا ہو گا اور ہو گا بھی خوبصورت۔ مگر لوگ بڑا تعجب کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر ایسا ہو گیا تو واقعی بڑی کرامت ہے۔ آخر ایک دن رات کے وقت لڑکا پیدا ہوا اور خوبصورت ہوا۔ میں اسی وقت دھرم کوٹ بگّا گیا جہاں میرے کئی رشتہ دار تھے اور لوگوں کو اس کی پیدائش سے اطلاع دی چنانچہ کئی لوگ اسی وقت بیعت کے لئے قادیان روانہ ہو گئے۔

مگر بعض نہیں گئے اور پھر اس واقعہ پر دنجواں کے بھی بہت سے لوگوں نے بیعت کی اور میں نے بھی بیعت کر لی اور لڑکے کا نام عبدالحق رکھا۔ منشی صاحب بیان کرتے ہیں کہ میری شادی کو بارہ سال سے زائد ہو گئے تھے اور کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی"۔ [۱۰۸]

یہ واقعہ کیسا بیّن اور واضح ہے اور کس طرح روز روشن کی طرح اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمارا خدا ایک زندہ خدا ہے اور وہ خالق ہے۔ اگر کوئی خدا نہیں یا وہ خالق نہیں تو کس طرح ایک ایسے شخص کے ہاں جو بانجھ تھا جس نے تین بیویاں بارہ سال کے عرصہ میں کیں کہ اس کے ہاں اولاد ہو مگر ایک کے ہاں بھی اس عرصہ میں اولاد نہ ہوئی۔ مرزا صاحب کی دعا سے اولاد ہو گئی پھر ان شرائط کے ساتھ ہوئی جو سوال کرنے والے نے کئے تھے یعنی اس عورت سے ہوئی جو سب سے مُعَمّرَہ تھی اور ہوا بھی لڑکا اور ہوا بھی خوبصورت۔ اگر کوئی خدا نہیں اور اگر وہ خالق نہیں تو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی دعا سے یہ سب کچھ کس طرح ہوا؟ اور اس نشان کی عظمت اور شان اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ سائل کو قبل از وقت لکھ دیا گیا تھا کہ اس کی طلب کردہ شرطوں کے ساتھ اس کے ہاں اولاد ہو جائے گی۔

پھر اس واقعہ کی عظمت اس اثر سے معلوم ہوتی ہے کہ جو ان لوگوں پر ہوا جنہوں نے اس کو دیکھا اور اس وقت ہوا جب وہ امر واقع ہوا۔ اور اس واقعہ کا اثر جیسا کہ لکھا گیا ہے یہ ہوا کہ اس شخص نے بھی بیعت کر لی اور اس کے دوسرے بہت سے رشتہ دار اسی وقت رات کے وقت ہی اٹھ کر بیعت کرنے کے لئے قادیان چل پڑے اور اس گاؤں کے دوسرے لوگوں نے بھی بیعت کر لی۔ وہ شخص اور وہ لڑکا اور بہت سے لوگ جنہوں نے اس واقعہ کو دیکھا تھا اب تک بفضلہٖ تعالیٰ زندہ موجود ہیں اور ہر ایک شخص جو تحقیق کرنی چاہے ان سے پوچھ سکتا ہے۔

اس واقعہ کے علاوہ اور بہت سے اس قسم کے واقعات ہیں کہ بے اولادوں کو آپ کی دعا سے اولاد ہو گئی۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کی مثالوں میں سے یہی ایک کافی ہے ورنہ اصل میں تو حضرت مسیح موعود کا ہر ایک بچہ خواہ لڑکا ہو خواہ لڑکی پیشگوئی کے ماتحت ہوا ہے اور اور بہت سے لوگوں کو بھی آپ کی دعا سے اولاد عطا ہوئی ہے۔

اولاد کے بارے میں جو خَلق الٰہی پر ایک معتبر اور یقینی شہادت ہے میں خَلق کی قسم کا ایک اور معجزہ آپ کا پیش کرتا ہوں یہ معجزہ اس طرح ظاہر ہوا کہ آپ نے رؤیا میں دیکھا کہ آپ نے کچھ امور قضاء و قدر کے اہل دنیا کی نیکی بدی کے متعلق اپنے لئے اور اپنے دوستوں کے متعلق لکھے

اور خواہش کی کہ خدا تعالیٰ ان امور کو اسی طرح ظاہر کرے۔ پھر آپ نے خدا تعالیٰ کو متمثّل دیکھا اور وہ کاغذ اس کے سامنے رکھ دیا کہ تا وہ اس پر دستخط کردے۔ خدا تعالیٰ نے اس پر سرخ سیاہی سے دستخط کر دیئے۔ دستخط کرتے وقت قلم کی نوک پر جو سرخی زیادہ تھی اس کو اس نے جھاڑا اور اس کے چھینٹے آپ کے کپڑوں پر پڑے۔ اس وقت اس خیال سے کہ اللہ تعالیٰ نے میری باتوں کو مان کر ان پر دستخط کر دیئے ہیں آپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور آپ جاگ اٹھے۔ اس پر ایک شخص میاں عبداللہ صاحب نے جو اس وقت آپ کے پاؤں دبا رہے تھے آپ کو آپ کے کپڑوں پر سرخ نشان دکھائے جو تازہ سرخ سیاہی کے تھے اور پوچھا کہ ابھی دباتے ہوئے میں نے یہ سرخی جو ابھی تازہ ہے کیونکہ ایک قطرہ کو میں نے ہاتھ لگا کر دیکھا تو وہ گیلی تھی دیکھی ہے یہ کیا امر ہے؟ کیا آپ نے کچھ دیکھا ہے؟ اس پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ان کو وہ کشف سنایا۔

یہ قطرے آپ کے کُرتے پر اور مولوی عبداللہ صاحب گرد اور ریاست پٹیالہ جو اس وقت آپ کو دبا رہے تھے کی ٹوپی پر پڑے تھے۔ چنانچہ اس نشان کی یاد میں مولوی عبداللہ صاحب نے وہ کُرتہ مسیح موعود سے لے لیا تا کہ اس نشان کی یادگار کے طور پر رہے اور آپ نے اس شرط پر ان کو دیا کہ وہ اپنی وفات کے وقت اس کو اپنے ساتھ ہی دفن کرنے کی وصیت کر جائیں تا بعد میں اس کے ذریعہ سے شرک نہ پھیلے۔ میں نے مولوی عبداللہ صاحب سے جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے ابھی تک زندہ ہیں پوچھا ہے کہ آیا سیاہی وغیرہ کے گرنے کا وہاں کوئی ظاہری امکان بھی تھا۔ مگر وہ بیان کرتے ہیں کہ اس کمرہ کی چھت بھی صاف تھی اور میں نے اس خیال سے کہ کہیں چھپکلی کی دم کٹ کر اس کے خون کے قطرے نہ گرے ہوں اسی وقت اوپر دیکھا بھی تھا مگر مجھے اوپر کوئی نشان نہیں ملا اور نہ چھت ایسی تھی کہ اس پر اس قسم کی کوئی صورت پیدا ہو سکتی تھی اور انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اس کمرہ میں بھی کوئی اور چیز نہ تھی نہ دوات نہ کوئی اور چیز۔ مولوی عبداللہ صاحب جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں اب تک زندہ ہیں اور اس کُرتے کو انہوں نے اب تک سنبھال کر رکھا ہوا ہے اور حلفی طور پر اس واقعہ کی گواہی دیتے ہیں۔ [۱۰۹]

یاد رکھنا چاہئے کہ ہم لوگوں کا ہرگز یہ عقیدہ نہیں کہ خدا تعالیٰ کی واقع میں کوئی شکل ہے۔ یا یہ کہ وہ بھی دستخط کرتا ہے یا قلم اور سیاہی استعمال کرتا ہے یا یہ کہ کُرتے پر جو نشان پڑے تھے وہ فی الواقع اس سیاہی کے داغ تھے جو اللہ تعالیٰ نے استعمال کی بلکہ ہم تو جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے خدا تعالیٰ کو بے مثل مانتے ہیں اور تمثّل اور حلول سے پاک سمجھتے ہیں ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ جو کچھ

آپ نے دیکھا وہ ایک کشف تھا خدا تعالیٰ کی صورت جو دکھائی گئی وہ تصویری زبان میں اس تعلق کا تَجَسُّمْ تھا جو خدا تعالیٰ کو آپ سے تھا اور دستخط وغیرہ سے بھی یہی مراد تھی کہ آپ کا مدعا اور آپ کی خواہشات خدا تعالیٰ پوری کرے گا۔ اور سیاہی جو آپ کے کپڑوں پر گری بلکہ اس شخص پر بھی گری جو آپ کے پاس بیٹھا ہوا تھا وہ بھی واقع میں خدا تعالیٰ کے قلم کی سیاہی نہ تھی کیونکہ خدا تعالیٰ تو نہ قلم استعمال کرتا ہے نہ سیاہی بلکہ وہ رنگ خدا تعالیٰ نے اپنی صفت خلق کے ساتھ خارج میں پیدا کرکے گرا دیا تھا تا وہ آپ کے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی ایک نشان ہو اور خدا تعالیٰ کی صفت خلق پر یقین کیا جاسکے اور لوگ سمجھ سکیں کہ اللہ تعالیٰ بلا ظاہری سامانوں کے اشیاء کو پیدا کر سکتا ہے اور اس کی صفت خلق آج بھی اسی طرح اپنا کام کر رہی ہے اور کر سکتی ہے جس طرح کہ ابتدائے پیدائش میں وہ کام کرتی تھی۔

اب میں ایک نشان آپ کا ایسا پیش کرتا ہوں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح خدا پیدا کرتا ہے اسی طرح جب وہ یہ حکم دیدے کہ یہ امر نہ ہو تو وہ نہیں ہو سکتا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صفت خلق کُلّی طور پر اللہ تعالیٰ میں ہی پائی جاتی ہے اور اس کے کسی غیر کو اس میں دخل نہیں ہے کیونکہ اگر غیر کو بھی حصہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ کے باوجود کہ فلاں کام نہ ہو ان ہستیوں کے ذریعہ سے وہ کام ہو سکتا تھا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ آپ کا ایک دشمن سعد اللہ نامی تھا جو لدھیانہ کے مشن سکول میں مدرّس تھا سخت بدگو تھا۔ ہمیشہ آپ کے خلاف نظمیں اور مضمون شائع کرتا رہتا تھا اور ان میں ایسی گندی گالیاں دیتا تھا کہ میں نہیں جانتا کہ شرفاء ان گالیوں کو خیال میں بھی لا سکتے ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام خود اس کی نسبت فرماتے ہیں کہ شاید اور کسی شخص نے کسی نبی کو اس قدر گالیاں نہ دی ہونگی۔ جس قدر کہ اس شخص نے مجھے گالیاں دی تھیں انہی گالیوں کے ساتھ یہ شخص یہ بھی شائع کرتا رہتا تھا کہ چونکہ مرزا صاحب نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذَالِکَ جھوٹے ہیں اس لئے وہ تباہ ہو جائیں گے اور اپنی اولاد کی نسبت جو خبریں شائع کرتے ہیں وہ بھی پوری نہ ہونگی اور وہ نامراد ہی رہیں گے۔ جب اس شخص کی گالیاں حد سے بڑھ گئیں اور بہتوں کے لئے یہ شخص ٹھوکر کا موجب ہوا تو حضرت مسیح موعود نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ خدایا اس شخص کے لئے کوئی نشان ظاہر کر۔

چنانچہ خدا تعالیٰ نے آپ کی دعا سن لی اور چونکہ یہ شخص ہدایت سے دور ہو چکا تھا اور خود

اپنے لئے خدا کی رحمت کا دروازہ بند کر رہا تھا اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرمایا کہ یہ اسی تلوار سے مارا جائے جو یہ مسیح موعود کے خلاف چلاتا ہے اور اس نے آپ کو وحی کی اِنَّ شَانِئَکَ ھُوَ الْاَبْتَرُ[۱] تیرا دشمن جو تیری نسبت کہتا ہے کہ تیری نسل قطع ہو جائیگی اس کی نسل قطع ہو گی اور وہ بے نسل رہ جائے گا۔

اب یہ عجیب بات ہے کہ جب یہ الہام آپ کو ہوا تو اُس وقت اس شخص کے ہاں ایک لڑکا پہلے سے موجود تھا جس کی عمر چودہ سال کے قریب تھی اور یہ مولوی ابھی جوان ہی تھا اور اولاد کا سلسلہ آئندہ منقطع ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ مگر اس نے جو خالق ہے اس الہام کے بعد اس شخص سے اپنی صفت خلق کا سایہ ہٹالیا اور باوجود اس کے کہ اس شخص کی عمر ابھی تھوڑی ہی تھی اس کی نسل کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور گو وہ اس پیشگوئی کے بعد چودہ سال تک زندہ رہا مگر اس کے ہاں اولاد نہ ہوئی اور آخر جنوری ۱۹۰۷ء میں اس پیشگوئی کو سچا کرتا ہوا مر گیا۔

اگر نشان اس حد تک ہی رہتا تو بھی ایک بہت بڑا ثبوت خدا تعالیٰ کی خالقیت کا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اس نشان کو اور بھی زیادہ کیا اور وہ یہ کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے دشمنوں نے یہ دیکھ کر کہ آپ کا ایک نشان ظاہر ہو گیا۔ایک طرف تو شور مچانا شروع کیا کہ مرزا صاحب نے تو کہا تھا کہ سعد اللہ ابتر رہے گا لیکن اس کے تو ایک لڑکا موجود ہے اور دوسری طرف اس لڑکے کی شادی کی کوششیں شروع کر دیں تاکہ اس کی اولاد ہو جائے اور مرزا صاحب پر جھوٹ کا الزام آئے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ان حملوں کے جواب میں اپنی کتاب حقیقۃالوحی میں لکھا کہ یہ لڑکا تو پیشگوئی سے پہلے ہی موجود تھا پس یہ لڑکا تو پیشگوئی کے خلاف نہیں ہو سکتا ہاں اگر اس کی اولاد ہو جائے تو بے شک اعتراض پڑ سکتا ہے مگر یہ یاد رکھو کہ اس کے ہاں اولاد نہ ہو گی اور سعد اللہ ضرور منقطع النسل ہو کر رہے گا چنانچہ آخر اسی طرح ہوا۔یعنی گو مولوی سعد اللہ کے لڑکے کی شادی کر دی گئی لیکن اس کے اولاد نہ ہوئی آخر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے دشمنوں نے آپ کو جھوٹا ثابت کرنے کے لئے اس کی ایک اور شادی کر دی کہ شاید اس سے اولاد ہو مگر باوجود اس کے بھی آج تک اس کے کوئی لڑکا نہیں ہوا۔

ایک جوان آدمی کی نسبت یہ لکھنا کہ اس کے اولاد نہ ہو گی ایک ایسا بڑا معاملہ ہے کہ انسان کی طبیعت اس کا خیال کر کے بھی گھبراتی ہے چنانچہ جب آپ نے اپنی کتاب میں یہ لکھا تو آپ کا ایک مرید جو وکیل تھا اور جس کا ایمان بوجہ کمی بصیرت کے کمزور تھا اور آپ کی وفات کے بعد اسی

طرح ٹھوکر کھا گیا جس طرح بعض مسیح ناصری کے حواریوں نے ٹھوکر کھائی تھی اس پر سخت معترض ہوا کہ ایسا آپ کیوں لکھتے ہیں؟ اگر اس کے اولاد ہو گی تو سخت مشکل ہو گی اور لوگوں میں بدنامی ہو گی اور شاید کوئی مقدمہ بھی دشمن کھڑا کر دے۔ مگر آپ نے اس کو یہی جواب دیا کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ مجھے بتاتا ہے میں اس سے کیونکر منہ پھیر سکتا ہوں اور اس میں شک لا سکتا ہوں۔ تمہارا یہ اعتراض قلّتِ ایمان کا نتیجہ ہے اور کچھ بھی نہیں چنانچہ ایسا ہی ثابت ہوا۔

اب دیکھو اگر وہ لڑکا بچپن میں مرجاتا تو شاید کوئی کہہ دیتا کہ یہ اتفاق تھا مگر پیشگوئی کے بعد پہلے تو باپ کی پندرہ سال تک اولاد بند رہی اور پھر جو لڑکا موجود تھا اس کی دو دفعہ شادی کی گئی مگر اولاد اس کے بھی پیدا نہ ہوئی۔ اگر خالقِ خدا نے ہی یہ فیصلہ نہ کیا ہو تا کہ دشمن کے منہ پر اس کی بد زبانی ماری جائے اور سرکش کو اس کے کئے کی سزا دی جائے تو یہ کس طرح ممکن تھا۔ اس نشان کو دیکھ کر اور بے تعصبی سے غور کر کے کون ہے جو یہ کہہ سکے کہ اسلام کا خدا ایسا ہی خالق نہیں ہے جیسا کہ وہ ابتدائے آفرینش میں تھا؟ کیونکہ کیا ایسا نہیں ہوا کہ اس نے کہا کہ فلاں کے اولاد ہو اور اس کے اولاد ہو گئی اور اس نے کہا کہ فلاں کے اولاد نہ ہو اور اس کے اولاد نہ ہوئی۔ پھر کون ہے جو اس نشان کو دیکھ کر تازہ ایمان نہ حاصل کرے اور اس کا دل یقین اور انشراح سے بھر نہ جائے؟ اور وہ "کوئی خالق ہونا چاہئے" کے شک اور گمان کے مقام سے بلند ہو کر "دنیا کا ایک خالق ہے" کے وثوق اور اطمینان کے مرتبہ تک نہ پہنچ جائے۔ فَسُبْحَانَ اللّٰہِ اَحْسَنَ الْخَالِقِیْنَ

اب میں اللہ تعالیٰ کی ایک تیسری صفت کو لیتا ہوں جو مذکورہ صفات کی طرح مشہور صفت ہے اور جس سے چھوٹے بڑے سب واقف ہیں۔ یعنی صفتِ شفا۔ اس صفت پر تو لوگوں کو ایسا یقین ہے کہ کئی مذاہب کے پیروؤں کا دعویٰ ہے کہ وہ اس صفت کا نمونہ دکھا سکتے ہیں چنانچہ بہت سے لوگ دعا سے مریضوں کا علاج کرنے کی طرف متوجہ ہیں۔ مگر ہر شخص جو عقل سے کام لے سمجھ سکتا ہے کہ یہ کام دعا یا خدا کی خاص تقدیر سے بالکل تعلق نہیں رکھتا کیونکہ اس قسم کی شفا کسی خاص مذہب کے لوگوں سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ ایسے لوگ جو اس طرح شفا دیتے ہیں مسیحیوں میں بھی پائے جاتے ہیں ہندوؤں میں بھی یہودیوں میں بھی اور زرتشتیوں میں بھی۔ پس یہ امر کسی مذہب کی صداقت کا ثبوت کس طرح کہلا سکتا ہے؟ اور کس طرح تعلق باللہ کا نشان سمجھا جا سکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ اگر یہ تعلق باللہ کی علامت ہے تو ہم ان لوگوں سے دریافت کرنے کا حق رکھتے ہیں کہ کیا وجہ ہے کہ صفت شافی تو ان کی دعا کی وجہ سے حرکت میں آتی ہے اور مریض کو شفا بخشتی ہے مگر خدا تعالیٰ کی باقی صفات ان کی دعا کے ذریعہ سے جوش میں نہیں آتیں؟ نہ خلق کی نہ علم کی نہ احیاء کی نہ حفاظت کی نہ اور دوسری صفات۔ جو لوگ کہ صفات الٰہیہ کے ظہور کے بالکل ہی منکر ہیں وہ تو خیر جواب دے بھی سکتے ہیں کہ خدا کی صفات ظاہر نہیں ہوتیں۔ لیکن جو شخص کہ ایک صفت کے متعلق دعویٰ کرتا ہے کہ میری دعا اور توجہ سے وہ ظاہر ہوتی ہے اس پر واجب ہے کہ وہ اس سوال کا بھی جواب دے کہ پھر باقی صفات کا اظہار خدا تعالیٰ کیوں نہیں کرتا؟

اصل بات یہ ہے کہ علاوہ دعا اور اس کی قبولیت کے انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایک طبعی مادہ رکھا ہے کہ اس کی توجہ کا ایک مخفی اثر دوسرے انسان پر ہوتا ہے اور اس کے خیالات کی لہر اس کے معمول کے اندر جا کر اس کے اعصاب پر قبضہ پا لیتی ہے اور اس کے خیالات کو اپنے خیالات کے مطابق کر لیتی ہے اور جب معمول کے خیالات عامل کے خیالات کے مطابق ہو جاتے ہیں تو پھر ان خیالات کے اثر کے نیچے اس کے اندر ایک اچھی یا بری تبدیلی شروع ہو جاتی ہے جو عامل نے معمول کے اندر پیدا کرنی چاہی تھی مگر یہ اثرات قریباً قریباً اعصابی دَور تک ہی محدود ہیں۔ مثلاً یہ تو ہو جائے گا کہ ایک شخص کی توجہ سے کسی کا بخار ٹوٹ جائے یا آنکھ کی سرخی جاتی رہے یا سر درد دور ہو جائے مگر مثلاً یہ نہیں ہو گا کہ آتشک یا کوڑھ یا سِل وغیرہ کی بیماریاں دور ہو جائیں یہ طاقت مشق کرنے سے بہت بڑھ جاتی ہے اور یہ شرط نہیں ہے کہ ضرور مقررہ قواعد کے ساتھ ہاتھ پھیرنے یا Suggestion (تجویز دینے سے ہی ایسے نتائج نکلیں۔ اصل امر تو توجہ کا قیام ہے۔ اگر توجہ کا قیام اور احساسات کا اجتماع کسی خاص امر کے متعلق ہو جائے تو خواہ دعا کے ہی رنگ میں ہو اس کا اثر ہو جاتا ہے۔ ہر اک شخص جو اس طرف توجہ کرے تھوڑی سی کوشش سے اس میں ترقی کر سکتا ہے بلکہ جو لوگ شراب اور سؤر کا استعمال کرتے ہیں وہ تو بہت ہی جلد اس علم کے ماہر ہو سکتے ہیں۔ مگر اس علم میں انسان خواہ کس قدر بھی ترقی کر جائے اسے روحانیت کی ترقی نہیں کہہ سکتے نہ خدا تعالیٰ کا کوئی غیر معمولی نشان قرار دیں گے۔ ہاں یہ کہیں گے کہ فلاں شخص نے خدا تعالیٰ کے بنائے ہوئے ایک قدرت کے قانون سے فائدہ اٹھایا ہے۔

خلاصہ یہ کہ آج کل جو لوگ شفا کے اس قسم کے شُعبدے دکھاتے ہیں وہ ہرگز خدا کے نشانات نہیں کہلا سکتے اور نہ وہ کسی خاص مذہب سے مخصوص ہیں مگر جو نشانات خدا تعالیٰ کی صفت

شافی ہونے کے ثبوت میں حضرت مسیح موعود نے دکھائے ہیں وہ بے شک ایسے ہیں کہ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا ہے اور اس میں شفا دینے کی طاقت ہے چنانچہ مثال کے طور پر میں آپ کا ایک نشان پیش کرتا ہوں۔

جب آپ کے سلسلہ کی ترقی شروع ہوئی تو آئندہ نسلوں کو احمدی خیالات میں رنگین کرنے کے لئے اور ان کے اندر ملی جذبہ پیدا کرنے کے لئے حضرت مسیح موعود نے قادیان میں ایک ہائی سکول اپنی جماعت کی طرف سے جاری کیا۔ اس اسکول میں احمدی جماعت کے طالب علم بہت دور دور کے علاقوں سے آتے تھے تاکہ دنیاوی تعلیم کے علاوہ دینی تعلیم بھی پائیں۔ ان طالب علموں میں جو دور سے آئے ہوئے تھے ایک لڑکا عبدالکریم نامی ریاست حیدر آباد کے ایک گاؤں کا رہنے والا تھا اس لڑکے کو اتفاقاً دیوانے کتے نے کاٹ کھایا اور اس کو علاج کے لئے کسولی بھیج دیا گیا جہاں کہ پیٹیور انسٹی ٹیوٹ کی ایک شاخ ہے۔ لڑکا علاج کرا کے واپس آگیا اور یہ سمجھ لیا گیا کہ وہ خطرہ سے باہر ہوگیا ہے مگر قادیان میں واپس آتے ہی اسے دیوانگی کا دورہ ہوگیا اور نہایت سخت تکلیف میں جو اس بیماری کا خاصہ ہے وہ مبتلاء ہوگیا۔ گلے کے تشنج اور خوف کی زیادتی اور نیند کے اڑ جانے اور جنون کے دوروں کی وجہ سے جن میں اس کا دل تیمارداروں کو مارنے کو اور کاٹنے کو چاہتا تھا اور جس پر وہ بعد میں اس قدر پشیمان ہوتا کہ تیمارداروں کو کہتا کہ وہ اسے چھوڑ کر چلے جائیں تا وہ ان کو کوئی نقصان نہ پہنچادے۔ اس کی حالت نہایت نازک ہوگئی۔ تب ہیڈ ماسٹر مدرسہ نے کسولی پیٹیور انسٹی ٹیوٹ کے انچارج ڈاکٹر کو تار دی کہ اب اس کے لئے کچھ ہو سکتا ہے یا نہیں؟ مگر اس نے بجواب تار دی کہ

SORRY NOTHING CAN BE DONE FOR ABDUL KARIM

افسوس ہے کہ عبدالکریم کے واسطے کچھ نہیں کیا جا سکتا"۔ [111]

چونکہ وہ لڑکا دور سے آیا تھا اور جس علاقہ کا وہ لڑکا تھا اس میں تعلیم کا بہت ہی کم رواج تھا اور خیال تھا کہ اگر یہ مر گیا تو ان علاقوں پر اس کا بد اثر پڑے گا آپ کے دل میں اس کی نسبت دعا کا ایک خاص جوش پیدا ہوا اور آپ نے اس کے لئے دعا کی۔ آخر اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا سنی اور وہ لڑکا جس کی نسبت خیال تھا کہ چند گھنٹوں میں مر جائے گا اور جس کی تشنج کی حالت نہایت شدید ہوگئی تھی حتیٰ کہ اس کو دیکھا نہیں جاتا تھا اس کو اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا سے اچھا کر دیا۔

جو لوگ علم طب سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ دیوانے کُتّے کے مریض کو جب دورہ

ہو جائے تو اس کا کوئی علاج نہیں تب وہ ضرور مرجاتا ہے اور آج تک ایک کیس بھی ایسا نہیں ہوا کہ ایسا مریض بچ گیا ہو چنانچہ جب اس لڑکے کی شفایابی کی خبر کسولی پہنچی تو وہاں سے ایک شخص نے یہ خط لکھا۔

"سخت افسوس تھا کہ عبدالکریم جس کو دیوانہ کتے نے کاٹا تھا اس کے اثر میں مبتلاء ہو گیا مگر اس بات کے سننے سے بڑی خوشی ہوئی کہ وہ دعا کے ذریعہ سے صحت یاب ہو گیا۔ ایسا موقع جانبر ہونے کا کبھی نہیں بنا۔"[۱۱۲]

یہ وہ شفا کی قسم ہے جو حقیقی شفا کہلا سکتی ہے اور جس سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ کوئی خدا ہے جس میں شفا دینے کی طاقت ہے اور وہ لوگ جو ایسی شفا کے نمونے دکھائیں اس امر کا حق رکھتے ہیں کہ کہیں انہوں نے خدا تعالیٰ کو اس کی اصلی صورت میں اور یقینی طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔

حضرت مسیح موعود نے اور بھی بہت سے نشانات اس صفت کے ظاہر اور روشن کرنے کے لئے دکھائے ہیں مگر اس جگہ ان سب کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں یہ مضمون نامکمل رہے گا اگر میں اس چیلنج کا ذکر نہ کروں جو آپ نے پادری صاحبان کو دیا تھا آپ نے اس میں لکھا تھا کہ آپ لوگ مسیح اول کے پیرو ہیں جو نشانات دکھاتا تھا اور آپ لوگوں کو اس کا قائم مقام ہونے کا دعویٰ ہے اور مجھے محمد رسول اللہ ﷺ کے قائم مقام ہونے کا دعویٰ ہے پس میں آپ کو چیلنج دیتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ دعامیں اس طرح مقابلہ کرلیں کہ بعض خطرناک مریض جو عام طور پر اچھے ہونے کے قابل نہیں سمجھے جاتے ان کو لے کر بذریعہ قرعہ آپس میں برابر تعداد میں تقسیم کر لیا جائے پھر جو مریض میرے حصے میں آئیں ان کے لئے میں دعا کروں اور جو آپ لوگوں کے حصے میں آئیں ان کے لئے آپ دعا کریں پھر دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ کس فریق کے بیماروں کو اچھا کرتا ہے؟[۱۱۳] مگر افسوس کہ پادری صاحبان اس مقابلہ پر نہ آئے۔

اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت قدّوس بھی ہے یعنی وہ پاک ہے۔ اب اس صفت پر سب مذاہب ہی متفق ہیں لیکن کوئی ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ خدا تعالیٰ کی نسبت کیونکر معلوم ہو کہ وہ قدوس ہے۔ اول تو جو صفات اس کی بیان کی جاتی ہیں وہی مشتبہ ہیں ان سے ہم اندازہ کس طرح لگا سکتے ہیں کہ وہ قدوس ہے؟ اگر اس امر کو نظر انداز بھی کر دیا جائے اور اس صفت کو مستقل طور پر الگ ہی تسلیم کر لیا جائے تو بھی اس کا ثبوت ہمیں کوئی نہیں ملتا۔ اس صفت کا ثبوت صرف

ایک ہی ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ کوئی ایسے لوگ ہوں جو خدا تعالیٰ کا قرب پانے والے اور اس کی لقاء کا رتبہ حاصل کرنے والے ہوں پھر ان کے وجود میں قدوسیت کی صفات کو جلوہ گر ہوتے ہوئے دیکھیں اور اگر یہ نہ ہو تو ایک طرف خدا تعالیٰ کی صفت قدوسیت مشتبہ رہتی ہے اور دوسری طرف اس امر کا بھی انکار کرنا پڑتا ہے کہ خدا تعالیٰ سے کبھی کسی کو قرب حاصل ہوا ہے کیونکہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک گلاب کا پھول تھوڑی دیر کپڑوں سے لگا رہے تو تمام کپڑے اس کی خوشبو سے مہک جاتے ہیں اور ایک معطّر انسان کے پاس تھوڑی دیر کوئی بیٹھ جائے تو اس سے بھی خوشبو کی لپٹیں آنے لگتی ہیں تو ہم کس طرح قبول کر سکتے ہیں کہ ایک شخص خدا تعالیٰ کا مقرب تو بنا مگر اس نے خدا سے کچھ نہ پایا؟ اور اس کی اس خوشبو سے جو در حقیقت سب صفات کی جامع ہے یعنی قدوسیت کورا کا کورا ہی رہا؟ چونکہ یہ امر خلاف عقل ہے اس لئے وہی شخص خدا تعالیٰ کا مقرب سمجھا جا سکتا ہے اور اسی کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کی قدوسیت کا ثبوت مل سکتا ہے جو خدا سے قدوسیت حاصل کر کے خود قدوس ہو اور اپنی نیکی اور تقویٰ کی وجہ سے دنیا کے لئے نمونہ بنے۔

حضرت مسیح موعود کی زندگی کو جب ہم دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس صفت کے بھی ثابت کرنے والے ہیں۔ آپ نے اپنے وجود سے خدا تعالیٰ کی صفت قدوسیت کو روز روشن کی طرح ثابت کر دیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان پر اس صفت کا انعکاس ایسے ہی رنگ میں ہو سکتا ہے جو بشریت کے مناسب حال ہو ورنہ وہ خدا بن جائے گا جو خلاف عقل ہے۔ مگر بشریت کے مطابق اس کا انعکاس اس کی شان کو کم نہیں کرتا بلکہ اپنے مقصد کو یعنی صفات باری کو پورے طور پر ثابت کرنے کے کام کو خوب اچھی طرح ادا کرتا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اس صفت کو بھی جیسا کہ میں بتا چکا ہوں اپنے وجود میں پیدا کیا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ دشمن سے دشمن بھی اس امر کا مُقِرّ ہے کہ آپ میں کوئی عیب نہ تھا۔ اس جگہ ایک نکتہ یاد رکھنے والا ہے کہ موعود جب دنیا میں آتے ہیں تو بوجہ مذہبی مخالفت کے لوگ ان پر کئی قسم کے عیب لگانے لگتے ہیں کیونکہ عداوت انسان کو اندھا اور بہرا کر دیتی ہے اور خوبی کو بھی عیب کر کے دکھاتی ہے پس انبیاء کی زندگی کو جانچتے ہوئے ہمیشہ ان کے دعویٰ سے پہلے کی زندگی کو لینا چاہئے کیونکہ اس وقت تک لوگوں کو ان سے ایسی خاص عداوت نہیں ہوتی کہ تعصب سے بالکل ہی اندھے ہو جائیں پس وہی زندگی ان کی قدوسیت کا معیار ہے۔

حضرت مسیح ناصری جو اللہ تعالیٰ کے ہادیوں میں سے ایک ہادی تھے اور اسی جماعت کے ایک فرد تھے جن میں سے حضرت مسیح موعود علیہ السلام ہیں۔ آپ کی زندگی بھی جیسا کہ ضروری تھا نہایت پاکیزہ اور صاف تھی حتیٰ کہ آپ نے اپنے دشمنوں کو چیلنج دیا تھا کہ "کون تم میں سے مجھ پر گناہ ثابت کر سکتا ہے"؟[۱۱۴]۔ مگر یہ دعویٰ پہلی ہی زندگی کے متعلق ہو سکتا تھا۔ ورنہ نبوت کے بعد کی زندگی پر لوگ بوجہ تعصب سے اندھا ہو جانے کے معترض تھے چنانچہ خود حضرت مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"ابن آدم کھاتا پیتا آیا اور وہ کہتے ہیں دیکھو کھاؤ اور شرابی آدمی۔ محصول لینے والوں اور گنہگاروں کا یار"۔[۱۱۵]

مسیح ایسانہ تھا بلکہ ان لوگوں کی آنکھوں پر بوجہ تعصب پٹی بندھ گئی تھی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی زندگی بھی قدوسیت کا ایک اعلیٰ نمونہ تھی اور نبوت سے پہلے زمانہ کی زندگی کے متعلق آپ کے سخت سے سخت دشمنوں کی شہادتیں موجود ہیں کہ اس پر کوئی عیب نہیں لگایا جا سکتا۔ چنانچہ مولوی محمد حسین بٹالوی جو دعویٰ کے بعد آپ کا سب سے بڑا دشمن ثابت ہوا وہ آپ کی زندگی کے متعلق اپنے رسالہ اشاعۃالسنہ میں لکھتا ہے۔

"اس کا مؤلف بھی (حضرت مسیح موعود کی ایک کتاب کا جو مسیحیت کے دعویٰ سے پہلے لکھی گئی تھی نام ہے) اسلام کی مالی و جانی و قلمی و لسانی و حالی و قالی نصرت میں ایسا ثابت قدم نکلا ہے جس کی نظیر پہلے مسلمانوں میں بہت ہی کم پائی گئی ہے"۔[۱۱۶]

اس رائے میں سے حالی نصرت کے الفاظ قابل غور ہیں۔ ان کے یہ معنی ہیں کہ جو نمونہ اخلاق اور اعلیٰ چال چلن کا آپ نے دکھایا ہے وہ ایسا ہے کہ اس کو دیکھ کر لوگوں کو اسلام کی طرف رغبت پیدا ہوتی ہے اور وہ ایسا کامل نمونہ ہے کہ پہلے مسلمانوں میں بھی اس کی نظیر بہت کم پائی جاتی ہے۔

تمام مذاہب کے پیروؤں کو پہلے لوگوں کی عزت کے قیام اور ان کے درجہ کو بڑھا کر دکھانے کا جس قدر شوق ہے اس کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات اچھی طرح سمجھی جا سکتی ہے کہ ایک مولوی کے لئے یہ لکھنا کس قدر مشکل ہے کہ فلاں شخص پہلے مسلمانوں سے بھی بڑھ گیا ان مولوی صاحب کی شہادت اس وجہ سے اور بھی زیادہ عظمت رکھتی ہے کہ آپ قادیان کے پاس کے رہنے والے تھے اور بچپن سے آپ کے واقف تھے اور آپس میں برابر ملاقات ہوتی رہتی تھی۔

یہ تو ایک اشدّ مخالف کی تحریری رائے ہے۔ اس رائے کے علاوہ بھی ہر اک شخص جو آپ کا جاننے والا ہے وہ آپ کی نیکی کا قائل اور معترف ہے۔ قادیان میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں ہندو بھی، آریہ بھی، سکھ بھی اور غیر احمدی مسلمان بھی۔ قادیان کے دروازہ بٹالہ میں مسیحیوں کا ایک بہت بڑا مرکز ہے یہ سب لوگ آپ کے سخت ترین دشمن ہیں بلکہ جس قدر دشمنی ان لوگوں کو ہے اور کسی کو شاید نہ ہوگی کیونکہ نبی اپنے شہر اور اپنے علاقہ میں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا مگر باوجود اس عداوت کے سب لوگ معترف ہیں کہ بچپن سے لے کر آخر عمر تک آپ کی نیکی اور تقویٰ ناقابلِ گرفت و اعتراض تھا۔ آپ کی صداقت پر لوگوں کو ایسا یقین تھا کہ آپ کے خاندان کے ساتھ جن لوگوں کے دیوانی مقدمات ہوتے تھے اگر وہ سمجھتے تھے کہ وہ حق پر ہیں تو ہمیشہ یہ تجویز پیش کر دیتے ہیں کہ جو کچھ آپ کہہ دیں گے وہ ان کو منظور ہوگا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آپ کبھی خلاف حق بات نہیں کہیں گے خواہ اس میں آپ کا یا آپ کے رشتہ داروں کا کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو۔

ایک دفعہ آپ پر ایک مقدمہ ڈاک خانہ کی طرف سے چلایا گیا جس میں جرمانہ اور قید دونوں سزائیں مل سکتی تھیں۔ چونکہ ڈاک خانہ کے قواعد کی خلاف ورزی اس زمانہ میں کثرت سے ہوتی تھی ڈاک خانہ والے چاہتے تھے کہ ایک دو شخصوں کو سخت سزا ہو جائے تو آئندہ لوگ احتیاط کریں گے۔ اس لئے ڈاک خانہ کا انگریز افسر خود پیروی کے لئے آتا اور پورا زور دیتا کہ آپ کو سزا ہو جائے۔ اس مقدمہ کی بناء صرف اس شخص کی شہادت پر تھی جس نے آپ کا بھیجا ہوا پیکٹ کھولا تھا جس میں ایک خط تھا اور خط کا پیکٹ میں بھیجنا قوانین ڈاک کے مطابق جرم تھا۔ وکلاء نے کہا کہ بچنے کی صرف یہ صورت ہے کہ آپ کہیں کہ میں نے خط الگ بھیجا تھا۔ وہ شخص جس کے نام پیکٹ تھا چونکہ پادری تھا اور آپ سے مباحثات کر چکا تھا اور ایک رنگ میں آپ سے عداوت رکھتا تھا یہ عُذر آپ کا یقینی طور پر قابل قبول تھا مگر آپ نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ میں جھوٹ کس طرح بول سکتا ہوں میں نے واقع میں خط بھیجا ہے۔ گو یہ سمجھ کر اسے پیکٹ میں ڈال دیا تھا کہ وہ بھی مضمون پیکٹ کے متعلق تھا۔ مجسٹریٹ پر اس امر کا اس قدر اثر ہوا کہ باوجود ڈاک خانہ کے افسروں کے اصرار کے اس نے آپ کو بری کر دیا اور کہا کہ جو شخص قید ہونے کے خطرہ میں ہے اور منہ کے ایک فقرہ سے اپنے آپ کو بچا سکتا ہے لیکن کوئی پرواہ نہیں کرتا اور جھوٹ نہیں بولتا میں اسے ہرگز سزا نہیں دے سکتا۔[۱۱]

مجھے سب سے زیادہ ایک بوڑھے شخص کی شہادت پسند آیا کرتی ہے۔ یہ ایک سکھ ہے جو آپ کا بچپن کا واقف ہے وہ آپ کا ذکر کر کے بے اختیار روپڑتا ہے اور سنایا کرتا ہے کہ ہم کبھی آپ کے پاس آکر بیٹھتے تھے تو آپ ہمیں کہتے تھے کہ جا کر میرے والد صاحب سے سفارش کرو کہ مجھے خدا اور دین کی خدمت کرنے دیں اور دنیوی کاموں سے معاف رکھیں۔ پھر وہ شخص یہ کہہ کر روپڑتا کہ "وہ تو پیدائش سے ہی ولی تھے"۔

ایک غیر مذہب کا شخص جس نے آپ کی زندگی کے سب دَور دیکھے ہیں اور آپ کے راز سے پوری طرح واقف ہے اس کی یہ شہادت معمولی شہادت نہیں ہے اور اسی پر منحصر نہیں۔ ہر شخص جو جس قدر آپ کا زیادہ واقف ہے اسی قدر آپ کے اخلاق اور آپ کے تقویٰ اور آپ کی ہمدردی بنی نوع انسان کی تعریف کرتا ہے اور یہی معیار اعلیٰ اخلاق کا ہوتا ہے کہ اپنے اور بیگانے جو کسی شخص کی تمام زندگی کے حالات سے واقف ہوں وہ اس کی دیانتداری اور تقدس کی تعریف کریں۔

آپ نے خود بھی اپنے مخالفوں کو مسیح ناصری کی طرح ان الفاظ میں چیلنج دیا ہے مگر کوئی مقابل پر نہیں آیا۔

"میں چالیس برس تک تم میں ہی رہتا رہا ہوں اور اس مدت دراز تک تم مجھے دیکھتے رہے ہو کہ میرا کام افتراء اور دروغ کا نہیں ہے اور خدا نے ناپاکی کی زندگی سے مجھے محفوظ رکھا ہے تو پھر جو شخص اس قدر مدت دراز تک یعنی چالیس برس تک ہر اک افتراء اور شرارت اور مکر اور خباثت سے محفوظ رہا اور کبھی اس نے خلقت پر جھوٹ نہ بولا تو پھر کیونکر ممکن ہے کہ برخلاف اپنی عادت قدیم کے اب وہ خدا تعالیٰ پر افتراء کرنے لگا۔"[118]

پھر فرماتے ہیں۔

"کون تم میں ہے جو میری سوانح زندگی میں کوئی نکتہ چینی کر سکتا ہے پس یہ خدا کا فضل ہے کہ جو اس نے ابتداء سے مجھے تقویٰ پر قائم رکھا"[119]

ان شہادتوں اور دعووں سے ظاہر ہے کہ آپ کی زندگی نہ صرف عیوب سے پاک تھی بلکہ آپ کو ایسا تقویٰ نصیب تھا کہ آپ کے دشمن بھی گو آپ کے دعویٰ میں آپ کو غلطی پر قرار دیتے تھے مگر وہ آپ کے ذاتی تقویٰ اور طہارت کے متعلق مُتَّفِقُ اللِّسَانْ ہو کر گواہی دیتے

تھے اور اَلْفَضْلُ مَاشَہِدَتْ بِہِ الْاَعْدَآءُ۔ پس آپ کے وجود میں اللہ تعالیٰ کی صفت قدوسیت بھی ظاہر ہوئی اور آپ کی حالت کو دیکھ کر ہمیں یہ یقین ہوا کہ جس خدا کا یہ بندہ ہے جس نے بچپن کے زمانہ سے آخر تک کوئی گناہ نہیں کیا کوئی اخلاقی یا روحانی کوتاہی نہیں دکھائی بلکہ سب اخلاق حسنہ پر کاربند رہا ہے اور تقویٰ کا زندہ نمونہ دکھایا ہے وہ خود کیسا پاک ہے سُبْحَانَ اللّٰہِ وَتَعَالٰی عَمَّا یَصِفُوْنَ۔

ایک صفت اللہ تعالیٰ کی مُحْیِیْ بھی ہے یعنی مُردوں کو زندہ کرنے والا۔ انجیل میں اس قسم کے معجزات پر بہت زور دیا گیا ہے کہ مسیح نے بہت سے مُردے زندہ کئے لیکن آج کون ہے جو مُردے زندہ کر کے دکھا سکتا ہے؟ پرانے قصے ہماری تسلی نہیں کر سکتے۔ ہم اس صفت پر تبھی یقین کر سکتے ہیں جب اس کا کوئی ثبوت اس دنیا میں بھی دیکھ لیں اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے مسیح موعود علیہ السلام نے اس صفت کے متعلق عملی شہادت بہم پہنچا کر ہمارے ایمانوں کو تازہ کیا ہے۔

پیشتر اس کے کہ میں اس قسم کے نشانوں کی کوئی مثال بتاؤں پہلے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جن کا اس دنیا میں اپنے پورے جلال سے ظاہر ہونا بعض دوسری صفات کے مخالف پڑتا ہے پس ایسی صفات کو اللہ تعالیٰ اس رنگ میں ظاہر نہیں کرتا جس رنگ میں کہ وہ مرنے کے بعد کی زندگی میں ظاہر ہونگی مُردوں کے زندہ کرنے والی صفت بھی انہی میں سے ہے۔ اگر فی الواقع مُردے زندہ ہو کر دنیا میں واپس آنے لگیں تو ایمان کا کوئی فائدہ نہ رہے کیونکہ ایمان تبھی تک نفع بخش ہے جب تک اس میں کچھ اخفاء ہے اور جب وہ مرئی چیزوں کی طرح ظاہر ہو جائے تو اس کا کچھ فائدہ نہیں۔ کون ہے جو اس پر انعام دے کہ کوئی شخص سمندر کو سمندر اور سورج کو سورج سمجھتا ہے۔ جو باریک راز دریافت کرتے ہیں وہی انعامات کے بھی مستحق ہوتے ہیں۔ پس اصلی مُردے دنیا میں واپس نہیں لائے جاتے ہاں یہ مُردے زندہ کرنے کا نشان دو طرح ظاہر ہوتا ہے۔ یا تو روحانی مُردوں کو زندہ کر کے یا پھر ایسے بیماروں کو زندہ کر کے جن کی حالت جان کندن تک پہنچ گئی ہو۔ یا بظاہر مرگئے ہوں مگر درحقیقت مرے نہ ہوں۔ جیسا کہ حضرت مسیحؑ نے اس عورت کی نسبت جس کا ذکر متی باب ۹ میں آتا ہے کہا کہ۔

"کنارے ہو کہ لڑکی مری نہیں بلکہ سوتی ہے۔ وے اس پر ہنسے"[۱۲۰]۔

روحانی مُردے زندہ کرنے کے متعلق مجھے کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہم میں سے ہر اک اس کی زندہ مثال ہے مگر میں دوسری قسم کے احیاء کی دو مثالیں اس جگہ بیان کرتا ہوں۔

آپ کا چھوٹا لڑکا مبارک احمد ایک دفعہ بیمار ہوا اور اس کی بیماری بہت سخت بڑھ گئی اور غش پر غش آنے لگے آخر اس کی حالت موت کی سی ہو گئی اور جو اوپر نگران تھے انہوں نے سمجھ لیا کہ وہ بالکل مرچکا ہے حضرت مسیح موعود علیہ السلام پاس کے کمرے میں دعا میں مشغول تھے کہ کسی نے آواز دی کہ اب دعا بس کر دیں کیونکہ لڑکا فوت ہو گیا ہے۔ آپ اٹھ کر وہاں آئے جہاں وہ لڑکا تھا اور آپ نے اس کے جسم پر ہاتھ رکھ کر توجہ کی تو دو تین منٹ میں یہ پھر سانس لینے لگ گیا۔

اسی طرح ایک دفعہ خان محمد علی خان صاحب جو نواب صاحب مالیر کوٹلہ کے ماموں ہیں اور ہجرت کر کے قادیان میں ہی آبسے ہیں ان کے لڑکے میاں عبدالرحیم خان صاحب بیمار ہوئے ان کو ٹائیفائیڈ کی بیماری تھی دو ڈاکٹر اور حضرت خلیفہ اول مولوی نور الدین صاحب جو دیسی طریق کے علاج کے بہت بڑے ماہر تھے اور مہاراجہ صاحب جموں کے شاہی طبیب رہ چکے تھے معالج تھے۔ آخر بیماری کی حالت یہاں تک پہنچ گئی کہ مولوی صاحب نے بھی اور دوسرے ڈاکٹروں نے بھی کہہ دیا کہ اب اس مریض کی حالت بچنے والی نہیں یہ چند گھنٹے کا مہمان ہے علاج کی اب کچھ ضرورت نہیں۔ جب اس امر کی حضرت مسیح موعود کو اطلاع ہوئی تو آپ نے اسی وقت اس لڑکے کے لئے دعا کی اور الہام ہوا کہ اس لڑکے کی موت آچکی ہے تب آپ نے عرض کیا کہ اے خدا! اگر دعا کا وقت گذر چکا ہے اور اس لڑکے کی موت آچکی ہے تو میں اس کے لئے شفاعت کرتا ہوں۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ [۱۲۱]۔ کون ہے جو خدا تعالیٰ کے حضور سفارش کرے مگر اس کے حکم اور اس کی اجازت سے؟

آپ فرماتے ہیں کہ اس الہام پر میں نے دعا ترک کر دی مگر معاً دوبارہ الہام ہوا اِنَّکَ اَنْتَ الْمُجَازُ [۱۲۲]۔ ہم تجھ کو شفاعت کی اجازت دیتے ہیں۔ اس پر آپ نے شفاعت کی اور اسی وقت باہر آکر کہہ دیا کہ یہ لڑکا بچ جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے میری شفاعت سے اس کو موت سے بچا دیا ہے۔ چنانچہ وہ فوراً ہی تندرستی کی طرف مائل ہو گیا اور کچھ دنوں میں اچھا ہو گیا۔ عبدالرحیم خان صاحب جن کے متعلق یہ معجزہ ظاہر ہوا خدا تعالیٰ کے فضل سے زندہ موجود ہیں اور اس وقت انگلستان میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ آپ کے والد اور دوسرے گواہوں میں سے بھی اکثر لوگ زندہ موجود ہیں اور سب شہادت دے سکتے ہیں کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے خدا تعالیٰ کی صفت احیاء کا مشاہدہ کیا ہے جب کہ وہ حضرت مسیح موعود کے ذریعہ سے ظاہر ہوئی۔

اللہ تعالیٰ کی مشہور صفات میں سے ایک صفت مالکیّت کی بھی ہے تمام مذاہب اس امر پر متفق ہیں کہ وہ ذرہ ذرہ کا مالک ہے مگر یہ کہ وہ کس طرح مالک ہے اس کا ثبوت ملنے کے بغیر ہمارے لئے بالکل ناممکن ہے کہ ہم اس کی مالکیّت پر یقین کریں کیونکہ ہم ظاہر میں تو دیکھتے ہیں کہ باقی سب مالکوں کے آثار مالکیّت نظر آتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کی مالکیّت کے کوئی آثار دنیا میں نظر نہیں آتے۔ بے شک یہ کہا جاسکتا ہے اور واقع بھی یہی ہے کہ خدا تعالیٰ نے ایک قانون بنایا ہے اس کے ماتحت کارخانۂ عالم چل رہا ہے لیکن پھر بھی اگر کوئی آدمی دنیا میں ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ خدا کا مقرب ہو اس کے ہاتھ پر اس کی صفت مالکیت کا ظہور ہونا چاہئے تا اس کے مقرب ہونے کی دلیل پیدا ہو اور اس پر یقین آئے کہ فی الواقع خدا دنیا کا مالک ہے۔ ورنہ موجودہ صورت میں تو اگر ایک عام آدمی اٹھ کر کہہ دے کہ وہی سب دنیا کا مالک ہے اور جب اسے کہا جائے کہ پھر تجھ پر قوانین نیچر کیوں حکومت کرتے ہیں؟ تو وہ کہہ دے کہ یہ میرا ازلی قانون ہے کہ ایسا ہی ہو تو ایسے شخص کا کوئی جواب خدا پرستوں کے پاس نہیں رہتا۔ بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ کئی لوگ ایسے دعوے کر دیتے ہیں اور اپنے آپ کو خدا کہہ دیتے ہیں اور ان کو اس پر اس وجہ سے جرأت ہوتی ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے مالک ہونے کا بھی کوئی زندہ ثبوت دنیا میں موجود نہیں اس لئے ہمارے دعویٰ کو کوئی رد نہیں کر سکتا۔ جو اعتراض وہ ہماری خدائی پر کریں گے وہی دہرا کر ہم ان کے خدا پر کر دیں گے لیکن اگر فی الواقع خدا کی مالکیت کا کوئی ثبوت ہو تو ایسے لوگوں کو ہرگز جرأت نہیں ہو سکتی کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ اس قسم کا تمسخر کریں اور دنیا کو اس طرح دھوکا دیں۔ کیونکہ اس صورت میں وہ بندے جو خدا کے مقرب ہو کر اور اس کے فضل کی چادر اوڑھ کر آتے ہیں ان کو ان کے مقابلہ میں پیش کیا جاسکتا ہے کہ ان کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ کی مالکیت ظاہر ہو رہی ہے تم اگر خدا ہو تو ان سے بڑھ کر مالکیت کا ثبوت دو کیونکہ یہ نائب ہیں اور تم اصل ہونے کے مدعی ہو۔ یہ طریق تمام وساوس کے رد کرنے کا ایسا ہے کہ اس کا جواب ایسے لوگوں سے کچھ نہیں بن سکتا۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے قرب کو حاصل کر کے اس کی صفت مالکیت کا بھی اسی طرح اظہار کیا جس طرح اور صفات کا اور آپ نہ صرف اس امر پر شاہد ہوئے کہ اسلام انسان کو خدا تعالیٰ سے ملا سکتا ہے بلکہ دوسرے لوگوں کے لئے بھی خدا تعالیٰ پر کامل ایمان لانے کا آپ نے راستہ کھول دیا۔ چنانچہ ایک مثال آپ کے اس قسم کے نشانات میں

سے یہ ہے کہ جب ہندوستان میں طاعون پڑی اور اس کا سخت زور ہوا تو جس طرح طاعون کے نمودار ہونے سے پہلے آپ نے خبر دی تھی کہ اس ملک میں شدید طاعون (وباء) پڑے گی اسی طرح آپ نے اپنا ایک کشف یہ بھی لکھا کہ میں نے دیکھا کہ طاعون ایک مہیب جانور کی شکل میں جس کا منہ ہاتھی سے ملتا ہے چاروں طرف حملہ کرتی پھرتی ہے اور جب وہ ایک حملہ کر چکتی ہے تو میرے سامنے آکر بیٹھ جاتی ہے اور اس طرح بیٹھ جاتی ہے جس طرح کوئی غلام مؤدّب ہو کر بیٹھتا ہے اور اپنی فرمانبرداری کا اقرار کرتا ہے [۱۲۳]۔ پھر آپ کو الہام ہوا کہ "آگ ہماری غلام بلکہ غلاموں کی غلام ہے" [۱۲۴]۔ یعنی طاعون نہ صرف ہماری بلکہ ہمارے غلاموں یعنی جو ہمارے ہی ہو جاتے ہیں اور اپنی مرضی کو ہمارے تابع کر دیتے ہیں ان کی بھی غلام ہے وہ ان کو کچھ نہیں کہے گی اور وہ اس سے محفوظ رہیں گے۔ پھر الہام ہوا کہ اِنِّیْٓ اُحَافِظُ کُلَّ مَنْ فِی الدَّارِ [۱۲۵]۔ میں تیرے گھر میں جس قدر لوگ ہیں ان کو طاعون سے محفوظ رکھوں گا۔

آپ نے ان الہامات کو اسی وقت اخباروں اور کتابوں کے ذریعہ سے شائع کرا دیا اور اپنے مخالفوں کو چیلنج دیا کہ وہ مجھے جھوٹا سمجھتے ہیں اور اپنے آپ کو حق پر تو اپنے متعلق ایسی ہی خبر شائع کرکے دیکھیں کہ ان کے گھر یا ان کی ذات طاعون سے محفوظ رہے گی مگر کوئی شخص مقابلہ پر نہ آیا۔

تمام لوگ جو دنیا کے حالات سے مطلع رہنے کی کوشش کرتے ہیں جانتے ہونگے کہ ہندوستان میں اٹھائیس سال سے سخت طاعون پھوٹا ہوا ہے اور ۱۹۰۱ء میں تو جبکہ یہ الہامات حضرت مسیح موعود کو ہوئے تھے اس کا زور نہایت ہی سخت تھا۔ اس وقت تک ستّر اسّی لاکھ آدمی طاعون سے مر چکا ہے اور ایک ایک سال میں تین تین لاکھ آدمی مرتا رہا ہے خصوصاً اس کا حملہ پنجاب پر سب سے زیادہ سخت پڑا ہے۔ اور تین چوتھائی بلکہ اس سے بھی زیادہ موتیں صرف پنجاب میں واقع ہوئی ہیں۔ ایسی سخت وباء کے ایام میں اور ایسے مبتلاء علاقہ کے رہنے والے شخص کا اس قسم کا دعویٰ کیسا نازک ہے اور خصوصاً جبکہ ایک شخص کے متعلق نہیں بلکہ ایک گھر کے متعلق ہو جس میں ستّر یا سَو آدمی رہتا ہو پھر ایک سال کے متعلق نہیں بلکہ ایک لمبے عرصہ تک کے لئے ہو۔ کونسا انسان ہے جو اس قسم کی بات کا ذمہ لے سکے؟ اور کونسی انسانی طاقت ہے جو پھر اس ذمہ داری کو پورا کر سکے۔

پھر یہ بات بھی دیکھنے والی ہے کہ قادیان ایک چھوٹی سی بستی ہے اور اس وجہ سے گورنمنٹ

کو اس کی صفائی کا بالکل خیال نہیں- اس کی گلیوں کی بری حالت کا اندازہ بھی یورپ و امریکہ کے رہنے والے نہیں کر سکتے- اس کی حالت ان شام کے قصبات سے ہرگز کم نہیں جہاں کہ عرصہ دراز سے طاعون اپنا گھر بنائے ہوئے ہے۔ آپ کا گھر بھی شہر سے باہر نہیں بلکہ شہر کے اندر تھا آپ کے مکان کے چاروں طرف لوگوں کے مکانات تھے پس خاص صفائی یا کھلی ہوا کی طرف بھی آپ کے گھر کی حفاظت منسوب نہیں کی جاسکتی- آپ کا گھر باقی حصۂ قصبہ سے نشیب میں ہے اور نصف شہر کی گندی نالیاں آپ کے مکان کے اردگرد سے گذرتی ہیں اور پاس ہی پچاس گز کے فاصلہ پر ایک تالاب تھا جس میں برسات کا پانی سال کے اکثر حصہ میں سڑتا رہتا تھا (میں تھا اس لئے کہتا ہوں کہ اب تالاب کا بیشتر حصہ بھرتی ڈال کر پُر کر دیا گیا ہے اور تالاب فاصلہ پر ہو گیا ہے) ایسے مقام اور ایسے گردو پیش میں رہنے والے شخص کا اس قدر بڑا دعویٰ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ یہ دعویٰ اگر معمولی رنگ میں بھی پورا ہوتا تو یقیناً خدا تعالیٰ کے مالک ہونے کی ایک زبردست دلیل ہوتا مگر خدا تعالیٰ نے اس نشان کو ایک زبردست نشان کرنے کے لئے ایسے سامان پیدا کر دیئے کہ انہوں نے اس کی شان کو بہت ہی بڑھا دیا-

اس الہام کے شائع ہونے سے پہلے قادیان میں طاعون نہ آئی تھی اگر اسی طرح طاعون کا زمانہ گزر جاتا تو لوگ کہہ سکتے تھے کہ شاید اس علاقہ کی کوئی خصوصیت ہوگی کہ وہاں طاعون کے جَرم نشوونما نہ پاتے ہوں اور اس امر کو دیکھ کر آپ نے دعویٰ کر دیا ہو مگر ادھر اس الہام کی اشاعت ہوئی ادھر خدا تعالیٰ نے طاعون کو قادیان میں بھیج دیا اور ایک سال نہیں دو سال نہیں متواتر چار پانچ سال قادیان پر طاعون کا حملہ ہوتا رہا- طاعون کے حملہ کی صورت بھی اگر طاعون دوسرے علاقہ میں رہتی لیکن آپ کے محلہ میں نہ آتی تو امر مشتبہ رہتا کیونکہ پھر بھی یہ خیال ہو سکتا تھا کہ شاید کوئی خاص انتظام صفائی کا کر لیا گیا ہو مگر طاعون اس محلہ میں بھی آئی جس میں آپ کا مکان تھا پھر اور قریب ہوئی اور آپ کے مکان کے دائیں اور بائیں جو مکان تھے ان میں بھی آئی پہلو بہ پہلو دیوار بہ دیوار طاعون نے حملہ کیا دائیں کیا بائیں کیا آگے کیا پیچھے کیا مگر آپ کے گھر کو بالکل چھوڑ کر چلی گئی- اور آدمی تو الگ رہے کوئی چوہا تک اس کی زد میں نہ آیا گویا اس نظارہ کی مثال اس گھر کی سی تھی جو چاروں طرف سے مکانوں میں گھرا ہوا ہو اور ان کو آگ لگ جائے وہ تمام جل کر راکھ ہو جائیں مگر وہ مکان بیچ میں سے سلامت بچ جائے اور شعلے جس وقت اس کے قریب پہنچیں خود بخود بجھ جائیں اور یہ معلوم ہو کہ کوئی طاقت بالا ان پر غیر مرئی چھینٹے

ڈال کر ان کو ٹھنڈا کر دیتی ہے- ایک سال نہیں دو سال نہیں متواتر پانچ سال تک قادیان میں طاعون پڑی اور ان سالوں میں پڑی جبکہ وہ ہندوستان میں فی ہفتہ تیں تیں چالیس چالیس ہزار آدمی کو لقمہ اجل بنالیتی تھی مگر آپ کے مکان کے ارد گرد گھوم کر چلی جاتی تھی۔ کبھی اس مکان کے کسی بسنے والے پر اس نے حملہ نہیں کیا حالانکہ اس پیشگوئی کی وجہ سے آپ کی جماعت کے کئی خاندان طاعون کے دنوں میں اس حفاظت سے حصہ لینے کے لئے آپ کے گھر میں آکر بس جاتے تھے- اور اس کی آبادی اس قدر بڑھ جاتی تھی کہ غیر وبائی دنوں میں بھی اس قدر آبادی نقصان کا موجب ہوتی ہے کجا یہ کہ وباء کے دن ہوں- یہ وہ نشان مالکیت ہے جو آپ نے دنیا کے سامنے پیش کیا اور جس کے ذریعہ سے آپ نے ہر اک شخص سے جو تعصب سے خالی ہو کر سوچے منوالیا کہ ایک کامِلُ الصِّفات خدا ہے اور اس کا قرب بندے کو حاصل ہو سکتا ہے۔

ایک اور مثال مالکیّت کی قسم کے نشان کی وہ ہے جو خود مغربی ممالک میں ظاہر ہوئی ہے- امریکہ کا رہنے والا ایک شخص ڈوئی نام تھا- اس شخص نے دعویٰ کیا تھا کہ میں مسیح کی آمد ثانی کے لئے بطور ایلیا کے ہوں- اس کے دعویٰ کی مقبولیت اس قدر بڑھ گئی کہ کئی لاکھ آدمی اس کے ساتھ مل گیا اور اس نے شکاگو کے پاس ایک الگ شہر بنایا جس کا نام اس نے زائن رکھا- اس میں سے اس کا خیال تھا کہ نئے دین کی اشاعت ہوگی۔ اس شخص کا یہ دعویٰ تھا کہ اس کی دعا بلکہ چُھو دینے سے بیمار اچھے ہو جاتے ہیں اور وہ لوگوں کو دواؤں کے استعمال سے روکتا تھا- جب اس شخص کا دعویٰ کسی قدر پھیلا تو اس نے اعلان کیا کہ خدا نے اسے اس امر کے لئے بھیجا ہے کہ تا مسیح کے آنے سے پہلے مسلمانوں کو برباد کر دے۔ جب اس کا لیکچر حضرت مسیح موعود کو سنایا گیا تو آپ نے اسے چیلنج دیا کہ تجھ کو یہ دعویٰ ہے کہ تو اسلام کے برباد کرنے کے لئے کھڑا ہے اور مجھے یہ دعویٰ ہے کہ میں اسلام کی حمایت اور اس کو ترقی دینے کے لئے مبعوث ہوا ہوں پس چاہئے کہ مجھ سے دعا میں مقابلہ کر کے فیصلہ کرے کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا ہے تا خدا کا عذاب جھوٹے کو پکڑے اور دوسروں کے لئے حجت ہو-[۱۲۶]

اب یہ ایک صاف بات ہے کہ اگر خدا واقع میں دنیا کا مالک ہے اور وہ ایک شخص کو اس لئے نازل کرتا ہے کہ تا وہ اس کے باغ کی حفاظت کرے اور ایک شخص اپنے طور پر آجاتا ہے اور اس خادم سے بحث کرتا ہے کہ نہیں اس باغ کا رکھوالا تو اس نے مجھے مقرر کیا ہے تو اس کی صفت مالکیّت کا تقاضا ہونا چاہئے کہ وہ اپنے بھیجے ہوئے خادم کی مدد کرے اور دنیا کو بتائے کہ مالک کا

نائب کون ہے؟ اور اس کی صفت مالکیت کے ظہور کے لئے کس کو بھیجا گیا ہے؟

یہ چیلنج ڈاکٹر الیگزنڈر ڈوئی کو بھیجنے کے علاوہ امریکہ اور انگلستان کے اکثر اخباروں کو بھی بھیجا گیا تھا جس کا ایک فقرہ یہ تھا۔

میں عمر میں ستر برس کے قریب ہوں اور ڈوئی جیسا کہ وہ بیان کرتا ہے پچاس برس کا جوان ہے (اور اس طرح میرے مقابلہ میں نسبتاً جوان ہے) لیکن میں نے اپنی بڑی عمر کی کچھ پرواہ نہیں کی کیونکہ اس مباہلہ کا فیصلہ عمروں کی حکومت سے نہیں ہو گا بلکہ خدا جو (زمین و آسمان کا بادشاہ اور) احکم الحاکمین ہے وہ اس کا فیصلہ کرے گا اور وہ صرف سچے مدعی کے حق میں فیصلہ کرے گا..... خواہ وہ اس موت سے جو اسکا انتظار کر رہی ہے کتنا ہی بھاگنے کی کوشش کرے مگر اس کا بھاگنا بھی اس کے لئے موت سے کم نہیں اور آفت اس کے زائن پر ضرور نازل ہو گی کیونکہ اسے یا تو اس مقابلہ کے نتائج برداشت کرنے ہوں گے یا اس مقابلہ سے انکار کے نتائج بھگتنے ہوں گے۔[۱۲۷]

اس مضمون کو کثرت سے امریکن اخبارات نے شائع کیا جن میں سے تمیں اخبارات کی کاپیاں ہمیں ملی ہیں ممکن ہے کہ ان کے علاوہ اور اخبارات میں بھی اس کا ذکر ہو۔ ان میں سے بعض نے اپنی رائے بھی لکھی کہ ہمارے نزدیک یہ طریق فیصلہ انصاف پر مبنی ہے اور معقول ہے مؤخر الذکر اخبارات میں سے ایک سان فرانسسکو کا اخبار"ارگوناٹ" بھی ہے یہ چیلنج ۱۹۰۲ء کو دیا گیا تھا مگر ڈاکٹر ڈوئی نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ پھر ۱۹۰۳ء میں اس چیلنج کو دُہرایا گیا اور آخر امریکہ میں ہی اس کے خلاف یہ آواز اٹھائی گئی کہ وہ جواب کیوں نہیں دیتا۔ وہ خود اپنے اخبار کے دسمبر ۱۹۰۳ء کے پرچہ میں اس امر کا یوں اقرار کرتا ہے۔

"ہندوستان میں ایک بیوقوف محمدی مسیح ہے جو مجھے بار بار لکھتا ہے کہ مسیح یسوع کی قبر کشمیر میں ہے اور لوگ مجھے کہتے ہیں کہ تو اس کا جواب کیوں نہیں دیتا؟ مگر کیا تم خیال کرتے ہو کہ میں ان مچھروں اور مکھیوں کا جواب دوں گا۔ اگر میں ان پر اپنا پاؤں رکھوں تو میں ان کو کچل کر مار ڈالوں گا[۱۲۸]۔ (میں انکو موقع دیتا ہوں کہ وہ اُڑ جائیں اور زندہ رہیں)

مگر جیسا کہ لکھا گیا تھا کہ اگر وہ مقابلہ پر آئے گا تو بہت جلد ہلاک ہو گا مگر بھاگے گا تو بھی وہ آفت سے نہیں بچے گا اور اس کے صیحون پر جلد تر ایک آفت آئے گی اور ایسا ہی ہوا خدا نے

اس شخص کو پکڑا اور صیحون میں اس کے خلاف بغاوت ہو گئی اس کی اپنی بیوی اور اس کا لڑکا اس کے مخالف ہو گئے اور انہوں نے ثابت کیا کہ جبکہ یہ شخص پبلک میں شراب کے خلاف لیکچر دیا کرتا تھا علیحدگی میں خود شراب پیتا تھا اور اور بہت سے اعتراض لوگوں نے اس پر کئے اور آخر اس کو صیحون سے بے دخل کیا گیا اور یا تو وہ شہزادوں کی سی زندگی بسر کرتا تھا یا کھانے پینے کو بھی محتاج ہو گیا۔ اور ایک مزدور کی سی مزدوری اس کے گذارے کے لئے مقرر ہوئی۔ آخر اس پر فالج گرا اور وہ پَیر جس سے وہ خدا کے مسیح کو مچھروں کی طرح مَسلنا چاہتا تھا بے کار ہو گئے اور آخر مصائب کی برداشت نہ لا کر دیوانہ ہو گیا اور چند دن میں مر گیا۔

اس کی اس طرح موت پر بھی بہت سے امریکن اخبارات نے نوٹ لکھے اور اس پیشگوئی کا بھی ذکر کیا جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اس کے متعلق کی تھی ان میں سے ایک اخبار ڈنول گزٹ ۷۔ جون ۱۹۰۷ء کے پرچہ میں لکھتا ہے۔

"اگر احمد اور ان کے پیرو اس پیشگوئی کے جو چند ماہ ہوئے پوری ہو گئی نہایت صحت کے ساتھ پورے ہونے پر فخر کریں تو ان پر کوئی الزام نہیں"۔

اب میں سب سے آخر میں مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کی صفت باعث کو بیان کرتا ہوں۔ اس صفت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مخلوق کی اندرونی طاقتوں کو ابھار کر ان کو ایسا نشوونما دیتا ہے کہ وہ کچھ کی کچھ ہو جاتی ہیں اور اس قدر فرق پیدا ہو جاتا ہے کہ جس طرح ایک مُردے اور زندے میں فرق ہے۔ یہ صفت اس شکل میں صرف اسلام نے ہی بیان کی ہے گو ایک مخلوط سا خیال اس کے متعلق تمام اقوام میں بھی پایا جاتا ہے یہ صفت بھی کبھی ثابت نہیں ہو سکتی اگر اس کا زندہ نمونہ ہمیں کسی انسان میں نظر نہ آئے اور نہ ہم سمجھ سکتے ہیں کہ کوئی شخص خدا تعالیٰ کا کامل قرب حاصل کر چکا ہے جب تک اس صفت کا ظہور اس میں نہ ہو۔ بلکہ حق یہ ہے کہ چونکہ انبیاء دوسروں کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوتے ہیں اس لئے اس صفت کا ظہور سب سے زیادہ ضروری ہے جب تک وہ ایسی جماعت پیدا نہیں کرتے جو صفتِ باعث کے ماتحت اپنی پہلی مُردنی کو ترک کر کے زندہ نہیں ہو جاتی اور ایک چھوٹے حشر کا نمونہ ہم اس دنیا میں نہیں دیکھ لیتے نہ ہمارے دلوں کو اطمینان ہو سکتا ہے اور نہ انبیاء کی بعثت کی غرض پوری ہوتی ہے۔

اس نکتہ پر زور دینے کے لئے قرآن کریم نے انبیاء کی کامیابی کا نام قرآن کریم میں بار بار قیامت اور ساعت رکھا ہے جس سے بعض لوگوں نے نادانی سے یہ نتیجہ نکال لیا ہے کہ شاید

قرآن کریم بعث مابعد الموت کا قائل ہی نہیں۔ یہ دھوکا ویسا ہی ہے جیسے کہ بعض اور لوگوں نے یہ سمجھ چھوڑا ہے کہ جہاں ساعت کا لفظ آئے اس کے معنے ضرور قیامت کے ہوتے ہیں حالانکہ قرائن کے ذریعہ سے بآسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ کس جگہ اس سے بعثِ مَابَعْدَ الْمَوْتِ مراد ہے اور کس جگہ نبی کا اپنی غرض میں کامیاب ہو جانا اور ایک زندہ جماعت کے پیدا کرنے میں فلاح کا منہ دیکھنا مراد ہے۔

حضرت مسیح موعود نے اس صفت کا نمونہ بھی نہایت عمدگی اور کامیابی کے ساتھ دکھایا ہے اور اس زبردست معیار پر حضرت مسیحؑ ناصری نے بیان فرمایا تھا خوب کامیابی کے ساتھ آپ پورے اترے ہیں حضرت مسیحؑ فرماتے ہیں۔

"جھوٹے نبیوں سے خبردار رہو جو تمہارے پاس بھیڑوں کے بھیس میں آتے پَر باطن میں پھاڑنے والے بھیڑئے ہیں۔ تم انہیں ان کے پھلوں سے پہچانوگے کیا کانٹوں سے انگور یا اونٹ کٹاروں سے انجیر توڑتے ہیں؟ اسی طرح ہر ایک اچھا درخت اچھے پھل لاتا اور بُرا درخت بُرے پھل لاتا ہے۔ اچھا درخت بُرے پھل نہیں لاسکتا۔ نہ بُرا درخت اچھے پھل لاسکتا ہر ایک درخت جو اچھے پھل نہیں لاتا کاٹا اور آگ میں ڈالا جاتا ہے۔ پس ان کے پھلوں سے تم انہیں پہچانوگے"۔[۱۲۹]

اس معیار کے یہی معنے ہیں کہ ہراک درخت اپنے مطابق پھل لاتا ہے۔ پس نبی وہی ہے جو نبوت کا رنگ علیٰ قدر مراتب اپنے متبعین میں پیدا کر دے اور خدا رسیدہ وہی ہے جو ہراک کی استعداد فطری کے مطابق اس کو خدا تک پہنچا دے۔

اس معیار کے یہ معنے نہیں کہ کسی جماعت میں اخلاص اور قربانی ہو تو سمجھا جائے گا کہ مدعی سچا ہے اور خدا رسیدہ ہے کیونکہ قربانی کے صرف یہی معنے ہوتے ہیں کہ متبعین کو اپنے مقتداء کی زندگی میں کوئی ایسی بات نہیں معلوم ہوئی جس کی وجہ سے وہ اسے جھوٹا خیال کریں۔ اب لوگوں کا کسی کو با اخلاق یا راستباز سمجھ لینا صرف دو باتیں ثابت کر سکتا ہے یا تو یہ کہ ان کو اس کے حالات سے پوری طرح واقفیت نہیں یا اگر وہ لوگ ایسے ہیں کہ ان کو اس کی زندگی کا ہر شعبہ دیکھنے کا موقع ملا ہے تو پھر صرف اس قدر ثابت ہو گا کہ وہ مقتداء مفتری نہیں ہے بلکہ وہ یہ خیال کرتا ہے کہ راستباز ہے لیکن ہر شخص جو اپنے آپ کو راستباز سمجھتا ہے راستباز نہیں کہلا سکتا کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس شخص کے دماغ میں کچھ نقص ہو اور ہو سکتا ہے کہ کسی ایسے عقیدہ کی وجہ سے

جو اس جماعت میں پایا جاتا ہو جس سے وہ تعلق رکھتا تھا اس کو یہ خیال ہو گیا ہو کہ میں جو کچھ کہتا ہوں خدا تعالیٰ کی طرف سے کہتا ہوں اور یہ دھوکا ان قوموں میں جو لفظی الہام کے قائل نہیں ہیں بہت آسانی سے لگ سکتا ہے کیونکہ اگر ان میں سے کوئی شخص کسی موعود کے متعلق غور کر رہا ہو کہ وہ کب آئے گا اور بعض عام مشابہتیں جو سینکڑوں آدمیوں میں پائی جاسکتی ہیں اس کو اپنے اندر معلوم ہوں اور یہ خیال پیدا ہو جائے کہ شاید میں ہی وہ شخص ہوں تو بالکل قرین قیاس ہے بلکہ اغلب ہے کہ اگر ذرا بھی اسے کسی نہ کسی سبب سے رسوخ حاصل ہے تو وہ دیانتداری سے یہ خیال کر بیٹھے کہ جو مجھے خیال پیدا ہوا ہے یہ الہامی ہی تھا اور اس کے بعد جب وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ میں ہی وہ موعود ہوں تو چونکہ لفظاً الہام کی تو ضرورت ہی نہیں راستہ بالکل کھل جاتا ہے اپنے ہر خیال کو یہ شخص الہام اور خدا کا کلام سمجھ لے گا۔

پس صرف جماعت میں قربانی اور ایثار کا پیدا ہونا جو صرف نیک نیتی پر دلالت کرتے ہیں نہ کہ خدا کی طرف سے ہونے پر' کافی نہیں بلکہ صفات الٰہیہ کا جماعت میں پیدا ہونا ضروری ہے یعنی جس طرح وہ کامل انسان جو خدا تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے خدا تعالیٰ کی صفت علم اور خلق اور احیاء اور شفاء اور رزق اور ملک وغیرہ کا مظہر تھا اسی طرح اس کی جماعت میں ایسے افراد پیدا ہو جائیں جو اس کی صحبت سے ایسی ہی صفات اپنے ظرف کے مطابق حاصل کرلیں اور گویا اس شخص کے ذریعہ سے مُردہ روحوں کا ایک حشر ہو جائے اور اسی دنیا میں قیامت آکر قیامت کے منکروں پر ایک حُجت ہو۔

حضرت مسیح موعود کی جماعت اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس صفت کو اپنے وجود سے ثابت کر رہی ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ساتھ خدا کا جلال رخصت ہو گیا بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ایک نئی روح دنیا میں پیدا کردی ہے اور آپ کی جماعت میں سے ہزاروں انسان ایسے ہیں جنہوں نے آپ کی زندگی سے زندگی پائی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل کر کے اور اس سے ایک لطیف اتّصال حاصل کر کے یقین اور وثوق کا مقام پایا ہے اور پھر اس کی صفات ان کے اندر بھی پیدا ہو گئی ہیں اور وہ خدا تعالیٰ کی صفات کے مظہر ہو گئے ہیں بلکہ میں کہوں گا کہ بیشتر حصہ احمدی جماعت کا ایسا ہے جس نے اپنے نفس میں معجزات کو دیکھا ہے کسی نے کم اور کسی نے زیادہ اور حضرت کا فیض آپ کے ساتھ ہی ختم نہیں ہو گیا بلکہ جاری ہے اور جب تک خدا چاہے گا اور لوگ آپ کی تعلیم پر چلنے کی کوشش کرتے

رہیں گے جاری رہے گا۔ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ وَھُوَ الْبَرُّ الرَّحِیْمُ

مثال کے طور پر میں دو واقعات اپنی ذات کے ہی پیش کر دیتا ہوں ایک تو یہ کہ چار سال کا عرصہ ہوا کہ مجھے ایک احمدی ڈاکٹر کی نسبت اطلاع ملی کہ وہ عراق میں مارا گیا ہے اس ڈاکٹر کے والدین نہایت بوڑھے تھے اور چند دن پہلے ہی میرے پاس ملاقات کے لئے آئے تھے۔ گو اس کے چند ساتھیوں نے خط بھی لکھ دیئے تھے کہ فلاں جگہ عربوں نے حملہ کیا اور وہ مارا گیا مگر میرے دل میں اس کا اس قدر اثر ہوا کہ بار بار میرے دل سے یہ خواہش اٹھے کہ کاش وہ نہ مرا ہو اور بار بار دل سے دعا نکلے گو میں دل کو سمجھاؤں کہ کیا کبھی مُردے بھی زندہ ہوتے ہیں اب وہ کہاں سے زندہ ہو سکتا ہے۔ تمام دن میری یہی کیفیت رہی اور پھر رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ وہ ڈاکٹر زندہ ہے۔ اس خواب پر مجھے سخت تعجب ہوا لیکن خواب میں ایسی کیفیت تھی کہ میں جانتا تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے گو میں یہ سمجھتا تھا کہ جب وہ مرچکا ہے تو اس کی تعبیر کچھ اور ہوگی اور وہ خواب اسی ڈاکٹر کے ایک رشتہ دار کو جو قادیان میں رہتا ہے میرے چھوٹے بھائی نے جاکر سنادی اور اس نے گھر خط لکھا کہ اس طرح ان کو خواب آئی ہے۔ اس کے چند دنوں کے بعد ڈاکٹر موصوف کے ایک رشتہ دار کا خط آیا کہ اس کی تار آگئی ہے کہ گھبراؤ نہیں میں زندہ ہوں۔ آخر معلوم ہوا کہ اس کو عرب لوگ قید کر کے لے گئے تھے چونکہ اس پارٹی کے قریباً تمام آدمیوں کو عربوں نے قتل کر دیا تھا اس لئے اس کو بھی مُردہ سمجھ لیا گیا۔ آخر اللہ تعالیٰ نے ادھر مجھ کو رؤیا میں اس کی زندگی کی خبر دی اور ادھر یہ سامان کر دیئے کہ انگریزی فوج کا ایک دستہ اس گاؤں کے قریب جا پہنچا جس میں اس کو عربوں نے قید کر رکھا تھا اور گاؤں والے ڈر کر بھاگے اور ڈاکٹر کو بچ نکلنے کا موقع مل گیا اور خدا تعالیٰ نے اس طرح اس کو دوبارہ زندگی عطا کر دی۔

دوسری مثال بالکل تازہ ہے پچھلے بارہ تیرہ سالوں سے طاعون جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی پیشگوئی کے ماتحت اور آپ کی صداقت کے ثبوت کے طور پر ملک میں پھیلائی گئی تھی کم ہونے لگی اور دو تین سال پہلے تو اس میں اس قدر کمی آگئی کہ گورنمنٹ کی طرف سے امید ظاہر کی گئی کہ اب طاعون شاید اگلے سال تک ملک سے بالکل ہی نکل جائے مگر مجھے اس وقت رؤیا میں ایک طاعون کا مریض اور کچھ بھینسیں گلیوں میں دوڑتی ہوئی دکھائی گئیں اور بھینسوں کی تعبیر خواب میں وباء ہوتی ہے میں نے اسی وقت اس خواب کا اعلان کر دیا اور بتایا کہ معلوم ہوتا ہے پھر طاعون کی وباء سخت صورت میں ملک میں پڑنے والی ہے اور میرا یہ اعلان اخبار الفضل کے ۲۴

نومبر کے پرچہ میں شائع کردیا گیا۔ اس خواب کو شائع کئے ابھی ایک ماہ ہی گذرا تھا کہ ملک میں طاعون کا حملہ شروع ہوگیا اور فروری سے تو خوب زور ہوگیا اور مارچ اپریل اور مئی میں ایسی شدت ہوئی کہ ایک ایک ہفتہ میں آٹھ ہزار سے تیرہ ہزار تک موتیں ہوئیں اور اس وقت تک ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ آدمی ہلاک ہوچکا ہے۔ حالانکہ پچھلے پانچ سالوں کی مجموعی ہلاکت بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔

یہ مثالیں میں نے بطور نمونہ دی ہیں ورنہ سینکڑوں دفعہ مجھ پر اللہ تعالیٰ نے اپنے غیب کو ظاہر فرمایا ہے اور اسی طرح ہزاروں احمدی ہیں جن سے خدا تعالیٰ یہ معاملہ کرتا ہے اور وہ معاملہ اس کی مختلف صفات کے ماتحت ہوتا ہے مگر یاد رکھنا چاہئے کہ یہ معاملات کسبی نہیں ہوتے۔ خدا تعالیٰ حکیم ہے اور اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں اس لئے انسان کے منشاء پر ان امور کو نہیں چھوڑا کہ جب چاہے انسان خدا تعالیٰ کے علم یا اس کی قدرت یا اس کی شفاء یا اس کے احیاء یا خلق یا مِلک یا رزق کے خزانہ کو کھول لے یہ غیر معمولی سلوک اس کی خاص حکمت کے ماتحت ظاہر ہوتے ہیں اور محض اس کے فضل سے ہوتے ہیں۔ ہاں وہ اپنے فضل سے اپنے بندوں کا علم اور یقین اور عرفان بڑھانے کے لئے ان کے ساتھ ایسا معاملہ کرتا رہتا ہے جو ان کو دوسرے لوگوں اور دوسری قوموں سے ممتاز کرکے دکھاتا ہے اور ہم لوگ یقین کرتے ہیں کہ اگر کوئی جماعت ہدایت کی طرف سچے طور پر مائل ہو تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کی تسلی کے لئے اب بھی اپنی حکمت کاملہ کے ماتحت اپنی کسی صفت کا اظہار کردے گا کیونکہ وہ اپنے بندوں کی ہدایت کو محبوب رکھتا ہے اور ان کی گمراہی اور اس سے دوری کو ناپسند رکھتا ہے۔

اس امر کے ثابت کردینے کے بعد کہ اسلام خدا تعالیٰ کے متعلق کامل تعلیم دیتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خدا تعالیٰ سے اسی دنیا میں ملادیتا ہے اور یقین اور وثوق کے ایسے دروازے انسان کے لئے کھول دیتا ہے کہ شک اور شبہ کی اس کو گنجائش نہیں رہتی اور وہ نہایت خوشی سے موت کا منتظر رہتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میں نے حق پالیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کا ایک ایک کرکے اسی دنیا میں مشاہدہ کرلیا ہے اور اب میرے لئے موت کے بعد کچھ نہیں مگر خیر اور بے انتہاء ترقیات۔

اب میں دوسرے مقاصد کی نسبت اسلام کی تعلیم لکھتا ہوں۔

مقصد دوم

اخلاق اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ مقصد بھی پہلے مقصد کے تابع ہے کیونکہ جس شخص کو خدا تعالیٰ کی کامل معرفت حاصل ہو جاتی ہے وہ بدی کے قریب بھی نہیں جاتا اور جس قدر کوئی شخص بدی میں ملوث ہوتا ہے اسی قدر وہ حجاب میں ہوتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ [۱۳۰] وہ لوگ جو گناہ کرتے ہیں بوجہ قلت معرفت کے یعنی گناہ کا اصل باعث معرفت کی کمی ہے۔ عقل انسانی بھی قرآن کریم کے اس دعویٰ کی تائید کرتی ہے کہ کوئی شخص دانا سمجھتے بوجھتے ہوئے آگ میں ہاتھ نہیں ڈالتا۔ جسے معلوم ہوتا ہے کہ کھانے میں زہر ہے وہ اسے کبھی نہیں کھاتا جسے یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں مکان کی چھت یقیناً اس وقت گر جائے گی جب وہ اندر داخل ہونے لگے گا وہ کبھی اس میں داخل نہیں ہوگا' جسے معلوم ہے کہ فلاں سوراخ میں سانپ ہے وہ کبھی اس میں ہاتھ نہیں ڈالے گا' جو جانتا ہوگا کہ فلاں غار میں شیر بیٹھا ہے وہ اس میں بلا ہتھیار کے کبھی داخل نہ ہوگا پس جب لوگ آگ اور سانپوں اور شیروں اور زہروں سے اس قدر ڈرتے ہیں تو کس طرح ممکن ہے کہ اگر انکو خدا تعالیٰ کا کامل عرفان ہو اور معلوم ہو کہ سب بدیاں اور بداخلاقیاں زہروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بڑھ کر اور شیروں اور سانپوں کی مانند ہیں بلکہ ان سے خطرناک تو وہ ان کے ارتکاب پر اس قدر دلیری کریں گے کہ گویا وہ ایک لذیذ طعام ہے کہ جن کے کھانے پر ان کی زندگی کا انحصار ہے؟

پس صاف معلوم ہوتا ہے کہ ارتکاب بدی بوجہ جہالت اور کمیٔ عرفان کے ہے اور جو مذہب عرفان پیدا کر دے گا وہ گویا اپنے ماننے والوں کے لئے اخلاق کامل کے حصول کا دروازہ بھی کھول دے گا۔ مگر چونکہ اس مضمون کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے اور اکثر لوگ اس سے دلچسپی رکھتے ہیں اور چونکہ بہت سے لوگ اجمالی نکتہ سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے بلکہ کسی قدر تشریح کے محتاج ہوتے ہیں میں اختصار کے ساتھ اس مقصد کے متعلق جو اسلام کی تعلیم ہے اس کو بھی بیان کرتا ہوں۔

میں نے ذات باری کے متعلق اسلامی تعلیم بیان کرتے ہوئے توجہ دلائی تھی کہ خدا تعالیٰ کی صفات کے متعلق اجمالی بیانات میں مختلف مذاہب کا اتفاق ہمیں کوئی علمی نفع نہیں دیتا۔ جس امر کی دنیا کو ضرورت ہے وہ اسمائے الٰہیہ کی تفصیل ہے۔ پس صرف تفصیل میں اتفاق' اتفاق کہلا سکتا ہے

اور جب تک کسی مذہب کی تفصیلی تعلیم اجمالی تعلیم کے مطابق نہ ہو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ خدا تعالیٰ کے متعلق صحیح تعلیم دیتا ہے کیونکہ اجمالی تعلیم میں راستی پر قائم رہنے پر وہ اس لئے مجبور ہے کہ فطرت انسانی اس امر کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں کہ خدا تعالیٰ کی طرف کوئی نقص منسوب کیا جائے مگر اس صورت میں کہ اس کو فلسفیانہ اور پیچ در پیچ تشریحات کے اندر چھپا کر پیش کیا جائے۔ پس جب تک کہ کسی مذہب کی تفصیلات اُن اسماء کے مطابق نہیں ہیں جو وہ خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرتا ہے اس وقت تک نہ اس مذہب کا حق ہے کہ یہ دعویٰ کرے کہ وہ ان صفات کو واقع میں تسلیم کرتا ہے جن کو وہ اجمالاً پیش کرتا ہے اور نہ اس اجمال سے کوئی دوسرا شخص یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ سب مذاہب میں اس امر میں اشتراک ہے۔ کوئی شخص پانی کا نام دودھ رکھ لے تو وہ دودھ نہیں بن سکتا جب تک کہ اس میں دودھ کی خاصیتیں بھی نہ پائی جائیں بعینہٖ اسی طرح اخلاق کا حال ہے۔ مذاہب کی اخلاقی تعلیم کا مقابلہ کرتے ہوئے ہمیں یہ نہیں دیکھنا چاہئے کہ مختلف مذاہب اجمالاً اخلاق کی نسبت کیا کہتے ہیں کیونکہ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی مذہب دنیا میں ایسا ہوگا کہ جو اپنے پیروؤں کو یوں کہے گا کہ تُو اگر خدا کو خوش کرنا چاہتا ہے تو جھوٹ بول اور چوری کر اور ظلم کر اور لوگوں کا مال چھین اور جب کوئی شخص تیرے پاس امانت رکھے تو کبھی واپس نہ کیجیؤ اور فحش اور بدگوئی کی عادت ڈال اور جھگڑے اور فساد اور اختلاف کا اپنے آپ کو خُوگر بنا۔ اور نہ میں خیال کرتا ہوں کہ کوئی مذہب ایسا ہوگا جو یہ کہے گا کہ تُو سچ نہ بول اور نرمی نہ کر اور محبت سے کام نہ لے اور اصلاح سے نفرت کر اور امانت نہ رکھ اور شرافت کو اپنے پاس نہ آنے دے اور وقار اور سکینت سے دور بھاگ اور شکر اور احسان کا مادہ اپنے دل میں پیدا نہ ہونے دے۔

جو مذہب بھی دنیا میں قبولیت حاصل کرنے کی خواہش رکھتا ہے اور اپنے ہم چشموں میں اعزاز حاصل کرنا چاہتا ہے اسے یقیناً ان تمام اخلاق کے متعلق وہی تعلیم دینی پڑے گی جو سب مذاہب میں مشترک ہے اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو فطرت انسانی اس کا مقابلہ کرے گی اور چند دن میں وہ دنیا کے پردہ سے اٹھا دیا جائے گا۔ پس اس قسم کی تعلیم اگر کسی مذہب کی طرف سے پیش ہو تو اس کا کچھ بھی فائدہ نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ تعلیم سب مذاہب میں مشترک ہے اور کسی مذہب کو اس پر فخر کرنے کا حق نہیں کہ وہ اس میں دوسرے مذاہب سے اشتراک رکھتا ہے اور نہ اس اشتراک سے ہم علمی طور پر کوئی فائدہ حاصل کرسکتے ہیں کیونکہ یہ اشتراک بوجہ مجبوری کے ہے نہ

کہ کسی سچی کوشش اور محنت کے نتیجہ میں۔ مجھے بعض مذاہب کے پیروؤں پر جب وہ اپنے مذہب کی اخلاقی تعلیموں کو ایک جگہ جمع کر کے لوگوں میں پھیلاتے اور اس پر فخر کرتے ہیں اور ان کو اپنے مذہب کی سچائی کی دلیل قرار دیتے ہیں نہایت ہی تعجب ہوا کرتا ہے کیونکہ واقع یہ ہے کہ ان کو ان تعلیموں میں کوئی امتیاز حاصل نہیں۔ تمام مذاہب خواہ وہ کیسے ہی پرانے ہوں اور خواہ کیسے ہی غیر تعلیمیافتہ علاقوں میں اور زمانوں میں انہوں نے نشوونما پایا ہو ان مسائل میں ان سے اشتراک رکھتے ہیں۔ بلکہ حق یہ ہے کہ جو قومیں مذہب کو سمجھ بھی نہیں سکتیں اور تعلیم سے بالکل کوری ہیں اور وحشیوں میں گنی جاتی ہیں اگر ان کا عمل نظرانداز کر دیا جائے اور آرام سے بٹھا کر اور آہستگی سے ان میں اخلاق کے متعلق پوچھا جائے تا وہ گھبرا نہ جائیں تو وہ بھی اخلاق کے متعلق وہی امور بتائیں گی جو متمدن مذاہب پیش کرتے ہیں۔ پس اس امر پر اپنے مذاہب کی سچائی کی بنیاد رکھنا جو مذاہب علمیہ تو الگ رہے وحشی اقوام میں بھی مشترک ہے بالکل غیر معقول بات ہے۔ اخلاقی تعلیم کا مقابلہ کرنے کے لئے جن امور کو مدنظر رکھنا ضروری ہے وہ اخلاق کی تفاصیل' اخلاق کے اسباب' اخلاق کے حصول کے ذرائع' بدیوں سے بچنے کے ذرائع اور اس قسم کے اور امور ہیں۔

اس کے بعد میں اس امر کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ اخلاق کی تعریف سمجھنے میں لوگوں کو بہت کچھ دھوکا لگا ہوا ہے اور اس کی وجہ سے بھی صحیح موازنہ اخلاقی تعلیم کا نہیں ہو سکتا۔ عام طور پر لوگوں میں یہ احساس ہے کہ محبت اور عفو اور دلیری وغیرہا اچھے اخلاق ہیں اور غضب اور نفرت اور سختی اور خوف وغیرہا بُرے اخلاق ہیں حالانکہ یہ بات نہیں۔ یہ تمام امور طبعی ہیں اس لئے ان کو اچھا یا بُرا کہنا درست نہیں نہ محبت کوئی خلق ہے' نہ عفو کوئی خلق ہے' نہ دلیری کوئی خلق ہے' نہ سختی' نہ خوف' نہ نفرت کوئی خلق ہیں یہ سب انسان کے طبعی تقاضے ہیں بلکہ حیوان کے طبعی تقاضے ہیں۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ سب تقاضے جانوروں میں بھی پائے جاتے ہیں جانور بھی محبت کرتے ہیں عفو کرتے ہیں' دلیری دکھاتے ہیں' سختی کرتے ہیں' خوف کھاتے ہیں' نفرت کرتے ہیں مگر کوئی شخص نہیں جو یہ کہے کہ یہ گائے بہت اعلیٰ اخلاق کی ہے یا یہ بکری بہت ہی اچھے اخلاق رکھتی ہے یا یہ گھوڑا بہت ہی وسیع الاخلاق ہے۔ جانوروں کی تعریف کرتے ہوئے ہم انہی امور کو جو انسان میں پائے جائیں انہیں اخلاق فاضلہ قرار نہیں دیتے بلکہ ان کی طبعی عادات قرار دیتے ہیں۔ پس غور کا مقام ہے کہ یہ فرق کیوں ہے؟ جو باتیں انسان میں اخلاق فاضلہ ہیں کیوں وہی

حیوانوں میں اخلاق فاضلہ نہیں کہلاتیں؟ اس کی وجہ صاف ہے کہ ہم فطرتاً جانتے ہیں کہ ان طبعی امور کا نام اخلاق نہیں ہے بلکہ اخلاق کچھ اور شئے ہیں اس وجہ سے ہم انسانوں کو با اخلاق کہتے ہیں اور جانوروں کو نہیں۔

اب یہ سوال ہے کہ وہ کونسا فرق ہے جس کی وجہ سے ایک انسان میں جب وہ امور پائے جائیں تو اخلاق فاضلہ کہلاتے ہیں اور جانوروں میں پائے جائیں تو اخلاق فاضلہ نہیں بلکہ طبعی تقاضے کہلاتے ہیں؟

سو یاد رکھنا چاہئے کہ طبعی تقاضے جب عقل اور مصلحت کے ماتحت آئیں تب ان کو اخلاق کہتے ہیں ورنہ نہیں۔ اور چونکہ انسان سے امید کی جاتی ہے کہ اس کے تمام کام عقل اور مصلحت کے ماتحت ہونگے کیونکہ یہی خاصیتیں اس کو دوسرے حیوانوں سے ممتاز کرنے والی ہیں اس لئے جب انسان ان تقاضوں کو استعمال کرتا ہے تو بطور حسن ظنی اس کو اخلاق کہا جاتا ہے ورنہ بسا اوقات ہو سکتا ہے کہ ایک انسان کا فعل بھی طبعی تقاضے کے ماتحت ہو اور اس وجہ سے اخلاق میں شامل نہ ہو اور یہ امر کہ لوگوں میں مشہور اخلاق طبعی تقاضے ہیں اس بات سے بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ ایسے نرم ہوتے ہیں کہ ان کے سامنے کوئی کچھ کرے وہ کچھ نہیں بولتے اور بعض لوگ بالطبع ایسے ہوتے ہیں کہ ہر اک امر جس کا ارادہ کرلیں اس سے پیچھے نہیں ہٹتے۔ اب ان دونوں شخصوں کی نسبت یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ نہایت ہی اعلیٰ اخلاق کے ہیں کیونکہ ان دونوں سے یہ فعل کسی ارادے کے ماتحت سرزد نہیں ہوتے بلکہ وہ ایسا کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اسی طرح ایک شخص مثلاً جس کی زبان نہیں وہ کسی کو گالی نہیں دیتا۔ یا مثلاً جس شخص کے ہاتھ نہیں وہ کسی کو مارتا نہیں تو اس کو نہایت اعلیٰ اخلاق کا آدمی نہیں کہا جائے گا۔ غرض اخلاق کی تعریف یہ ہے کہ طبعی تقاضوں کو برمحل استعمال کیا جائے نہ یہ کہ طبعی تقاضوں کو استعمال کیا جائے۔

پس جب اخلاق کی تعریف ہمیں معلوم ہو گئی تو ہم آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ جو مذہب ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ تم نرمی کرو' یا یہ کہ دلیری کرو' یا عفو کرو' یا یہ کہ محبت کرو وہ ہمیں اخلاق نہیں سکھاتا بلکہ وہی باتیں سکھاتا ہے جو ہماری طبیعت میں پیدائش سے موجود ہیں۔ کیا جانور نرمی نہیں کرتے؟ کیا وہ دلیری نہیں دکھاتے کیا وہ عفو سے کام نہیں لیتے؟ کیا وہ محبت نہیں کرتے؟ کیا وہ ہمدردی نہیں کرتے؟ ہم نے تو بارہا دیکھا ہے کہ ہر ایک زخمی جانور کے پاس دوسرا جانور آ بیٹھتا

ہے اور اس کو ایسے عجیب انداز سے دیکھتا ہے کہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس سے ہمدردی کا اظہار کر رہا ہے اور پھر بعض دفعہ اسے محبت سے چاٹنے لگتا ہے۔ پس اس قسم کی تعلیم ایسی ہی ہے جیسے کسی مذہب کا یہ تعلیم دینا کہ اے لوگو! کھانا کھایا کرو' یا پانی پیا کرو' نیند آئے تو سوجایا کرو ان طبعی تقاضوں کے پورا کرنے کے لئے کوئی شخص کسی مذہب کا محتاج نہیں ہے۔ ان تقاضوں کو اس کی فطرت خود پورا کرواتی ہے اور جو مذہب اس میں دخل دیتا ہے وہ گویا اپنی کمزوری کا اظہار کرتا ہے کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اخلاق کی حقیقت سے واقف نہیں۔

کیا کوئی شخص کوئی ایسا ملک بتا سکتا ہے جہاں لوگ محبت نہ کرتے ہوں یا ہمدردی کا مادہ نہ رکھتے ہوں یا عفو کا ان میں رواج نہ ہو یا غرباء کو کچھ نہ دیتے ہوں؟ یا کوئی شخص ایسا بھی دنیا میں ہے کہ جو ان صفات کا اظہار نہ کرتا ہو اور ان سے خالی ہو؟ اگر نہیں تو مذہب کو اس میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے؟

اور اگر نرمی کرو' عفو کرو' دلیری کرو سے مذہب کی یہ مراد ہو کہ سختی نہ کرو' سزا نہ دو' خوف کا اظہار کسی صورت میں نہ کرو تو پھر بیشک یہ ایک نئی بات ہوگی مگر یہ امر بھی فطرت کے مخالف ہوگا۔ فطرت نے یہ باتیں انسان کے اندر رکھی ہیں اور ان کو کسی صورت میں چُھڑوایا نہیں جا سکتا اور نہ ان کو چھوڑنا انسان کو نفع دے سکتا ہے کیونکہ جو باتیں فطرت میں پائی جاتی ہیں وہ ہمیشہ انسان کے لئے کارآمد ہوتی ہیں۔ ان کو چُھڑوانا اس کی اخلاقی حالت کو گرا دیتا ہے نہ کہ اس میں خوبی پیدا کرتا ہے مثلاً یہ کہنا کہ نرمی ہی کرو سختی نہ کرو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ طالب علم کو استاد کبھی نہ ڈانٹے۔ ماں باپ بچوں کو کبھی تنبیہہ نہ کریں' حکومت اپنے باغیوں کا کبھی مقابلہ نہ کرے اور خوف نہ کھاؤ کے یہ معنے ہونگے کہ خواہ غلط طریق پر چلے جارہے ہو اس سے پیچھے نہ ہٹو اور انجام سے نہ ڈرو اور کسی نقصان کی خواہ دین یا مذہب کا ہی کیوں نہ ہو پرواہ نہ کرو اور کوئی عقلمند نہیں کہہ سکتا کہ یہ اخلاق فاضلہ ہیں۔

غرض کہ اخلاق یہ ہیں کہ طبعی حالتوں کو ان کے محل اور موقع پر استعمال کیا جائے اور صرف طبعی حالتوں پر زور دینا عبث فعل ہے اور بعض طبعی حالتوں سے روکنا فطرت کے خلاف اور فساد اور خرابی پیدا کرنے کا موجب ہے۔ پس وہی مذہب اخلاق کی حقیقت کو سمجھتا ہے اور وہی مذہب اخلاق کی تعلیم دیتا ہے جو اس حقیقت کے ماتحت اپنے احکام کو رکھتا ہے نہ وہ جو صرف طبعی حالتوں کو دہراتا جاتا ہے۔ اور جہاں تک میرا علم جاتا ہے صرف اسلام ہی ہے کہ جس نے اس حقیقت کو

سمجھا اور اخلاق کو ان کی اصل شکل میں پیش کیا ہے چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَی اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ۔ [۱۳۱] اور بدی کا بدلہ اتنا ہی ہے جتنا کہ جرم تھا پھر جب کوئی کسی کو نقصان پہنچائے اور وہ اس کے گناہ کو معاف کردے اس طرح کہ اس سے اصلاح پیدا ہوتی ہو اس کا نتیجہ فساد نہ ہو تو ایسے شخص کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ یعنی جو جرم سے زیادہ سزا دے یا باوجود اس کے کہ عقلاً معلوم ہوتا ہو کہ مجرم کو سزا دی گئی تو اس کے اخلاق اور بھی بگڑ جائیں گے اور وہ اور بھی نیکی سے محروم ہو جائے گا محض دکھ دینے کے لئے اس کو سزا دیدے یا یہ کہ معلوم ہوتا ہو کہ اس شخص کو اگر معاف کیا تو گناہ پر اور بھی دلیر ہو جائے گا اور لوگوں کو نقصان پہنچائے گا معاف کردے تو ایسا شخص ظالم ہو گا۔ اور خدا اس کے اس فعل کو پسند نہیں کرے گا۔

اب دیکھو کہ اسلام نے کس طرح اخلاق کی حقیقت کو پیش کیا ہے۔ پہلے بتایا ہے کہ جرم کی اسی قدر سزا دینا اصل حکم ہے گو یہ ایک طبعی تقاضا ہے کہ جس سے نقصان پہنچے اس کو اسی قدر نقصان پہنچایا جائے مگر فرمایا کہ انسان جو با اخلاق بننا چاہتا ہے اس کو اس بات پر غور کرنا ہو گا کہ آیا سزا سے مجرم کی اصلاح ہوتی ہے یا عفو سے پھر اگر عفو سے اصلاح کا احتمال ہو تو چاہئے کہ عفو سے کام لے اور انتقام نہ لے اور اگر سزا سے اصلاح ہوتی ہو تو محض اپنے دل کی کمزوری کی وجہ سے اسے معاف نہ کردے کیونکہ اس طرح وہ شخص اصلاح سے محروم رہ جائے گا اور یہ رحم نہیں ہو گا بلکہ ظلم ہو گا۔ اور جو شخص باوجود جاننے کے کہ سزا سے یا عفو سے زید کی اصلاح ہوتی ہے اس کے خلاف کام کرے گا تو وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک ظالم ہو گا خواہ اس نے معاف ہی کیوں نہ کیا ہو کیونکہ یہ معافی معافی نہیں بلکہ اپنے ایک بھائی کے اخلاق کو دیدہ و دانستہ تباہ کرنا ہے۔

رسول کریم ﷺ نے اس مضمون کو اور الفاظ میں ادا کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں اَلْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ [۱۳۲] یعنی انسانی اعمال تو وہ ہیں جو ارادے سے اور نیت کے ماتحت کئے جائیں یعنی جو کام محض طبعی جوش کے ماتحت کیا جاتا ہے وہ ہرگز انسانی عمل نہیں کہلا سکتا بلکہ وہ تو ایک حیوانی جذبہ ہو گا۔ اگر گھوڑا یا گدھا ان حالات میں ہوتا تو وہ بھی اسی طرح کرتا۔ پس جب تک فکر اور غور کے بعد کام کے تمام پہلوؤں کو دیکھ کر کوئی رائے نہ قائم کی جائے اور اس کے مطابق عمل نہ کیا جائے وہ خلق یعنی انسانی فعل نہیں کہلا سکتا۔

مذکورہ بالا بیان سے اچھی طرح معلوم ہو سکتا ہے کہ اسلام نے اخلاق کی حقیقت کو سمجھا ہے

اور اس کے مطابق تعلیم دی ہے۔ پس وہی مذہب اخلاقی تعلیم میں اس کے مقابلہ پر آسکتا ہے جو پہلے یہ ثابت کرے کہ اس نے بھی اخلاق کو سمجھا ہے اور اس کے مطابق تعلیم دی ہے ورنہ طبعی تقاضوں کا ذکر کر کے ان کا نام اخلاقی تعلیم رکھنا ظلم اور زبردستی ہے۔

یہ بیان کرنے کے بعد کہ اسلام کے نزدیک اچھے اخلاق کے معنے یہ ہیں کہ انسان طبعی تقاضوں کو عقل اور مصلحت کے ماتحت استعمال کرے اور برے اخلاق کے یہ معنے ہیں کہ بِلا سوچے سمجھے بے محل اور بے موقع طبعی تقاضوں کو استعمال کرے۔ میں چند احکام کے متعلق بطور مثال اسلامی تعلیم پیش کرتا ہوں جس سے معلوم ہو گا کہ کس طرح ہر ایک طبعی تقاضے کو اسلام نے حد بندی کے نیچے رکھا ہے اور اس سے بہترین نتائج پیدا کئے ہیں۔

یاد رکھنا چاہئے کہ اسلام نے اخلاق کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے یعنی اخلاقِ قلب اور اخلاقِ جوارح اور اس طرح اخلاق کے معیار کو بہت بلند کر دیا ہے چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ [۱۳۳]۔ تم بدیوں کے قریب بھی نہ جاؤ نہ ان بدیوں کے جو لوگوں کو معلوم ہوتی ہیں یا ہو سکتی ہیں اور نہ ان کے جو بالکل مخفی ہیں اور لوگوں کی نظروں میں آ ہی نہیں سکتیں یعنی جن کا مرتکب دل ہوتا ہے۔ ان کے معلوم کرنے کا کوئی ظاہری سامان لوگوں کے پاس نہیں سوائے اس کے کہ کرنے والا خود ہی بتائے۔

اسی طرح فرماتا ہے وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْکُمْ بِهِ اللّٰهُ [۱۳۴]۔ اگر تم ظاہر کرو جو تمہارے دلوں میں ہے یعنی اس کے مطابق عمل کرو تو بھی اور اگر تم اس کو جو تمہارے دلوں میں ہے چھپاؤ یعنی صرف دل کے خیالات تک محدود رکھو جوارح اس کے مطابق کوئی عمل نہ کریں تو بھی اللہ تعالیٰ اس کے متعلق تم سے سوال کرے گا یعنی دریافت کرے گا کہ تم نے کیوں دل میں بدی کو جگہ دی یا بدی پر عمل کیا؟

اعمال انسانی کو ظاہر و باطن کی دو قسموں میں تقسیم کرنے کے بعد اسلام نے ان کو پھر دو حصوں میں تقسیم کیا ہے یعنی ان میں سے بعض کو اچھا قرار دیا ہے اور بعض کو برا چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ [۱۳۵]۔ خلق دو قسم کے ہیں ایک اچھے اور ایک بُرے اور اچھے خلق برے خلقوں پر غالب آجاتے ہیں یعنی جو شخص اچھے اخلاق کو اختیار کرتا ہے وہ آہستہ آہستہ بُرے اخلاق پر غالب آجاتا ہے۔ پھر اچھے اور بُرے خلقوں کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے یعنی وہ خلق جن کا اثر صرف اس کی ذات پر پڑتا ہے اور ایک وہ جن کا اثر

دوسرے کی ذات پر ڈالنے کا ارادہ کیا جاتا ہے یا دوسرے کی ذات پر ان کا اثر ڈال دیا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا تقسیموں سے آپ لوگوں نے اچھی طرح معلوم کر لیا ہو گا کہ اسلام نے اخلاق کو دوسرے مذاہب کی نسبت وسیع کر دیا ہے یعنی اخلاق کا دائرہ صرف دوسروں تک محدود نہیں رکھا بلکہ خود انسان کے نفس کو بھی اس کے اندر شامل رکھا ہے چنانچہ قرآن کریم صاف طور پر اس مسئلہ کی طرف ان الفاظ میں اشارہ فرماتا ہے کہ یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اھْتَدَیْتُمْ [۱۳۶]۔ اپنی جانوں کی خبر رکھو اور ان کے روحانی حقوق ادا کرو۔ حتّٰی کہ اگر کسی شخص کی نجات اس طرح ممکن سمجھی جاتی ہو کہ تم اپنے آپ کو گناہ میں ڈال لو تو ہرگز ایسا نہ کرو کیونکہ اگر کوئی شخص تمہاری ہدایت پر قائم رہنے اور نیکی کے اختیار کرنے میں گمراہ ہوتا ہو تو اللہ تعالیٰ تم پر اس وجہ سے ناراض نہیں ہو گا اور یہ ہرگز نہیں کہے گا کہ تم نے کیوں بدی کو اختیار کر کے اس شخص کو گناہ سے نہ بچا لیا۔ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ لِنَفْسِکَ عَلَیْکَ حَقٌّ [۱۳۷]۔ تیرے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے یعنی صرف دوسرے لوگوں کا خیال ہی ضروری نہیں بلکہ اپنے نفس سے باطنی اور ظاہری نیکی کرنی یعنی اس کی روحانی اور جسمانی ربوبیت کا خیال رکھنا بھی تیرے لئے ضروری ہے۔

اس تعلیم اسلام کے ماتحت جو شخص ظاہری تکبر کرتا ہے اسی کو بد اخلاق نہیں کہا جائے گا بلکہ جو شخص ظاہری تواضع اور انکسار کا طریق برتتا ہے لیکن اپنے دل کے مخفی کونوں میں تکبر کا خیال چھپائے ہوئے ہے وہ بھی اسلام کے نزدیک بد اخلاق ہو گا کیونکہ گو اس نے دوسرے شخص کو دکھ نہیں دیا مگر اپنے نفس کو اس نے بگاڑ دیا اور ناپاک کیا چنانچہ قرآن کریم نے اس فرق کو مفصلہ ذیل آیت میں بیان فرمایا ہے لَقَدِ اسْتَکْبَرُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ وَعَتَوْا عُتُوًّا کَبِیْرًا [۱۳۸]۔ ان لوگوں نے اپنے دل میں بھی تکبر کیا اور ظاہر میں بھی لوگوں پر اپنی بڑائی کو ظاہر کیا اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے دل میں کسی کی نسبت بد خیال رکھتا ہے اس کو بھی اسلام ایک بد اخلاقی قرار دے گا خواہ وہ اس خیال کو ظاہر کرے یا نہ کرے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ [۱۳۹]۔ بعض دلی گمان بھی گناہ ہوتا ہے یعنی جب وہ بد ظنی پر مبنی ہو اسی طرح ظلم و فساد خیانت وغیرہ کے خیالات یہ سب بد اخلاقیاں ہیں اور ایسے شخص کو جو انکا مرتکب ہے گو جرأت کی کمی اور سامان کے میسّر نہ آنے کے سبب سے ظاہر میں ان کے مطابق عمل نہیں کر سکتا وہ اسلام کے مطابق بد خُلق ہے اور ہرگز اس کے ظاہر عمل کی بناء پر اسے نیک اخلاق والا نہیں سمجھا جائے گا۔ اسی

طرح جو شخص دل میں لوگوں کے متعلق نیک خیالات رکھتا ہے ان کی بھلائی چاہتا ہے اور ان کو فائدہ پہنچانا چاہتا ہے اگر بوجہ سامان کی کمی یا موقع کے میسر نہ آنے کے ان خیالات کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتا تو نیک اخلاق والا سمجھا جائے گا۔

مگر اس قاعدہ میں ایک استثناء ہے اور وہ یہ کہ جس شخص کے دل میں بد اخلاقی کے خیالات آتے ہیں مثلاً اپنے بھائیوں کی نسبت بد ظنی کا خیال پیدا ہوتا ہے یا تکبر کا یا حسد کا یا نفرت کا لیکن یہ شخص اس خیال کو دبا لیتا ہے تو یہ بد اخلاقی نہیں سمجھی جائے گی کیونکہ ایسا شخص درحقیقت بد اخلاقی کا مقابلہ کرتا ہے اور تعریف کا مستحق ہے۔ اسی طرح جس شخص کے دل میں ایک آنی خیال نیکی کا آئے یا آنی طور پر حسن سلوک کی طرف اس کی طبیعت مائل ہو لیکن وہ اس کو بڑھنے نہ دے تو ایسا شخص بھی نیک اخلاق والا نہیں سمجھا جائے گا کیونکہ جیسا کہ ثابت کیا جاچکا ہے اخلاق وہ ہیں جو ارادے کا نتیجہ ہوں لیکن مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں اچھے یا برے خیالات ارادہ کا نتیجہ نہیں ہوتے بلکہ بیرونی اثرات کے نتیجہ میں بلا ارادے کے پیدا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم اس نکتہ کو ان الفاظ میں بیان فرماتا ہے۔

وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ [۱۴۰]۔ لیکن اللہ تعالیٰ تم کو صرف ان خیالات پر پکڑتا ہے جو ارادے اور فکر کے ماتحت پیدا ہوتے ہیں نہ ان پر جو اچانک پیدا ہو جاتے ہیں اور تم ان کو فوراً دل سے نکال دیتے ہو۔ رسول کریم ﷺ اس کی تشریح یوں فرماتے ہیں کہ بد خیال اچانک پیدا ہو جانے پر جو شخص اس خیال کو نکال دیتا ہے اور اس پر عمل نہیں کرتا ایسا شخص نیکی کا کام کرتا ہے اور اجر کا مستحق ہے آپ فرماتے ہیں ومن ھم بسیئۃ فلم یعملھا کتبھا اللہ عندہ حسنۃ کاملۃ [۱۴۱]۔ اور اگر کسی شخص کے دل میں برا خیال پیدا ہو اور وہ اس کو دبالے اور اس کے مطابق عمل نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے حق میں ایک پوری نیکی لکھے گا۔ یعنی بد خیالات کے دبانے کی وجہ سے اس کو نیک بدلہ ملے گا۔

اس قسم کا امتیاز اللہ تعالیٰ نے ظاہری اعمال میں بھی مدنظر رکھا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى۔ اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ [۱۴۲]۔ اللہ تعالیٰ نیک لوگوں کو اچھے بدلے دے گا جو کہ تمام بڑی بدیوں اور چھوٹی بدیوں سے بچتے ہیں گو ایسا ہوتا ہو کہ وہ کسی آنی جوش میں کسی گناہ کی طرف مائل ہو جاتے ہوں مگر فوراً ہی سنبھل کر اپنے قدم پیچھے کی طرف ہٹا لیتے ہوں۔ مطلب یہ کہ آنی یا فوری جوش کے ماتحت یا

غفلت سے اگر کوئی شخص ٹھوکر کھاتا ہے لیکن جونہی کہ اس کا نفس اس امر کو محسوس کرتا ہے اور وہ سمجھ لیتا ہے کہ میں فلاں کام کرنے لگا ہوں تو جھٹ اس سے رک جاتا ہے اور اپنے نفس کو سلامتی کے کنارے کی طرف کھینچ لاتا ہے تو وہ بداخلاق نہیں سمجھا جائے گا بلکہ اس کا یہ فعل مستحسن ہوگا اور وہ شخص اس سپاہی کی طرح ہوگا جو اپنے ملک کے لئے لڑ رہا ہے مگر ابھی فتح کا منہ اس نے نہیں دیکھا۔

اخلاق کے متعلق عملی طور پر اسلام کی تعلیم بتانے کے بعد میں چند اخلاق بطور مثال بیان کرتا ہوں کیونکہ یہ مضمون اس قدر وسیع ہے کہ اگر اسے بالاستیعاب بیان کیا جائے تو بہت ہی لمبا وقت چاہتا ہے اور اپنے اس بیان میں دوسری ترتیبوں کو نظرانداز کرکے میں صرف اس امر کو مدنظر رکھوں گا جو اخلاق کی تعریف میں مَیں نے بیان کیا تھا یعنی اخلاق طبعی تقاضوں کے برمحل اور مناسب موقع پر استعمال کا نام ہے اور گو اس وجہ سے مجھے دوسری ترتیبوں کو نظرانداز کرنا پڑے گا مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ تقسیم زیادہ مؤثر اور مفید ہوگی۔

سب سے پہلے میں انسان کے طبعی تقاضوں سے **رأفت** اور نقم کو لیتا ہوں۔ انسان کے اندر اور جانوروں کے اندر بھی یہ مادہ پایا جاتا ہے کہ وہ عام طور پر دوسرے کو تکلیف پہنچانے سے احتراز کرتے ہیں اور دوسروں کی تکلیف ان کے قلب پر ایک عجیب اثر پیدا کردیتی ہے جس کی وجہ سے وہ اس کی تکلیف کو خود محسوس کرنے لگ جاتے ہیں۔ ایک مریض بازار میں پڑا نظر آتا ہے تو قریباً تمام افراد کے دل میں اس کی نسبت ایک کشش اور درد محسوس ہونے لگتا ہے سوائے ان لوگوں کے جن کو کوئی سخت شغل اپنی طرف مشغول کئے ہوئے ہو یا جن کو اس شخص سے کوئی تکلیف پہنچی ہوئی ہو۔ مؤخرالذکر حالت میں دیکھا گیا ہے کہ بعض دفعہ ایسا شخص اس مصیبت زدہ کی حالت پر خوش ہوتا ہے اور یہ حالت نقم کی کہلاتی ہے۔ یہ حالت بھی ایک الگ جذبہ ہے اور ایسے وقت میں ظاہر ہوتا ہے جب کسی کو کسی سے کوئی تکلیف پہنچے اور اس کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اس وقت انسان کا دل چاہتا ہے کہ میں اس تکلیف پہنچانے والے کو ایذاء پہنچاؤں۔ اس جذبہ کے غالب آجانے کی وجہ سے رأفت کا جذبہ دب جاتا ہے اور بجائے اس کے کہ یہ شخص یہ خیال کرے کہ میرے ایذاء دینے سے اسے تکلیف ہوگی اور اس کو سوچ کر اس کے دل کو تکلیف ہو اور دوسرے کی نسبت رأفت محسوس ہو یہ اس خیال میں کہ دوسرے کو تکلیف ہو بعض دفعہ لذت محسوس کرنے لگتا ہے۔

یہ صورت نقم کی جب تک کہ کسی قانون کے ماتحت نہیں آتی کئی شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے کبھی تو جسے تکلیف پہنچی ہوتی ہے وہ اس شخص کو سزا دینے پر جس سے اسے تکلیف پہنچی ہے قادر ہوتا ہے یا سمجھتا ہے کہ میں قادر ہوں۔ اس وقت تو وہ اسے کسی قسم کی تکلیف پہنچاتا ہے یا پہنچانی چاہتا ہے جس سے اس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ تکلیف دینے والے کے دل کو بھی اسی طرح صدمہ پہنچے جس طرح کہ مجھے پہنچا ہے۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جس نے تکلیف دی تھی وہ زیادہ طاقتور ہوتا ہے یا اس کے عزیز رشتہ دار زیادہ طاقتور ہوتے ہیں یا مصیبت زدہ شخص سمجھتا ہے کہ حقیقی تکلیف پہنچانے کا اثر لوگوں پر اچھا نہیں پڑے گا وہ اسے برا سمجھیں گے یا اور کوئی وجہ ایسی پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ اس کو حقیقی ضرر نہیں پہنچا سکتا یا نہیں پہنچانا چاہتا تو یہ اس وقت اپنی زبان سے اس کے خلاف بد کلامی یا عیب چینی کا حربہ استعمال کرتا ہے۔ لیکن بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ جس شخص سے اس کی مخالفت ہے وہ ایسا طاقتور ہے کہ زبان سے بھی اس کے خلاف کچھ نہیں کہنا چاہتا تو یہ اس سے کلام اور ملاقات ترک کر دیتا ہے اور بعض دفعہ اس قدر سزا کی جرأت بھی نہیں رکھتا تو دل میں اس کی نسبت کینہ رکھتا اور اس کی تکلیف پر خوش ہوتا اور اس کی کامیابیوں پر ناراض ہوتا ہے۔

پس نقم جو طبعی جذبہ ہے اس سے کئی اقسام کے افعال کراتا ہے ان افعال پر عقل کو قابو دے دینا اور آزادی سے اپنا کام کرنے کی اجازت نہ دینی اس کا نام اخلاق ہے اور اس کو عقل کی قید سے آزاد کر دینے اور بے محل استعمال کرنے کا نام بداخلاقی ہے اس تقاضائے فطرتی کو اخلاق میں تبدیل کرنے کے لئے اسلام مندرجہ ذیل قیود بیان فرماتا ہے۔

اول قید یہ لگاتا ہے کہ فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْہِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ [۱۴۳] جو شخص تم پر ظلم کرتا ہے تم اس کے بدلے میں اتنی ہی سزا اس کو دے سکتے ہو۔ یہ حکم عام ہے اور ایسے لوگوں کے لئے ہے جو علم اور عقل کے ایسے اعلیٰ درجہ کے مقام پر نہیں پہنچے کہ احکام کی باریکیوں کو سمجھ سکیں۔ جو لوگ ان سے زیادہ سمجھدار ہیں ان کی نسبت مندرجہ ذیل قیود مقرر فرماتا ہے فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ جو لوگ دوسرے کا گناہ معاف کر دیں اور در آنحالیکہ اس سے اصلاح مدنظر ہو ان لوگوں کو خدا تعالیٰ کی طرف سے اجر ملے گا اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ یعنی جو لوگ اس وقت معاف کریں جبکہ معافی سے گناہ بڑھتا ہو یا اس وقت سزا دیں جبکہ سزا سے گناہ بڑھتا ہو وہ دونوں ظالم ہونگے اور خدا تعالیٰ

کو ظلم پسند نہیں گویا رأفت جس کا ظاہری نتیجہ عفو ہے اور نقم جس کا ظاہری نتیجہ سزا ہے دونوں کے لئے یہ قید لگادی کہ جب عفو کا نتیجہ اس شخص کے لئے اچھا ہو جس سے قصور ہو گیا ہے تو اس وقت اس سے درگذر کرنا چاہئے اور رأفت کے جذبہ کو اپنا کام کرنے دینا چاہئے اور جب سزا سے فائدہ ہو اور ظالم کی اصلاح ہو تو اس وقت سزا دینی چاہئے اور نقم کے جذبہ کو اپنا کام کرنے دینا چاہئے۔

دوسری صورت یہ تھی کہ ظالم طاقتور ہو اور مظلوم اس سے بدلہ نہ لے سکتا ہو یا کسی مصلحت کی وجہ سے بدلہ نہ لینا چاہتا ہو پس وہ زبان سے اس کی بدگوئی اور عیب چینی کرکے اپنا دل ٹھنڈا کرنا چاہے تو اس کی نسبت فرمایا وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ [۱۴۴] تم کو ایک دوسرے کی عیب چینی کرنی جائز نہیں اور نہ گالیاں دینی جائز ہیں پس گویا عیب چینی اور گالیاں دینی بالکل منع کردیں اور فرمادیا کہ غصہ کے وقت میں اور بدلہ کے طور پر عیب چینی اور گالیاں بالکل منع ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں منع ہے؟ جو شخص اپنے نقصان کا بدلہ نہیں لے سکتا وہ کیوں عیب چینی کرکے اس شخص سے بدلہ نہ لے اور گالیاں دیکر دل خوش نہ کرے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ گالیاں اس لئے منع ہیں کہ وہ جھوٹ ہیں اور جھوٹ اسلام پسند نہیں کرتا اور وہ فحش ہیں اور فحش کو اسلام پسند نہیں کرتا۔ اور عیب چینی سے اس لئے منع ہے کہ یہ سزا بجائے اصلاح کے فساد کا موجب ہوتی ہے کیونکہ جس کی بدیوں کو علی الاعلان بیان کیا جاتا ہے اس کی شرم اُڑ جاتی ہے اور وہ بے حیائی کا مرتکب ہونے لگتا ہے۔

تیسری صورت نقم کی یہ تھی کہ یہ شخص اس سے مقاطعہ کرلیتا ہے اور اس سے کلام ترک کردیتا ہے اس صورت نقم کو بھی اسلام نے ناپسند کیا ہے رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں لَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ اَنْ يَّهْجُرَ اَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثٍ [۱۴۵] کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن تک کلام ترک کردے یعنی تین دن کے اندر اس کو چاہئے کہ اس سے کلام شروع کردے۔

چوتھی صورت نقم یہ تھی کہ یہ دل میں کینہ یا بغض رکھے۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ [۱۴۶] اور ہم نے مومنوں کے دلوں سے کینہ نکال دیا ہے یعنی مومن کا کام نہیں کہ کسی کی نسبت دل میں کینہ رکھے اس کے متعلق رسول کریم ﷺ

فرماتے ہیں اَلْمُؤْمِنُ لَیْسَ بِحَقُوْدٍ [۱۴۷] مومن کینہ توز نہیں ہوتا وہ اپنے دل میں کسی کی نسبت کینہ نہیں رکھتا۔

ان تمام قیود کے ذریعہ سے اسلام نے نقم کا ایک ہی ظہور جائز رکھا ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی شخص سے اس قدر بدلہ لے لے جس قدر کہ اس نے اس کو نقصان پہنچایا ہے مگر اس کے لئے بھی یہ شرط ہے کہ اگر اس جگہ حکومت ہے تو حکومت کے ذریعہ سے بدلہ لے خود ہی بدلہ نہ لے۔ ہاں اگر حکومت اس جگہ پر نہ ہو تو اسی قدر بدلہ لے سکتا ہے لیکن اصلاح اگر عفو سے ہو تو عفو مقدم ہوگا باقی طریقِ انتقام یعنی گالیاں دینا' عیب چینی کرنا' ترکِ کلام کر دینا' دل میں کینہ رکھنا ان سب کو اسلام نے ناجائز قرار دے دیا کیونکہ ان کے ذریعہ سے گناہ ترقی کرتا ہے اور فساد بڑھتا ہے اور اصلاح جو انتقام کی اصل غرض ہے مفقود ہو جاتی ہے۔

دوسرا طبعی تقاضا جو انسان کے اندر پایا جاتا ہے وہ محبت ہے تمام حیوانوں میں بھی اور انسانوں میں بھی ہم اس مادہ کو پاتے ہیں اور اس کے مقابلہ پر ایک طبعی تقاضا نفرت کا ہے۔ یہ دونوں طبعی تقاضے ہیں اور اپنے استعمال کے ذریعہ سے اخلاق بنتے ہیں ہم نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ تم ہر اک شئے سے محبت کرو اور نہ یہ کہ ہر اک سے نفرت کرو بلکہ ان کو حدود میں مقیّد رکھنے کے لئے قواعد کی ضرورت ہوگی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ محبت فطرتاً اسی سے پیدا ہوتی ہے جو ہمارے لئے کارآمد ہوتی ہے یا ہمارے حواس میں سے کسی حس کو آرام اور لذت پہنچاتی ہے۔ اس وجہ سے طبعی طور پر محبت انہی اشیاء سے ہوگی جو اس غرض کو پورا کریں مگر یہ خلق نہ ہوگا کیونکہ اس قسم کی محبت سب جانور بھی کرتے ہیں۔ محبت خلق تبھی ہوگی جبکہ ایک تو اس میں مدارج کا لحاظ رکھا جائے یعنی جس سے زیادہ تعلق ہے اس سے زیادہ محبت کی جائے اور جس سے کم ہے اس سے پہلے کی نسبت کم محبت کی جائے۔ دوسرے محبت تب خلق ہوگی جب کہ اس میں احسان سابق کا خیال زیادہ مدنظر رکھا جائے بہ نسبت آئندہ کی امید کے کیونکہ سابق احسان کا خیال ایک ذمہ داری ہے اور آئندہ کی امید طمع۔ تیسرے یہ کہ صرف قریب کے نفع کو یا لذّت کو مدنظر نہ رکھا جائے بلکہ دُور کے فائدے یا نقصان کا بھی خیال کیا جائے۔

ان تین پابندیوں کے ساتھ محبت ایک خُلق ہے ورنہ نہیں چنانچہ اسلام نے ان تینوں پابندیوں کا ذکر کیا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ

وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ اِقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ [۱۴۸] کہہ دے کہ اگر تمہارے باپ ماں اور اولاد اور بھائی بہنیں اور میاں یا بیوی اور تمہارا قبیلہ اور وہ مال جو تم کماتے ہو اور تجارت جس کے خراب ہونے سے تم ڈرتے ہو اور رہائش کی جگہیں یا وطن جن کو تم پسند کرتے ہو خدا اور اس کے رسول اور دین کے لئے کوشش کرنے کی نسبت تم کو زیادہ پسند ہیں تو تم اس وقت تک انتظار کرو جب تک کہ اللہ تعالیٰ تمہارے متعلق کوئی فیصلہ کرے اور اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اپنی ذمہ داریوں کو بھول جاتے ہیں

کس لطیف پیرایہ میں اس محبت کی جو خلق ہے حقیقت بیان کی ہے جس کا جس قدر درجہ ہے اسی قدر اس سے محبت کی جائے خدا تعالیٰ سے خدا کی شان کے مطابق رسول سے رسول کی شان کے مطابق دین سے اس کے رتبہ اور اہمیت کے مطابق والدین سے ان کے درجہ کے مطابق اولاد سے ان کے تعلق کے مطابق غرض ہر ایک کے درجہ کو مدنظر رکھا جائے اگر ایسا نہیں تو وہ محبت نیک خُلق نہیں کہلائے گی بلکہ ایک طبعی جوش اور حیوانیت کہلائے گی۔ مثلاً اگر کوئی شخص اپنے والدین کو ایک عورت کی وجہ سے چھوڑتا ہے یا اپنے وطن کی آواز پر اپنے مال کی محبت کی وجہ سے کان نہیں دھرتا تو اس شخص کو ہم ہرگز اس وجہ سے کہ وہ محبت کرتا ہے نیک نہیں کہیں گے اس نے بے شک محبت کی مگر عقل اور فکر کی حکومت سے آزاد ہو کر کی اس لئے کوئی اچھا خلق نہیں دکھایا۔

دوسری شرط محبت کے لئے یہ ہے کہ اس میں سابق احسان کو زیادہ مدنظر رکھا جائے بہ نسبت موجودہ لذت یا آئندہ کی امید کے۔ اس شرط کے ماتحت وہ محبت جو نیک خلق کہلائے گی وہ والدین کی محبت ہوگی نہ کہ اولاد کی محبت یعنی خالی ان سے پیار کوئی نیک خلق نہیں بلکہ محض ایک طبعی تقاضا ہے کسی ماں کو کہہ کر دیکھو کہ وہ اپنے بچہ کی خاطر تکلیف نہ اٹھائے دیکھو وہ اس پر خوش ہوتی ہے یا ناراض۔ درحقیقت وہ جو کچھ کر رہی ہوتی ہے محض بقائے نسل کے طبعی تقاضے کے ماتحت کر رہی ہوتی ہے۔ اس کی محبت صرف ایک طبعی تقاضا ہے لیکن بچہ کا والدین سے پیار کرنا ایک خُلق ہے کیونکہ طبعی طور پر والدین اپنا کام کر چکے ہیں نیچر ان سے جو فائدہ اٹھانا چاہتی تھی وہ حاصل کر چکی ہے اب وہ انکو نکمّا وجود سمجھتی ہے۔ پس جو شخص ان سے محبت کرتا ہے وہ ایک نیک

خلق کی پیروی کر رہا ہے کیونکہ ان کے احسانات اس کے سامنے آجاتے ہیں اور وہ جانتا ہے کہ انہوں نے میرے ساتھ جب میں بے بس تھا نیک سلوک کیا تھا۔ آج میرا فرض ہے کہ میں خواہ کوئی بھی تکلیف اٹھاؤں ان کو آرام پہنچاؤں۔ اسلام نے اس امر کو مد نظر رکھ کر فرمایا ہے کہ جنت والدہ کے قدموں کے نیچے ہے مگر یہ نہیں فرمایا کہ اولاد کے قدموں کے نیچے ہے کیونکہ ہر شخص طبعاً اپنی اولاد سے محبت کرتا ہے۔ سوائے اس کے کہ جس کے دماغ میں فرق ہو۔ مگر ہر شخص اپنے ماں باپ سے اس قدر محبت نہیں کرتا جس قدر محبت کے وہ مستحق ہیں بلکہ بہت سے لوگ دیکھے جاتے ہیں جو اپنے بوڑھے ماں باپ کو تکلیف میں دیکھنا پسند کرلیں گے لیکن اپنی اولاد کی چھوٹی چھوٹی خواہشات کے پورا کرنے کی فکر میں رہیں گے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ ان کا فعل نیک خُلق کہلائے گا؟

تیسری قید محبت کی طبعی جذبہ کے لئے یہ ہے کہ قریبی نفع اور فائدہ کو نہ دیکھا جائے بلکہ دور کے فائدہ یا نقصان کو بھی دیکھا جائے۔ مثلاً ایک شخص ایک چیز کو پیار کرتا ہے اور اس سے محبت کرتا ہے مگر اس سے تعلق اور محبت اس کے دین یا خلق کو نقصان پہنچاتی ہے تو اس وقت اس سے محبت کرنا ایک طبعی جذبہ تو کہلائے گا مگر نیک خلق نہیں کہلائے گا کیونکہ اس محبت کا نتیجہ نیک نہیں بلکہ بد ہے۔ یا مثلاً ایک ماں اپنے بچہ کی بد عادات کو دیکھتے ہوئے اسے کچھ نہیں کہتی کیونکہ اس کی محبت اسے مجبور کرتی ہے کہ اسے سزا نہ دے تو یہ محبت صرف طبعی جذبہ کہلائے گی۔ اخلاق کے ماتحت محبت تبھی آئے گی جبکہ وہ اس کو تنبیہہ کرے اور اسے نیکی کی طرف لائے کیونکہ اصل فائدہ اس کا اس موقع پر سزا پانے میں ہے چنانچہ قرآن کریم فرماتا ہے یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا [149]۔ اے مومنو! اصل محبت یہ ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنی بیویوں اور بچوں کو ہلاکت سے بچاؤ۔

نفرت بھی محبت کے مقابلہ کا جذبہ ہے اور طبعی جذبہ ہے اور اس کا محل طبعی یہ ہے کہ جو چیز اپنے حواس کو ناپسند ہو یا جس کا نفع نہ ہو یا جو نقصان دیتی ہو اس سے دور رہنا یا اس کو اپنے سامنے سے ہٹانے کی کوشش کرنا۔ مختلف مذاہب اس جذبہ کو برا قرار دیتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں کہ انہوں نے اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دی لیکن یہ بات درست نہیں یہ ایک طبعی جذبہ ہے اور اس کا محل اور موقع پر استعمال ناپسند نہیں بلکہ اچھا ہے۔ ہاں جب یہ حد سے زیادہ ہو یا حد سے کم ہو تب یہ جذبہ برا ہو جاتا ہے۔ اگر حد سے زیادہ ہو جائے تو اسے عداوت کہتے ہیں یعنی بوجہ نفرت اور

انقباض ظلم پر آمادہ ہو جانا اور جب کم ہو تو اسے بے غیرتی کہتے ہیں یعنی باوجود اس کے کہ ایک چیز حیاء یا اکرام کے خلاف ہو پھر بھی اس کو دیکھ کر دل میں اس کے لئے نفرت یا انقباض محسوس نہ کرنا۔

پس نفرت بُری چیز نہیں۔ نفرت تو ایک طبعی جذبہ ہے ہاں اس کا غیر محل استعمال بُرا ہے چنانچہ قرآن کریم میں بار بار عداوت کو بُرا قرار دیا گیا ہے ہمیشہ عداوت کو کفار اور سرکش لوگوں کی صفت بتایا ہے ایک جگہ بھی مومن کی نسبت نہیں کہا گیا کہ وہ دوسروں سے عداوت کرتا ہے۔ صرف دو تین جگہوں پر اللہ تعالیٰ اور مومنوں کی نسبت یہ لفظ استعمال ہوا ہے اور ان تمام مقامات پر عربی محاورات کے مطابق اس سے مراد دشمن کی عداوت کا بدلہ دینے کے ہیں نہ کہ خود عداوت کرنے کے مگر اسلام جس طرح عداوت کو ناپسند کرتا ہے اسی طرح نفرت کے بالکل مٹا دینے کو بھی ناپسند کرتا ہے کیونکہ غیرت بھی مومن کے اخلاق میں سے ہے۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک بات کو ہم ناپسند کریں اور اس کے متعلق ہمارے دل میں انقباض پیدا نہ ہو۔ بدی کے معنے روحانی غلاظت کے ہیں جب ہم ظاہری غلاظت سے کسی کو ملوث دیکھتے ہیں تو ہمیں اس کے اس فعل سے نفرت پیدا ہوتی ہے اور طبیعت میں اس کی طرف دیکھنے سے انقباض ہوتا ہے مثلاً کسی کے چہرے پر کوئی گندی چیز لگی ہوئی ہو۔ یا مثلاً اس نے ناک صاف نہ کیا ہو یا اس کے کپڑوں پر ناپاک چیزیں لگی ہوئی ہوں تو ایسا شخص جب ہمارے سامنے آتا ہے تو کیا ہم اس کو دیکھ کر اپنے دل میں ایک گھن محسوس نہیں کرتے؟ خواہ وہ ہمارا بیٹا ہی کیوں نہ ہو اور کیا ہمارے اس فعل کو بُرا سمجھا جاتا ہے یا دلی پاکیزگی کی علامت سمجھا جاتا ہے؟ کیا وجہ ہے کہ اگر کسی کے بدفعل کو دیکھ کر ہمارے دل میں اس فعل سے نفرت پیدا ہو اور ہمارا دل منقبض ہو تو اسے بُرا کہا جائے؟ یہ تو ایک مستحسن فعل ہوگا اور تعریف کے قابل اور اس نفرت کو جو صحیح طور پر اور برمحل استعمال ہوگی ہم غیرت کے نام سے موسوم کریں گے۔

اصل بات یہ ہے کہ نفرت کو بُرا قرار دینے والے لوگوں نے ایک حقیقت کو نہیں سمجھا اور وہ یہ کہ بد اور بدی میں فرق ہے انہوں نے اس امر پر تو غور کیا کہ بد کی بھی ہمیں خیر خواہی کرنی چاہئے لیکن یہ نہ سوچا کہ بد کی خیر خواہی کے ساتھ ہمیں بدی سے نفرت چاہئے۔ اگر ہم بد کی بدی سے نفرت نہیں کریں گے تو اس کی اصلاح کا جوش بھی ہمارے دل میں نہیں پیدا ہوگا۔ اسلام نے اس فرق کو بیان کیا ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا يَجْرِمَنَّكُمْ

شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی۔ [150] یعنی کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس امر پر نہ اُکسائے کہ تم عدل چھوڑ دو نہیں بلکہ باوجود اس کی دشمنی کے تم اس سے عدل کا معاملہ کرتے رہو گویا دوسرے لفظوں میں اس کے یہ معنی ہونگے کہ تُو اپنے دشمن سے بھی دشمنی نہ کر۔

اسی طرح فرماتا ہے لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْھُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَیْھِمْ [151]۔ اللہ تعالیٰ تم کو ان لوگوں سے جو تمہارے دین میں مخالف تو ہیں لیکن تم سے اس غرض سے کہ تم کو جبراً تمہارے دین سے پھرا دیں لڑتے نہیں اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالتے نہیں نیکی کرنے اور ان کے ساتھ عدل کرنے سے نہیں روکتا۔ یعنی تُو ان لوگوں سے بھی نیک سلوک کر گو وہ تیرے مذہبی دشمن ہیں لیکن دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا تَرْکَنُوْٓا اِلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّکُمُ النَّارُ [152]۔ تم ان لوگوں کی طرف مت جھکو جو ظالم ہیں یعنی اسلام پر قائم نہیں اب ایک طرف تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تم کفار سے نیک سلوک کرو دوسری طرف فرماتا ہے کہ تم انکی طرف جھکو نہیں اس کے یہی معنے ہیں کہ دنیوی معاملات میں تو ان سے نیک سلوک کرو لیکن ان کے وہ اعمال جو تقویٰ اور طہارت کے خلاف ہیں ان سے نفرت کرو۔ ایک دوسری جگہ پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ لٰکِنَّ اللّٰہَ حَبَّبَ اِلَیْکُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَہٗ فِیْ قُلُوْبِکُمْ وَکَرَّہَ اِلَیْکُمُ الْکُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْیَانَ [153]۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایمان کی محبت دی ہے اور اس کو تمہارے دلوں میں خوبصورت کرکے دکھایا ہے اور کفر اور نافرمانی اور حد سے گزر جانے کے متعلق تمہارے دلوں میں کراہت کے جذبات پیدا کئے ہیں مگر ساتھ ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت فرماتا ہے لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ اَلَّا یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ [154]۔ شاید تو اس غم میں کہ خدا کے دین کے منکر صداقت کو قبول نہیں کرتے اپنے آپ کو ہلاک کردے گا یعنی ان کی گمراہی کو دیکھ کر تیرے دل کو اس قدر صدمہ پہنچتا ہے کہ تو ان کی محبت کی وجہ سے خود ہلاکت کے قریب پہنچ جاتا ہے۔

ان آیات سے ظاہر ہے کہ اسلام کے نزدیک بدی کی تو بے شک خیر خواہی کرنی چاہئے مگر اس کی بدی کی حالت سے نفرت کرنی چاہئے تبھی اخلاق کامل ہوتے ہیں۔

اب میں ایک طبعی جذبہ کو لیتا ہوں اور یہ خواہش ترقی کا جذبہ ہے۔ انسان یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے دوسرے ساتھیوں سے آگے نکل جائے بلکہ یہ جذبہ جانوروں تک میں بھی پایا جاتا ہے۔ دو

گھوڑے آگے پیچھے سے آرہے ہوں فوراً اگلا گھوڑا بھی دوڑ پڑے گا یہ ایک طبعی جذبہ ہے لیکن اس کی زیادتی اور کمی کئی قسم کی بد اخلاقیاں پیدا کر دیتی ہے اور اس کا صحیح استعمال کئی نیک اخلاق پیدا کر دیتا ہے۔ مثلاً جب اس ترقی کی خواہش کو انسان نیکیوں میں مقابلہ کے لئے صرف کرتا ہے تو یہ خواہش اس کو بہت کچھ فائدہ پہنچاتی ہے۔ طالب علم اسی کے ذریعہ سے علم میں ترقی کرتے ہیں اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ [۱۵۵]۔ اے مسلمانو! ایک دوسرے سے نیکی میں بڑھنے کی کوشش کرو۔ گویا اس طبعی جذبہ کو ایک قید کے ساتھ استعمال کر کے ایک نیک خلق پیدا کر دیا کہ نیک اخلاق میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی خواہش کرنا خود ایک نیک خلق ہے۔

مگر یہ جذبہ جب بد طور سے استعمال کیا جائے تو ایک تو اس سے حسد پیدا ہوتا ہے یعنی جب یہ خواہش حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے تو انسان کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ صرف میں آگے بڑھوں اور کوئی نہ بڑھے اس کو اسلام نے ناپسند کیا ہے قرآن کریم میں دعا سکھائی ہے۔ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ [۱۵۶]۔ میں خدا تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں حاسد کی شرارت سے جب وہ حسد کرے۔

اسی طرح ایک نقص اس خواہش کی وجہ سے یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ انسان اس کی وجہ سے لوگوں کی خوبیوں کو عیب سمجھنے لگتا ہے یعنی کبھی تو اس کی یہ خواہش ہو جاتی ہے کہ دوسرے لوگوں کی اچھی چیزیں مجھے مل جائیں تاکہ میں بڑھا رہوں اور کبھی اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے کہ میں بڑھیا رہوں وہ دوسروں کے کمالات کو عیب دیکھنے لگتا ہے اور اسے عربی میں احتقار کہتے ہیں۔ اس کو بھی اسلام نے ناپسند کیا ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ [۱۵۷]۔ اے مومنو! تم میں سے کوئی جماعت دوسری جماعت کو حقیر نہ سمجھے شاید وہ تم سے اچھی ہو نہ عورتیں دوسری عورتوں کو حقیر جانیں شاید وہ ان سے اچھی ہوں۔ یہی خواہش جب اور زیادہ بڑھ جاتی ہے تو انسان ظاہر میں دوسرے کو گالیاں دیتا ہے اور اس کی نسب یا حسب میں طعن کرتا ہے۔ ان سب امور کو اسلام نے روکا ہے رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں لَا يَرْمِيْ رَجُلٌ رَجُلًا بِالْفِسْقِ وَلَا يَرْمِيْهِ بِالْكُفْرِ اِلَّا ارْتَدَّتْ عَلَيْهِ اِنْ لَّمْ يَكُنْ صَاحِبُهٗ كَذٰلِكَ [۱۵۸]۔ یعنی اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی نسبت کوئی اخلاقی

عیب یا دینی نقص منسوب کرے گا تو اس شخص میں جس پر وہ عیب لگایا ہے وہ عیب نہ ہو گا یعنی بطور گالی کے اس کو ذلیل کرنے کے لئے اس نے ایسی بات کہی ہو گی تو آخر گالی دینے والے میں وہی عیب پیدا ہو جائے گا۔

ایک اور نقص اس طبعی جذبہ کو حد میں نہ رکھنے سے یہ ہوتا ہے کہ انسان میں افتخار کی عادت پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی اس خواہش کی ترقی کا اس کے دماغ پر ایسا اثر پیدا ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ اس کو اپنے عیوب اور اپنی کمزوریاں بھول جاتی ہیں اور یہ دوسروں سے اپنے آپ کو اچھا سمجھ لیتا ہے اور اس پر ناز کرتا ہے۔ اس کے متعلق قرآن کریم فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا [۱۵۹]۔ اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا تکبر کرنے والے اترانے والے کو۔

اسی طرح ایک طبعی تقاضا بقائے نسل کا ہے اس کے متعلق اسلام نے حد بندیاں قائم کی ہیں اور فرمایا ہے کہ اس کو بھی سوچ اور سمجھ کر استعمال کرنا چاہئے چنانچہ اس کے متعلق مندرجہ ذیل احکام دیئے ہیں۔

اول یہ کہ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْۤ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ [۱۶۰]۔ نکاح کرنے تمہارے لئے جائز ہیں۔

دوم یہ کہ لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤى [۱۶۱]۔ زنا کے قریب نہ جاؤ۔ یعنی اپنی بیویوں کے سوا دوسروں پر اپنی شہوت کو پورا نہ کرو۔ کیونکہ اس سے بھی طبعی تقاضے کی اصل غرض فوت ہو جائے گی۔

اب ایک یہ سوال تھا کہ جن کے لئے شادی کا انتظام نہ ہو سکتا ہو وہ کیا کریں؟ تو ان کے لئے فرمایا وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا [۱۶۲]۔ چاہئے کہ وہ لوگ جن کو نکاح کا موقع میسر نہیں اپنی طاقتوں کو دبا دیں۔ یعنی ایسی احتیاطوں سے جو شہوات کو کم کرتی ہیں اپنے جوشوں کو کم کریں مگر زنا نہ کریں اور نہ یہ کریں کہ اپنی طاقتوں کو بالکل ضائع کر دیں جن کے ذریعہ سے بقائے نسل کا تقاضا پورا ہوتا ہے کیونکہ اس صورت میں وہ گویا اپنی فطرت کو مسخ کریں گے اور اللہ تعالیٰ اس کو ناپسند کرتا ہے کہ فطرتی تقاضوں کو بالکل مٹا دیا جائے۔ اسی طرح فرمایا وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا [۱۶۳]۔ یعنی بعض قوموں نے رہبانیت کا طریق ایجاد کیا کہ اس طرح وہ اپنے نفس کو بالکل پاک رکھیں گے مگر ہم نے ان کو اس کام کے لئے ہرگز نہیں کہا تھا بلکہ انہوں نے اپنے پاس سے یہ مسئلہ ایجاد کر لیا تھا۔ پس چونکہ یہ عہد ان کا غیر طبعی تھا اور فطرت کے تقاضوں کے خلاف تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ

اس کی حفاظت نہ کر سکے اور نام ہی کی رہبانیت رہی۔

دیکھو کس خوبی سے اس جذبہ کی حد بندی کی ہے۔ ایک طرف اس کو نکاح کے ذریعہ سے استعمال کرنے کی اجازت دی ہے۔ پھر نکاح کے باہر اس کے استعمال سے روکا ہے۔ نکاح نہ کرنے کے عہد کو بھی ناپسند کیا ہے کہ اس سے اس تقاضے کو گویا ہمیشہ کے لئے دبادینا ہے اور اس غرض کو مفقود کر دینا ہے جس کے لئے یہ تقاضا یعنی بقائے نسل کی خواہش پیدا کی گئی تھی۔ اگر سب لوگ اس پر عمل کرنے لگیں تو کچھ ہی دنوں میں دنیا مفقود ہو جائے اور یہ بھی فرمایا کہ طبعی تقاضوں کو مٹانا ناممکن ہے کیونکہ حقیقت کو خیال اور ارادے سے نہیں مٹایا جاسکتا۔ اس کے ساتھ ہی یہ سوال تھا کہ پھر جن کو نکاح کی توفیق نہیں وہ کیا کریں؟ تو فرمایا کہ ان کو عارضی طور پر اپنی خواہشات کو دبانا چاہئے مگر یہ جائز نہیں کہ اس خواہش کو بالکل مٹا دیں کیونکہ اس سے پیدائش کی غرض باطل ہو جاتی ہے۔

اب دیکھو اسلام کے سوا کونسا مذہب ہے جس نے اس تقاضے کو ایک طبعی تقاضے سے جو ادنیٰ سے ادنیٰ جانور میں بھی پایا جاتا ہے خواہ وہ خوردبینی کیڑا ہی کیوں نہ ہو ایسے اعلیٰ درجہ کے اخلاق تک جن کی بناء باریک فلسفیانہ مسائل پر ہے پہنچادیا ہے۔

ایک طبعی تقاضا انسان کے اندر اظہار ملکیت یا تصرف کا ہے اس تقاضے کے ماتحت وہ اپنے اموال کو خرچ کرتا یا بند کرتا ہے اس کے لئے بھی اسلام نے قیود لگائی ہیں۔ مثلاً اول قید یہ لگائی ہے کہ اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ [۱۶۴]۔ جو مال تمہارا کمایا ہوا ہے اور اچھا مال ہے اس میں سے خرچ کرو۔ یہ نہیں کہ دوسروں کے اموال پر تصرف کر کے ان کو خرچ کرنے لگ جاؤ۔ دوسری قیود یہ لگائی ہیں وَاٰتِ ذَاالْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا [۱۶۵]۔ (۱) اپنے مال میں سے ان قریبوں اور رشتہ داروں کو جن کی کفالت تیرے سپرد ہے ان کا حق دے۔ اس جگہ اس امر کا بھی اشارہ کیا ہے کہ اسلام کے نزدیک قریبی رشتہ داروں کی کفالت بڑے رشتہ داروں پر فرض ہے۔

(۲) دوسرا حکم یہ دیا ہے کہ غریبوں اور مسکینوں پر بھی اس مال میں سے خرچ کرنا چاہئے یعنی ایک حصہ ان کو بھی دے۔

(۳) تیسرا حکم یہ دیا کہ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا۔ تَبْذِیْر کے معنے عربی زبان میں دانہ ڈالنے کے یا پراگندہ کرنے یا امتحان لینے کے ہوتے ہیں۔ پس اس کا مطلب یہ ہوا کہ خرچ کرتے وقت یہ

نیت نہ رکھ کہ اس کے بدلے میں یہ لوگ بھی مجھ سے کوئی سلوک کریں گے۔ جس طرح زمیندار دانہ ڈالتے ہوئے امید رکھتا ہے کہ یہ بڑھ جائے گا اور میں کاٹوں گا اور نہ اپنے مال کو پراگندہ کر یعنی یہ نہ کر کہ سب مال لٹا کر خالی ہاتھ ہو کر بیٹھ جا۔ یا یہ کہ سب مال اپنے پر خرچ کرے اور دوسروں کو نہ دے اور نہ مال اپنے رشتہ داروں یا غرباء کو اس طرح دے کہ وہ امتحان میں پڑیں۔ یعنی بجائے فائدہ کے ان کو نقصان ہو۔ وہ کاہل یا سست ہو جائیں یا سوال کی عادت ان میں پیدا ہو جائے یا عیاش ہو جائیں۔ اسی طرح اموال کے خرچ کرنے کے متعلق یہ ہدایت بھی دی ہے کہ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ [۱۶۶] مسلمانوں کے اموال میں ان لوگوں کے لئے حق ہے جو بولنے سے محروم ہیں یعنی ان میں قوت گویائی نہیں اور اپنی تکالیف کو بیان نہیں کر سکتے جیسے کہ جانور ہیں وہ اپنی ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتے۔ پس چاہئے کہ اپنے صدقات میں سے ایک حصہ جانوروں کو بھی دیا جائے۔ یا جو جانور بیمار اور ضعیف ہوں ان کی خبر گیری کی جائے یا جو جانور گھر میں ہوں ان کے آرام کا خاص خیال رکھا جائے۔

اسی طرح اسلام نے صبر اور شکر اور احسان اور سچائی اور اعتماد اور میانہ روی اور وفاداری اور رازداری اور لوگوں کی حاجتوں کو پورا کرنے اور اصلاح بین الناس اور خوف اور رجا قناعت اور ایثار اور مؤاسات اور حلم اور افادت اور احیاء اور وعدہ کا پورا کرنا اور خوش چہرہ سے لوگوں سے ملنا اور وقار اور مہمان نوازی اور عیادت مریض اور امانت اور دیانت اور غم اور غیبت اور چغلی اور جھوٹ اور ایذاء رسانی اور تجسّس اور لوگوں کی باتیں سننی اور لوگوں کے خطوط پڑھنے اور عیب ظاہر کرنے اور دھوکا اور احسان جتانے اور بغاوت اور جسمانی عذاب دینے اور ریاء اور سمعت اور بیہودہ بکواس اور لغو قسموں کے کھانے اور خوشامد کرنے اور چوری اور قتل اور ظلم اور تجارت میں دھوکا کرنے اور ایسے امور میں دخل دینے جن سے اس کا تعلق نہیں ہے اور یتامیٰ اور بیواؤں کی خبر گیری اور بزدلی وغیرہ تمام اخلاقی امور کے متعلق وہ صحیح تعلیم دی ہے جو افراط اور تفریط سے پاک ہے اور سچی پاکیزگی پیدا کرنے کا موجب ہے مگر اس جگہ اس کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔

خلاصہ یہ کہ تمام طبعی عادات کو اسلام نے قیود کے ساتھ اخلاق فاضلہ میں بدل دیا ہے اور اس نکتہ کو سوائے اسلام کے اور کوئی مذہب نہیں سمجھا اور نہ اس نے پیش کیا ہے نہ کسی پہلے مذہب نے نہ بعد میں بننے والے مذہب نے جن کی بنیاد گو قرآن کریم کی موجودگی میں رکھی گئی ہے

مگروہ ان خوبیوں سے محروم ہیں جو قرآن کریم میں پائی جاتی ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تفصیل سے اس مضمون کو بیان نہیں کر سکتا ورنہ ایک ایک طبعی تقاضے کو اسلام نے انسانی ارادے اور عقل کے ماتحت لاکر اس سے اخلاقی تعلیم پیدا کردی ہے اور دوسرے مذاہب کی طرح صرف طبعی تقاضوں یا ان کے کسی پہلو کا نام اخلاق رکھ کر اس پر زور نہیں دیا۔ اسلام نے درحقیقت اس پیچیدہ سوال کو حل کردیا ہے جو اخلاق فاضلہ کے متعلق طبائع میں اٹھتا ہے اور اب تک اٹھ رہا ہے۔ یعنی یہ کہ اخلاق کی تعریف کیا ہے؟ کیونکہ اسلام یہ بتاتا ہے کہ اخلاق تمام طبعی تقاضوں کے درمیان صلح کرانے کا نام ہے جس طرح تمدن تمام بنی نوع انسان کے درمیان صلح کرانے کا نام ہے۔ وہی تعلیم اخلاق کہلا سکتی ہے جو تمام طبعی تقاضوں کے لئے کام کرنے کا راستہ نکالتی ہے اور ایسی قیود مقرر کرتی ہے کہ کوئی طبعی تقاضا دوسرے تقاضے کے علاقے میں نہ گھس جائے۔ نقم رأفت کی حدود میں نہ جائے اور رأفت نقم کی حدود میں نہ جائے محبت نفرت کے علاقہ میں نہ گھسے اور نفرت محبت کے علاقہ میں نہ گھسے۔

غرض یہ کہ سب طبعی تقاضے اپنے اپنے دائرہ میں باقاعدہ چکر لگائیں جس طرح کہ ستارے اپنے راستوں میں چکر لگاتے ہیں اور کوئی دوسرے کے لئے مانع نہ بنے بلکہ جس وقت اس کا علاقہ شروع ہو وہیں رک کر کھڑا ہو جائے گویا انسانی دماغ کو ایک حکومت فرض کیا جائے تو طبعی تقاضے اس میں بسنے والے لوگ ہیں اور اخلاق وہ قانون ہے جس کے ذریعہ سے ان میں امن قائم رکھا جاتا ہے۔ کیا ہی لطیف تعریف اور کیسا واضح بیان ہے۔

اخلاق کے مدارج

اب میں مقصد ثانی کے سوال ثانی کو لیتا ہوں یعنی اس امر کو بیان کرتا ہوں کہ اسلام نے اخلاق کے مختلف مدارج کیا بیان کئے ہیں؟

یہ سوال جیسا کہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے اخلاق کی پابندی کے لئے نہایت ضروری ہے اور ایسا ہی ضروری ہے جیسا کہ ظاہری تعلیم کے لئے کلاس بندی کی ضرورت ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اگر مدارس اور کالجوں کی تعلیم کو اس طرح درجوں میں تقسیم نہ کیا جاتا تو بہت سے لوگ تعلیم سے محروم رہ جاتے کیونکہ بہت سے لوگ اس امر کا اندازہ نہ کر سکتے کہ انہوں نے کہاں تک

تعلیم حاصل کرنی ہے اور بہت سے لوگ ہمت ہار بیٹھتے اور اس قدر کورس کو پڑھنا ناممکن خیال کر لیتے۔ پس جماعتوں میں پڑھائی کو تقسیم کرنا نہ صرف معلموں اور تعلیم کے منتظموں کے لئے مفید ہوتا ہے بلکہ خود تعلیم حاصل کرنے والوں کے لئے بھی اس میں بہت سے فائدے ہوتے ہیں۔ اخلاق کی حالت بھی بعینہٖ ایسی ہی ہے بلکہ ہر تعلیم جو تمام بنی نوع انسان کے لئے ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ اسے مدارج میں تقسیم کیا جائے تا مختلف استعدادوں کی طبائع اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اگر تعلیم ایسی ہوگی کہ صرف اعلیٰ درجہ کے لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکیں تو ادنیٰ اور اوسط درجہ کے لوگ اس سے محروم رہ جائیں گے اور اگر ایسی ہوگی کہ صرف اوسط درجہ کے لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکیں تو ادنیٰ درجہ کے لوگ اس سے محروم رہ جائیں گے اور اعلیٰ درجہ کے لوگوں کے لئے اس میں کوئی دلچسپی نہ ہوگی اور اگر ادنیٰ درجہ کے لوگوں کو اس میں مدنظر رکھا جائے گا تو اوسط و اعلیٰ کے لوگوں کے لئے اس میں کوئی نفع نہ ہوگا اور اگر اس میں کوئی ترتیب مدنظر نہ ہوگی تو بھی اعلیٰ درجہ کے لوگ تو شاید ایک حد تک اس سے فائدہ اٹھا سکیں مگر باقی لوگ اس سے محروم رہ جائیں گے اور ہمتیں ہار بیٹھیں گے۔ اور اگر صرف خیالی اور نمائشی تعلیم ہوگی تو بھی اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ لیکچروں کی زینت اور سٹیجوں کی رونق کے لئے یہ تعلیم اچھی ہوگی مگر اس سے عملی فائدہ دنیا کو نہیں پہنچے گا۔

اس امر کی ضرورت ثابت کرنے کے بعد کہ دنیا کو صرف اخلاقی تعلیم کی ضرورت نہیں بلکہ عملی اور تدریجی اخلاقی تعلیم کی ضرورت ہے جو انسان کو کمال تک پہنچا سکے اب میں ان مدارج کا ذکر کرتا ہوں جو اسلام نے اخلاق کے متعلق جو خواہ اچھے ہوں خواہ برے بیان فرمائے ہیں۔

سو یاد رکھنا چاہئے کہ اسلام نے اخلاق کے متعلق دو قسم کی تعلیم دی ہے ایک اجمالی اور ایک تفصیلی۔ اجمالی تعلیم میں تو نیک اور بد اخلاق کو ایسے مدارج میں تقسیم کر دیا ہے جن میں کہ تمام اخلاق داخل ہو جاتے ہیں اور اس تقسیم کے ذریعہ ہر ایک انسان اپنے لئے ایک راستہ بنا سکتا ہے اور بدیوں سے بچنے اور نیکیوں کے حصول کے لئے کوشش کر سکتا ہے۔ اس اصولی تعلیم کے علاوہ ایک تفصیلی تعلیم ہے جس میں تفصیل سے ہر ایک امر علیحدہ علیحدہ بیان کیا ہے اور ہر ایک قسم کے خُلقوں کی ترتیب بیان کی ہے۔

اصولی تعلیم اخلاق کے مدارج کے متعلق قرآن کریم کی اس آیت میں مذکور ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ

لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ [۱۶۷] اللہ تعالیٰ تم کو عدل اور احسان اور عزیزوں جیسے سلوک کا حکم دیتا ہے اور تم کو ان بدیوں سے جو انسان کے نفس سے تعلق رکھتی ہیں اور ان سے جو ظاہر ہوتی ہیں اور لوگوں کو بری لگتی ہیں اور ان سے جن سے لوگوں کو عملی تکلیف پہنچتی ہے روکتا ہے اور تم کو نصیحت کرتا ہے تاکہ تم دنیا میں نیک نام چھوڑو۔

اس آیت میں نیکیوں کے بھی تین مدارج بیان کئے ہیں اور بدیوں کے بھی تین مدارج بیان کئے ہیں کُل نیکیاں اور بدیاں انہی تین تین قسموں کے نیچے آجاتی ہیں۔ نیکیوں کا پہلا درجہ عدل ہے یعنی برابری کا معاملہ جیسا کہ کوئی اس سے معاملہ کرے اور ویسا ہی یہ اس سے کرے یا جس قدر حسن سلوک اس سے کرے اتنا ہی حسن سلوک یہ اس سے کرے اور یہ بھی کہ خیالات میں عدل رکھے جس قسم کے خیالات یہ چاہتا ہے کہ لوگ میرے متعلق رکھیں ویسے ہی خیال یہ اُن کی نسبت دل میں رکھے۔ غرض کہ ہر اک معاملہ میں برابری کو ملحوظ رکھے اور یہ نہ کرے کہ لوگ تو اس سے اچھا معاملہ رکھیں اور یہ ان سے برا معاملہ رکھے اور نہ یہ کہ خود تو لوگوں سے اچھے معاملہ کی امید رکھے اور آپ ان سے برا معاملہ کرنا چاہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ لفظ عدل سے اس قسم کے بدلے بھی خارج ہیں جو ایسے امور پر مشتمل ہوں جو قطعی طور پر ناپسند ہوں مثلاً فحش کلامی یا بدکاری یا جھوٹ وغیرہ۔ عدل کے ماتحت اس کو یہ تو حق ہے کہ جرم کی اس قدر سزا دے جس قدر کہ اس سے کسی نے معاملہ کیا ہے مگر اسے یہ جائز نہیں کہ اگر جرم کسی فحش قسم کا ہے جس کا ارتکاب کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہوتا تو یہ بھی اسی قدر فحش کا مرتکب ہو جائے کیونکہ فحش زہر ہے اور زہر کے مقابلہ میں زہر کھالینا گویا اپنا دُہرا نقصان کرلینا ہے اور ایسا بدلہ بدلہ نہیں بلکہ عملی جہالت ہے۔

دوسرا درجہ نیکیوں کا اسلام احسان بتاتا ہے یعنی یہ کوشش کرے کہ جس قدر کوئی سلوک کرے خواہ مالی معاملات میں خواہ جسمانی میں خواہ علمی میں اس سے بڑھ کر یہ اس سے سلوک کرنے کی کوشش کرے اور اگر کوئی اس سے بدسلوکی کرے تو حتی الوسع یہ اس کو معاف کرے سوائے اس صورت کے کہ معافی فساد کا موجب ہو۔ یہ درجہ پہلے درجہ سے اعلیٰ ہے اور وہی شخص اس درجہ تک نیکی میں ترقی کرسکتا ہے جو پہلے عدل کے درجہ کو طے کرچکے اور اپنے نفس کو اس کا عادی بنالے ورنہ ایک سطحی تغیر اس کی طبیعت میں ہوگا اور تھوڑی سی غفلت سے پھر پیچھے گر جائے گا۔

تیسرا درجہ نیکیوں کا ایتائ ذی القربیٰ ہے یعنی ایسے رنگ میں دنیا سے معاملہ کرے کہ اسے یہ بالکل خیال نہ رہے کہ یہ لوگ مجھ سے کوئی نیک معاملہ کریں گے۔ جس طرح ماں اپنے بچہ سے یا باپ یا بھائی اپنے بچہ یا بھائی سے سلوک کرتے ہیں کہ وہ اسے ایک طبعی فرض سمجھتے ہیں۔ یا بھائی سے اس امر کی امید نہیں رکھتے کہ یہ ہمارے سلوک کا کوئی بدلہ دے گا اگر ماں باپ ساٹھ ستر سال کے ہوں اور بچہ دو تین سال کا ہو تو بھی وہ اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ خدمت کرتے جس طرح کہ اگر وہ جوان ہوتے تو کرتے حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ بچہ ہماری خدمت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس کے جوان اور کام کرنے کے قابل ہونے تک ہم مر چکے ہوں گے اور یہ ان کا فعل صرف اس وجہ سے ہوتا ہے کہ ان کو اس بچہ سے طبعی محبت ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ اس سلوک کو جو وہ بچہ سے کرتے ہیں احسان بھی نہیں سمجھتے بلکہ اپنا فرض خیال کرتے ہیں بلکہ اگر کوئی شخص ان کے سامنے کہے کہ اس بچہ پر اس قدر احسان کرتے ہو؟ تو شاید وہ حیران ہو جائیں کہ احسان کیسا؟ ہم تو اپنے بچہ کو پالتے ہیں تو یہ حالت جو ماں باپ یا قریبی رشتہ داروں کے سلوک کی ہوتی ہے یہ احسان سے بہت بڑھ کر ہوتی ہے۔ احسان میں پھر بھی انسان کو حس ہوتی ہے کہ وہ ایک نیک کام کر رہا ہے اور قریبیوں کے سلوک میں اس امر کا بالکل خیال بھی نہیں ہوتا کہ وہ کوئی نیک کام کر رہے ہیں بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سلوک سے وہ خود اپنے نفس کو آرام پہنچا رہے ہیں اور اس میں ان کو لذت محسوس ہوتی ہے۔ اور یہ تیسرا درجہ نیکیوں کا سب سے اعلیٰ ہے اس درجہ میں انسان اس قدر ترقی کر جاتا ہے کہ اسے نیک اخلاق میں لذت آنے لگتی ہے اور وہ اپنے اوپر احسان سمجھتا ہے کہ مجھے لوگوں سے نیک سلوک کرنے کا موقع ملا۔ جس طرح کہ وہ لوگ جس کے ہاں اولاد ہوتی ہے یہ نہیں خیال کرتے کہ انہیں ایک بوجھ پڑ گیا ہے بلکہ خوش ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے فضل کو یاد کرتے ہیں۔ ایسے لوگ گویا دنیا کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیتے ہیں اور لوگوں کی تکلیف میں تکلیف پاتے ہیں اور ان کے سکھ میں سکھ اور باوجود اس کے وہ یہ خیال نہیں کرتے کہ دنیا پر انہوں نے احسان کیا بلکہ خود ممنون ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم پر فضل ہوا اور ہمیں یہ کام کرنے کا موقع ملا بلکہ خواہش کرتے رہتے ہیں کہ کاش اس سے زیادہ کام کا موقع ملتا۔ جس طرح ماں باپ خواہش کرتے ہیں کہ اگر ہمارے پاس زیادہ ہوتا تو بچوں کی اور بھی خاطر کرتے۔

بدیوں کے تین مدارج نیکیوں کے تین مدارج کے مقابل پر ہیں۔ یعنی عدل کے مقابل پر

فحش۔ جس کے معنے ہیں بدی کے اور جب یہ لفظ منکر کے ساتھ آئے تو اس کے معنے اس بدی کے ہوتے ہیں جو پوشیدہ ہو اور ظاہر پر اس کا اثر نہ ہو۔ جیسے دلی ناپاکی اور بد ارادے وغیرہ۔ یہ پہلا درجہ بدی کا ہے جس طرح عدل پہلا درجہ نیکی کا ہے۔ جب انسان کے اندر صحبت کے اثر سے یا بد تعلیمات کے پڑھنے سے یا بہیمی صفات کے ترقی کر جانے سے خرابی پیدا ہوتی ہے تو اس کا پہلا اثر دل پر ہی ہوتا ہے۔ دل میں برے برے خیال اٹھنے لگتے ہیں بدی کی طرف رغبت ہوتی ہے مگر فطرت اس کو دبا دیتی ہے اگر یہ خیالات مضبوط ہو چکے ہوں تو آخر وہ غالب آجاتے ہیں اور دل میں بدی کی گرہ مضبوط طور پر پڑ جاتی ہے۔ اس پر پھر دوسرا درجہ بدی کا شروع ہوتا ہے اور یہ اعمال بد کرنے لگتا ہے جنہیں لوگ دیکھتے ہیں اور ناپسند کرتے ہیں اور ان کے طبائع پر اس کے یہ افعال گراں گزرتے ہیں۔ مگر یہ افعال زیادہ تر ایسے ہی ہوتے ہیں جو اس کی ذاتی ناپاکی پر دلالت کرتے ہیں جیسے جھوٹ بولنا بیہودہ بکواس کرنا اور اسی قسم کے اور اعمال اور ساتھ ہی یہ بھی بات ہوتی ہے کہ ابھی چند ہی بدیاں اس میں پائی جاتی ہیں بہت سی بدیوں کے ارتکاب سے یہ ڈرتا ہے اور اس کا دل ان پر جرأت نہیں کرتا اور گو بعض بدیاں یہ لوگوں کے سامنے کرتا ہے مگر پھر بھی اپنے دل میں حجاب محسوس کرتا ہے اور اپنی غلطیوں کے یاد دلانے پر ان کا اعتراف کر لیتا ہے۔

جب اس حالت پر خوش ہو جاتا ہے اور اس کی اصلاح کی فکر نہیں کرتا تو پھر یہ تیسرے درجہ پر جا پہنچتا ہے جسے بغی کہتے ہیں یعنی لوگوں کو نقصان پہنچانا اور قوانین اخلاق کا کھلا کھلا مقابلہ۔

بغی کے معنی بغاوت کے ہیں اور اس درجہ سے یہی مراد ہے کہ اس موقع پر پہنچ کر انسان گویا قوانین اخلاق سے بغاوت کرنے لگتا ہے اور ان کی اطاعت کے جوئے کو بالکل گردن پر سے اتار کر پھینک دیتا ہے اور اپنی حالت پر فخر کرنے لگتا ہے اور اس میں اس کو لذت محسوس ہونے لگتی ہے اور اس کے دل پر ملامت کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

ان مدارج کے بیان کرنے سے اسلام نے طالبان اصلاح کے لئے کس قدر سہولت بہم پہنچا دی ہے ہر ایک شخص آسانی سے ان کے ذریعہ اپنی اخلاقی حالت کا اندازہ کر سکتا ہے نیک حالت کا بھی اور بد حالت کا بھی اور پھر اس کی اصلاح کی فکر کر سکتا ہے یا ترقی کی طرف قدم بڑھا سکتا ہے۔ اور ہر حالت کا آدمی اپنے سامنے ایک مقصد پاتا ہے جس کو حاصل کرنے کے لئے کوشش کرنا اس پر گراں نہیں گزرتا اور وہ اس سے مایوس نہیں ہوتا مثلاً اگر کسی شخص کو جو گناہ میں اس قدر بڑھا ہوا ہو کہ اخلاق کے قوانین کا احساس بھی اس کے دل میں نہ رہا ہو۔ اگر یہ کہا جائے کہ تُو ایسا نیک

بن کہ نیکی تیرا جزو ہو جائے اور رات دن لوگوں کی بہتری کی فکر میں لگا رہ تو یہ بات اس کے لئے کیسی اجنبی اور پھر کیسی مایوس کن ہوگی۔ وہ تو اس مقصد کو سن کر ہی گھبرا جائے گا اور مایوس ہو بیٹھے گا۔ لیکن اگر ہم اسے یہ کہیں کہ ہر ایک شخص جو نیکی کی طرف قدم اٹھاتا ہے گویا نیکیوں میں شامل ہوتا ہے تُو اگر بدی کو چھوڑ نہیں سکتا تو کم سے کم اس امر کو محسوس کر کہ تُو بدی کر رہا ہے اور اس پر فخر نہ کر تو یہ بات اس کے لئے زیادہ سہل الحصول ہوگی اور وہ بہت مستعدی سے اس کام پر لگ جائے گا اور جب اس کے دل میں گناہوں پر شرم اور ندامت محسوس ہونے لگے تو ہم اسے کہہ سکتے ہیں کہ اس نے ایک درجہ نیکی کا پالیا کیونکہ بڑی بدیوں کو چھوڑنا بھی ایک نیکی ہے اور اس کی ہمت جو اس تبدیلی سے بہت بڑھ جائے گی اس کی مدد سے ہم اسے آگے بڑھانے کی کوشش کریں گے اور کہیں گے کہ اگر تو ابھی نیکی نہیں کر سکتا تو کم سے کم اپنے اعمال کو بدی سے بچا اور گو دل میں بُرے خیالات پیدا ہوں مگر ان پر کاربند نہ ہو اور کم سے کم یہ کوشش کر کہ لوگوں کے سامنے تجھ سے افعالِ بد نہ ہوں۔ تاکہ لوگوں کو تیرے بداعمال دیکھ کر جو تکلیف ہوتی ہے وہ نہ ہو۔ اور یہ کام اس کے لئے پہلے کام سے آسان ہوگا اور جب وہ اس کام کو بھی پورا کر لے گا تو اس کا حوصلہ اور بھی بڑھ جائے گا اور گو اس کا دل ابھی گندے خیالات کی آماجگاہ ہوگا مگر کیا اس میں کوئی شک ہے کہ ہم اسے بھی نیکی کے ایک درجہ پر قائم کہیں گے کیونکہ وہ نیکی کی طرف قدم مار رہا ہے اور اس نے بدیوں کا بہت سا حصہ چھوڑ دیا ہے۔ تب ہم اسے اگلا قدم اٹھانے کی نصیحت کریں گے اور اسے کہیں گے کہ چاہئے کہ اب تو اپنے دل کو بھی پاک کر اور اس نجاست سے بھی بچ۔ اور اس میں کیا شک ہے کہ اب اس کے لئے یہ قدم اٹھانا پہلے سے بھی زیادہ آسان ہوگا اور وہ اس کام کو کر لے گا اور اس کا دل اس بچہ کی طرح صاف ہو جائے گا جس نے ابھی ہوش سنبھالا ہے یا اس تصویری آئینہ کی طرح ہوگا جس پر ابھی کوئی نقش نہیں لیا گیا۔ تب ہم اسے عدل کا مقام حاصل کرنے کی طرف توجہ دلائیں گے اور اسی طرح آہستگی کے ساتھ وہ اس مقام پر جا پہنچے گا جو اس کی استعداد اور ہمت کے مطابق ہے۔ مگر اس طریق کو چھوڑ دو۔ اور تمہاری اصلاح کی ساری سکیم بالکل ملیامیٹ ہو جاتی ہے۔ بِلا ترتیب اور بِلا خیال مدارج جو وعظ کیا جائے گا وہ کبھی بھی نیک نتیجہ نہیں نکالے گا۔ اس کی مثال یہ ہوگی کہ ہم ایک طالب علم کو جو ابھی الف ب بھی نہیں جانتا ایم اے کا کورس رٹوانا شروع کر دیں یا ویبسٹر (WEBSTER) کی ڈکشنری اس کو حفظ کرانے لگیں اور یہ خیال کریں کہ جب اس کو پڑھ لے گا تو سب ہی کچھ پڑھ لے گا

حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ وہ اس طریق تعلیم کی وجہ سے کچھ بھی نہیں پڑھے گا۔ کچھ اصطلاحات اس کو یاد ہوجائیں گی مگر وہ صرف طوطے کی طرح رٹی ہوئی ہوں گی۔ ان کا اثر اس کے دل پر کچھ بھی نہیں ہوگا اور اس کے اخلاق اس کی تعلیم کا نہیں بلکہ اس کے گردوپیش کا نتیجہ ہونگے جس میں وہ پرورش پارہا ہے۔

قرآن کریم ترتیبی اور تدریجی تعلیم پر خاص طور پر زور دیتا ہے حتیٰ کہ فرماتا ہے کہ کوئی نبی ایسا نہیں ہوسکتا جس کی یہ تعلیم نہ ہو کہ کُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ۔ [۱۶۸] ہوجاؤ ربّانی۔ ربّانی کہتے ہیں اس شخص کو جو تعلیم دیتے وقت پہلے چھوٹے علوم سکھاتا ہے پھر بڑے اور تدریج اور ترتیب کو مدنظر رکھتا ہے۔ پس نبی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی امت کو اس امر کی تعلیم دے کہ وہ علاج روحانی کرتے وقت لوگوں کے مزاجوں اور لوگوں کی حالتوں کو دیکھ لیں اور ان کی عادتوں اور ایسی رسومات کو جو ان میں راسخ ہوچکی ہیں عمدگی سے چھڑائیں اور ایسے علوم جن سے وہ کورے ہیں آہستگی سے سکھائیں۔

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یوں مختلف مسائل کا سمجھنا ہر اک شخص کے لئے آسان ہے۔ پس سکھانے سے یہ مراد نہیں کہ بعض لوگوں سے بعض علوم کو مخفی رکھے بلکہ سکھانے سے مراد عمل کرانا ہے تاکہ ہر دفعہ ایک قریب کا مقصد سامنے ہو اور ہمت قائم رہے اور ایک دفعہ کی کامیابی دوسری اصلاح کے لئے اور بھی تیار کردے۔ جس طرح کہ سب طالب علم جانتے ہیں کہ تعلیم کا کُل زمانہ کتنا ہے مگر کورسوں اور تدریج اور جماعتوں کی ترتیب کی وجہ سے اور تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد نتیجہ نکلتے رہنے سے ان کی ہمت بڑھتی رہتی ہے اور بوجھ کم معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ محسوس کرتے رہتے ہیں کہ ہم ترقی کر رہے ہیں۔

میں بتا چکا ہوں کہ اسلام علاوہ اجمالی تعلیم کے اخلاق کے متعلق ایک تفصیلی تعلیم بھی دیتا ہے اور برے یا نیک خلق یا اقسام خلق کی تقسیم بتاتا ہے جس سے ان کو اختیار کرنے یا چھوڑنے میں آسانی ہو لیکن چونکہ گنجائش اجازت نہیں دیتی میں اس اجمالی ترتیب پر ہی کفایت کرتا ہوں کہ عقلمند کے لئے اسلام کی خصوصیات سے واقف ہونے کے لئے اس قدر بھی کافی ہے۔

نیک اخلاق کو نیک یا بد اخلاق کو بد کہنے کی وجہ

اس مسئلہ کے متعلق بھی اسلام کی تعلیم اجمالی اور تفصیلی ہے۔ اجمالی تعلیم تو یہ ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ [۱۶۹] میں نے بڑوں اور چھوٹوں کو نہیں پیدا کیا مگر اس غرض سے کہ وہ میری صفات کو اپنے اندر پیدا کریں۔ پس اخلاق فاضلہ کے حصول کی پہلی غرض تو یہ ہے کہ اس کے بغیر اس منبع تقدیس سے انسان کو تعلق نہیں ہو سکتا جس کے بغیر انسان کی زندگی زندگی ہی نہیں ہے۔ وہ شریر اور بد خلق کو پسند نہیں کرتا بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ لوگ اس کی صفات پاکیزہ کو اپنے اندر پیدا کر کے اس کے سے ہو جائیں تا اس کا قرب حاصل ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا [۱۷۰] ہم نے دنیا میں اعلیٰ سے اعلیٰ چیزیں پیدا کر کے انسان کو اس میں مقرر کیا تا کہ ہم یہ دیکھیں کہ انسانوں میں سے کون زیادہ خوبصورت عمل کرتا ہے یعنی کون کس قدر خدا تعالیٰ کی صفات کو اپنے اندر پیدا کرتا ہے۔ پس اصل وجہ تو بعض اخلاق کو نیک کہنے کی یہی ہے کہ وہ صفات الٰہیہ کا پَرتَو اپنے اندر رکھتے ہیں اور بعض اخلاق کو بد کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ صفات الٰہیہ کے مخالف ہیں۔ اور اس میں کیا شک ہے کہ جو روشنی سے حصہ نہ لے گا وہ تاریک ہو گا اور جس جس قدر نور سے دور ہو گا اسی قدر ظلمت اس پر طاری ہو گی۔ مگر اس اجمالی تعلیم کے علاوہ اسلام نے مختلف اخلاق کے متعلق تفصیلی وجوہ بھی بیان کی ہیں جن سے لوگوں پر ان کے اچھے یا برے ہونے کی حالت کو منکشف کیا ہے تا لوگوں کو نیک اخلاق کی طرف رغبت پیدا ہو اور بد اخلاق کی طرف سے نفرت ہو جن میں سے بعض احکام کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

اعلیٰ اخلاق میں سے میں بیان کر چکا ہوں کہ ایک خُلق رأفت کا برمحل استعمال ہے جسے عفو کہتے ہیں۔ اس خلق کی وجہ علاوہ اوپر بیان کردہ وجہ کے قرآن کریم یہ بیان فرماتا ہے اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ [۱۷۱] جب کوئی شخص تیرے ساتھ بدی کرے اور تجھ پر ظلم کرے اور دکھ دے تو تُو اس کے ساتھ نرمی اور عفو کا برتاؤ کر کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ لڑائی کی جڑ کٹ جائے گی اور وہ شخص تیرا گہرا دوست ہو جائے گا۔

کیا ہی لطیف اور جوش پیدا کرنے والی وجہ ہے انسان سزا اس لئے دیتا ہے کہ اگر سزا نہ دوں

گا تو یہ شخص مجھے اور نقصان پہنچائے گا گویا ضرر سے بچنے کے لئے یا دوسرے لوگوں کو ضرر سے بچانے کے لئے انسان سزا دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو تعلیم ہم تجھے دیتے ہیں یعنی اگر عفو سے کسی انسان کی اصلاح ہوتی ہو تو اس وقت عفو کرنا چاہئے۔ اگر تُو اس پر عمل کرے گا تو اس فائدہ سے جو تجھے سزا میں مدنظر رہتا ہے تجھے زیادہ فائدہ ہو گا کیونکہ سزا دینے میں ضرر سے بچنے کی توقع ہے تو برمحل عفو کے نتیجہ میں نفع کی امید ہے کیونکہ اغلب گمان ہے کہ وہ شخص اس سلوک سے متأثر ہو کر تیرا دوست اور مددگار بن جائے گا۔

اسی طرح احسان اور نیک سلوک اور لوگوں کی مدد کرنے کے متعلق فرماتا ہے۔ اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ [۱۷۲]۔ تو لوگوں سے نیک سلوک کر اور ان کو اپنے مال اپنے علم اور اپنے رسوخ میں شریک کر کیونکہ تجھ پر اللہ تعالیٰ نے احسان کیا ہے۔ یعنی جن قوتوں اور طاقتوں سے تو نے کمایا ہے اور جن چیزوں کے ذریعہ سے تُو نے کمایا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہیں اور تجھے بطور احسان ملی ہیں پس جس طرح تجھ پر احسان کیا گیا ہے تو بھی احسان سے کام لے۔ مطلب یہ ہے کہ زمین یا کانیں اور جو چیزیں انسان کے لئے مال یا علم حاصل کرنے میں مد ہوتی ہیں وہ سب اس کی پیدائش سے پہلے کی موجود ہیں اور سب ہی بنی نوع انسان اس میں حق رکھتے ہیں پس اگر کسی انسان کو اللہ تعالیٰ خاص موقع دے تو اس کے بدلہ میں اس کا فرض ہے کہ اس نعمت میں دوسرے بنی نوع انسان کو بھی شریک کرے۔

اسی طرح مثلاً ظلم سے روکنے کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ ظلم سے ظلم پیدا ہوتا ہے اور آخر سب ہی برباد ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرماتا ہے اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ۔ وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا [۱۷۳]۔ ظلم نہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ ظلم کو پسند نہیں کرتا اور اس ذریعہ سے بعد اس کے کہ زمین میں امن قائم ہو چکا ہو فساد نہ کرو۔ یعنی ظلم کا نتیجہ کبھی امن اور استحکام نہیں ہو گا۔ تم اگر ظلم اپنی طاقت کو بڑھانے کے لئے کرتے ہو تو یہ نتیجہ کبھی پیدا نہیں ہو گا کیونکہ ظلم طبائع میں جوش پیدا کرتا ہے اور لوگ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور اگر ظاہر میں نہیں تو باطن میں اس کے خلاف تدبیر کرتے ہیں اور امن جو ساری طاقت کا منبع ہے وہ جاتا رہتا ہے۔

حسد کے متعلق رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں اِيَّاكُمْ وَالْحَسَدَ فَاِنَّ الْحَسَدَ يَأْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَأْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ [۱۷۴]۔ حسد نہ کرو کیونکہ حسد انسان کے آرام کے

سامان کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑیوں کو کھا جاتی ہے یعنی تم حسد تو اس لئے کرتے ہو کہ فلاں شخص کو مجھ سے زیادہ سُکھ کیوں ہے؟ لیکن اس ذریعہ سے تم اپنے پہلے سُکھ کو بھی برباد کر لیتے ہو اور اپنے آپ کو اور دکھ میں ڈالتے ہو۔ پھر اس کام کا فائدہ کیا جو تم کو اور تکلیف میں ڈال دیتا ہے۔

لوگوں کو حقیر جاننے کے متعلق فرماتا ہے۔ لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْھُمْ [175]۔ ایک قوم دوسری قوم کو حقیر نہ جانے کیونکہ زمانہ بدلتا رہتا ہے آج ایک قوم بڑی ہوتی ہے تو کل دوسری بڑھ جاتی ہے۔ آج ایک خاندان ترقی پر ہوتا ہے تو کل دوسرا ترقی کر جاتا ہے۔ اگر اس طرح ایک قوم دوسری قوم کو حقیر جانے گی تو نتیجہ یہ ہوگا کہ جب وہ برسر حکومت آئے گی بوجہ پچھلے اشتعال کے پہلی قوم کو ذلیل کرنے کی کوشش کرے گی اور یہ ایک عجیب سلسلہ فساد کا پیدا ہوتا چلا جائے گا حالانکہ جس فعل کا یہ نتیجہ نکلے گا وہ بالکل بے فائدہ ہے کیونکہ جب ترقی کا میدان بدلتا رہتا ہے تو ایک قوم کو کیا حق ہے کہ دوسروں کو حقیر سمجھے۔

زنا کے متعلق فرماتا ہے اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً وَسَآءَ سَبِیْلًا [176]۔ اول تو یہ فعل فحش ہے یعنی اس سے دل میں ناپاکی پیدا ہوتی ہے کیونکہ جرم کا احساس اور چوری کا خیال دل میں پیدا ہوتا ہے دوسرے یہ اس مقصود کے حصول کے لئے جس کے واسطے عورت اور مرد کے تعلقات قائم کئے جاتے ہیں غلط راستہ ہے کیونکہ شہوت کی اصل غرض تو بقائے نسل کی غرض کو پورا کرنا ہے۔ چونکہ نسل کو محفوظ رکھنا ضروری ہے اس لئے یہ خواہش انسان میں پیدا کی گئی ہے جو اسے اصل مقصود کی طرف مائل کرتی رہتی ہے اور ناجائز تعلقات سے تو اصل غرض برباد ہو جائے گی کیونکہ نسل محفوظ نہیں رہے گی یا مشتبہ ہو جائے گی۔ پس اس راستہ سے تو اصل مقصد نہیں مل سکتا اور اگر کبھی مل بھی جائے تو سیدھے راستہ کو ترک کرکے ٹیڑھا راستہ انسان کیوں اختیار کرے۔

بخل کے متعلق فرماتا ہے فَمِنْکُمْ مَّنْ یَّبْخَلُ وَمَنْ یَّبْخَلْ فَاِنَّمَا یَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِہٖ [177]۔ یعنی بعض لوگ تم میں بخل کے مرتکب ہوتے ہیں حالانکہ بخل کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ جو بخل کرتا ہے اس کا ضرر اور نقصان اسی کی جان کو پہنچتا ہے یعنی نہ وہ اچھی غذا کھاتا ہے نہ اچھا لباس پہنتا ہے نہ عمدہ مکان میں رہتا ہے روپیہ جمع کرتا چلا جاتا ہے جس سے سوائے روپیہ کی حفاظت کی فکر کے اسے فائدہ کوئی نہیں ہوتا واقع میں اگر غور کیا جائے تو جو لوگ بخیل ہوتے ہیں وہ ہمیشہ اپنی جان کو ہی دکھ میں ڈالتے ہیں اور ان کا روپیہ خود ان ہی کے لئے وبال ہوتا ہے۔

اسی طرح اسلام نے تمام احکام کی علّتیں بتائی ہیں اور لوگوں کے لئے اخلاق پر عمل کرنے کا دروازہ کھول دیا ہے مگر سب احکام کے متعلق تفصیلاً اس جگہ بیان کرنا ناممکن ہے یہی مثالیں کافی ہیں اور ان کے بیان کرنے کے بعد میں سوال چہارم کو لیتا ہوں۔

اخلاقِ حسنہ کے حصول اور اخلاقِ سیّئہ سے بچنے کے ذرائع

یہ بات بالکل واضح اور صاف ہے کہ مذہب کا صرف یہ ہی کام نہیں کہ وہ ان اخلاق کو بتائے جن سے انسان کو بچنا چاہئے یا جن اخلاق کو اسے اختیار کرنا چاہئے بلکہ اس کا فرض یہ بھی ہے کہ وہ ایسے ذرائع مہیا کرے یا بتائے جن کی مدد سے انسان بد اخلاق کو چھوڑ سکے اور نیک اخلاق کو اختیار کرسکے کیونکہ بغیر اس مقصد کے حصول کے ہماری سب کوششیں رائیگاں جاتی ہیں اور ہماری تحقیق ادھوری رہ جاتی ہے۔ دوسرے مذاہب کے لوگ اس سوال کا جو جواب دیں گے سو دیں گے میں اسلام یا دوسرے لفظوں میں یہ کہو کہ احمدیت کی طرف سے نہایت خوشی کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ اسلام نے اس غرض کو خوب عمدگی کے ساتھ پورا کیا ہے۔

پہلا ذریعہ جو اسلام اخلاق کی درستی کے لئے تجویز کرتا ہے وہ صفات الٰہیہ کا ظہور ہے جس کے بغیر انسان کامل اخلاق کو حاصل کر ہی نہیں سکتا کیونکہ انسان اپنے کاموں کی درستی کے لئے نمونہ کا محتاج ہے۔ نمونہ کے ذریعہ سے وہ اچھی طرح سیکھ سکتا ہے خالی کتابی علم اس کو نفع نہیں دے سکتا۔ اگر نمونے دنیا میں موجود نہ ہوں تو کُل علوم دنیا سے مفقود ہو جائیں۔ کوئی شخص طب، انجینئرنگ، کیمسٹری وغیرہ علوم کو محض کتابوں سے نہیں سیکھ سکتا ایسے علم حاصل کرنے کے لئے ایسے نمونوں اور تشریح کرنے والے آدمیوں کی ضرورت ہے جن کو دیکھ کر یا جن سے پوچھ کر وہ ان علوم کی باریکیوں کو دریافت کرے۔ جو حال باقی علوم کا ہے وہی اخلاق کا ہے اخلاق بھی انسان کامل طور پر نہیں سیکھ سکتا جب تک کامل نمونہ اس کے سامنے موجود نہ ہو اور جب تک ایسے نمونے بار بار پیدا نہ ہوتے رہیں اور یہ نمونے ہوں بھی انسانوں میں سے کیونکہ جو شخص انسانوں میں سے نہیں ہے وہ ہمارے لئے نمونہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ انسان کا دل غیر انسان کے عمل پر مطمئن نہیں ہو سکتا۔ ایک درخت ایک پتھر کا کام نہیں کر سکتا۔ اسی طرح ایک انسان ایک غیر انسان کے نمونہ سے ہمت اور جرأت نہیں حاصل کر سکتا۔ پس ہمارا نمونہ انسانوں میں سے ہونا

چاہئے اور بار بار ایسے نمونے آنے چاہئیں تا کہ تمام نسلوں کو ان کے اعمال پر ڈھالنے کا موقع ملے۔ اسلام ان نمونوں کے بار بار آنے کا دعویٰ کرتا ہے چنانچہ فرماتا ہے۔ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ فَمَنِ اتَّقٰی وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ [۱۷۸] اے لوگو جب تم میں سے میں رسول بھیجوں جو تمہیں میرے نشانات اور تائیدات سنائے تو جو شخص اس کو دیکھ کر تقویٰ حاصل کرے گا اور اس کے ساتھ مل کر دنیا میں اصلاح کرے گا اس پر نہ کوئی خوف ہو گا نہ غم۔

اسی طرح ان نمونوں کے علاوہ ایک اور نمونے جو ان سے درجہ میں کم ہوتے ہیں مگر پھر بھی ایک پاک نمونہ ہوتے ہیں ان کی نسبت رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اسلام میں ہر صدی پر ایک ایسا نمونہ آتا رہے گا آپ فرماتے ہیں۔ اِنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ لِھٰذِہِ الْاُمَّۃِ عَلٰی رَأْسِ کُلِّ مِائَۃِ سَنَۃٍ مَنْ یُّجَدِّدُ لَھَا دِیْنَھَا [۱۷۹] اللہ تعالیٰ اس امت میں ہر صدی کے سر پر ایسے شخص بھیجتا رہے گا جو دین کو نیا کرتے رہیں گے یعنی جو تعلیماتِ باطل انسانوں کی طرف سے شامل ہوتی رہیں گی ان کو دور کرتے رہیں گے چنانچہ ایسے مجدد دین اسلام میں ہمیشہ ہوتے رہے ہیں اور اس وقت جبکہ تاریکی بہت ہی بڑھ گئی ہے اسلام کی حفاظت اور رسول کریم ﷺ کے نمونے کے قیام کے لئے ایک نبی مبعوث ہوا ہے جس نے اپنے نمونہ سے ہزاروں لاکھوں کو زندہ کر دیا ہے۔

اگر غور کیا جائے تو اصل میں یہی ذریعہ سب سے اعلیٰ اور اکمل ہے اور دوسرے ذرائع اس کے مُمِد اور معاون تو ہو سکتے ہیں مگر اِس کے قائم مقام نہیں ہو سکتے کیونکہ اِس کا اثر قطعی اور یقینی ہے اور اُن کے اثرات بوجہ اس کے کہ ان کو استعمال کرنے میں ایسے لوگوں کا دخل ہے جو خود کامل استاد نہیں غلطی کا احتمال ہے۔ مگر چونکہ اس ذریعہ کا مہیا کرنا انسان کے اپنے اختیار میں نہیں ہے اسلام نے اور ذرائع بھی بیان کئے ہیں جن سے اعلیٰ اخلاق پیدا کئے جا سکتے ہیں اور برے اخلاق کو دور کیا جا سکتا ہے ان میں سے بعض ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

دوسرا ذریعہ جو اسلام نے انسان کو اخلاق پر قائم کرنے کے لئے تجویز کیا ہے وہ یہ ہے کہ اخلاق کو ان کی حقیقی ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے جس کی وجہ سے اخلاق پر ہر طبقہ اور ہر درجہ کے لوگ عمل کر سکتے ہیں چونکہ اس امر کو بھی ایک حد تک تشریح سے بیان کیا جا چکا ہے اس لئے اس جگہ اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

تیسرا ذریعہ اسلام نے یہ اختیار کیا ہے کہ اخلاق نیک کے اختیار کرنے اور بداخلاق کے ترک کرنے کی عقلی اور علمی وجوہ بیان کی ہیں تاکہ علم کامل ہو اور اخلاق کے حصول کی کوشش کے لئے سچا جوش پیدا ہو سکے اس کو بھی اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔

چوتھا ذریعہ جو اسلام نے اخلاق کی درستی کے لئے تجویز کیا ہے وہ اس کے نقطۂ نگاہ کا بدلنا اور اس کی مایوسی کو امید سے بدلنا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سی بدیاں انسان سے اس لئے سرزد ہوتی ہیں کہ اس کے ذہن میں یہ بات جم جاتی ہے کہ وہ گناہ سے بچ ہی نہیں سکتا۔ جو قوم اس خیال کو اپنی نسل کے سامنے پیش کرتی ہے وہ اسے ہلاک کرتی ہے وہ اپنی آئندہ نسل کی دشمن ہے۔ جب تک کوئی شخص یہ یقین نہیں رکھتا کہ وہ ایک مقصد کو حاصل کر سکتا ہے وہ اس کے لئے پوری کوشش نہیں کر سکتا۔ جن قوموں میں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ ہمارے باپ دادے سب کچھ دریافت کر چکے وہ قومیں ایجادیں نہیں کر سکتیں اور جس قوم میں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ اس میں ترقی کا مادہ ہی نہیں وہ ترقی کی طرف قدم ہی نہیں اٹھا سکتی۔ اسی طرح جن لوگوں کے ذہن میں یہ خیال مستحکم ہو کہ ہم کمزور ہیں اور اخلاق نیک حاصل نہیں کر سکتے اور بدیاں ہماری گھُٹی میں پڑی ہوئی ہیں اور پیدائش سے ہمارے ساتھ ہیں ہم کبھی ان پر فتح نہیں پا سکتے وہ قوم گویا اپنے ہاتھوں سے خود ہلاک ہوئی۔ رسول کریم ﷺ نے اس مسئلہ پر خوب زور دیا ہے اور حکم دیا ہے کہ کبھی کسی شخص کو مایوس نہیں کرنا چاہئے چنانچہ آپ فرماتے ہیں اِذَا قَالَ الرَّجُلُ هَلَكَ النَّاسُ فَهُوَ اَهْلَكَهُمْ [۱۸۰] یعنی جب کوئی شخص کسی قوم کی نسبت کہتا ہے کہ وہ تو اب تباہ ہو گئی تو اس قوم کا ہلاک کرنے والا وہی ہے یعنی کوئی مادی مصیبت اور تباہی ایسی سخت نہیں جس قدر کہ کسی شخص کے دل میں اس خیال کا بیٹھ جانا کہ ترقی کا دروازہ اس کے لئے بند ہو گیا ہے اور وہ اب دوسروں کے سہارے پر جا پڑا ہے۔ یہ کیسی عظیم الشان صداقت ہے اور کس قدر وسیع اثر رکھنے والی ہے۔

خلاصہ یہ کہ طبیعت میں مایوسی اور ناامیدی انسان کو مقابلہ سے باز رکھتی ہے اور اس کی وجہ سے انسان ناکام اور نامراد ہو جاتا ہے۔ اسلام نے اس خیال کو جڑ سے اکھیڑ کر پھینک دیا ہے اور اس طرح اخلاق میں ترقی کرنے کا راستہ انسان کے لئے کھول دیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ [۱۸۱] یعنی ہم نے انسان کو اعلیٰ سے اعلیٰ طاقتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے وہ نہایت ہی عمدہ اور قابلِ نشوونما قوتوں کو لے کر دنیا میں آتا

ہے اسی طرح فرماتا ہے وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا [۱۸۲] یعنی ہم نفس انسانی کو بطور شہادت کے پیش کرتے ہیں اور اس کی اعلیٰ درجہ کی اور بے عیب پیدائش کو بھی جس میں یہ خاص خوبی پائی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں ایسے مادے پیدا کر دیئے ہیں کہ وہ بدی اور نیکی میں تمیز کرنے کی توفیق رکھتی ہے۔

دیکھو کیسی اعلیٰ درجہ کی اور مطابق فطرت تعلیم ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان ایک نہایت ہی پاکیزہ فطرت لے کر دنیا میں آتا ہے جو کس قدر بھی ملوث ہو جائے پھر بھی اس کی اصل پاک ہے اس لئے اگر وہ نیکی کی طرف متوجہ ہو تو یقیناً اپنے عیوب کو دور کرنے میں اور نیکی کے حصول میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس تعلیم سے اسلام نے انسان کا نقطہ نگاہ ہی بالکل بدل دیا ہے اور اس کی ہمت کو بلند کر دیا ہے۔ اسلام کے سوا باقی مذاہب یا اس مسئلہ میں بالکل خاموش ہیں یا پھر انسان کو ایسے بوجھوں کے ساتھ اس دنیا میں پہنچاتے ہیں کہ وہ اپنے اعمال کے بغیر انہی کے بوجھ سے ڈوب جاتا ہے۔ مگر اخلاق کی درستی میں اگر کوئی تعلیم کامیاب ہو سکتی ہے تو وہی جو اسلام نے پیش کی ہے اسی تعلیم سے انسان کے دل سے مایوسی کا اثر دور ہوتا ہے اور یہی تعلیم اس کے حوصلے کو بڑھاتی ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ میں ایک بے داغ فطرت لے کر آیا ہوں اور اس کو مجھے پاک رکھنا چاہئے نہ کہ ایک غلاظت آمیز طبیعت جس پر کچھ اور گند بھی لگ گیا تو کوئی پروا نہیں۔

مگر یہ تعلیم بھی کافی نہ تھی۔ پیدائش کا سوال ہی انسان کے راستہ میں روک نہیں ہے وہ پیدائش کے بعد عقل اور ہوش کے آنے تک کئی خلقتوں میں سے گذرتا ہے اور بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہ راستہ کی لالچوں اور رذیل خواہشوں سے اپنی پاک فطرت کو ملوث کر لیتا ہے اگر ایسے شخص کے لئے کوئی علاج مقرر نہیں ہے تو پھر بھی ایک معقول حصہ دنیا کا ایسا رہے گا جو نیکی سے محروم رہ جائے گا کیونکہ وہ خیال کرلے گا کہ جب ایک دفعہ ہمیں ناپاکی لگ گئی تو اب ہمیں پاکیزگی کے لئے کوشش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ پس جب تک یہ روک بھی دور نہ ہو مذہب اخلاق حسنہ کو قائم کرنے اور بدی کے مٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اسلام دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اس روک کو دور کرتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اس روک کو بہترین طور پر دور کرتا ہے کیونکہ وہ ان خطاؤں کے اثر کو دور کرنے کے لئے جو انسان سے پہلے ہو چکی ہیں توبہ کا دروازہ کھولتا ہے جسے دوسرے مذاہب بند کرتے ہیں اور اسے مایوسی کے پنجے سے بالکل چھڑا لیتا ہے۔

کیونکہ جب انسان کو معلوم ہو جائے کہ اس کے لئے ترقی کا دروازہ کھلا ہے اور یہ کہ اگر وہ اصلاح کرلے تو پھر بھی اس پاکیزگی کو حاصل کر سکتا ہے جس پاکیزگی کو حاصل کرنا اس کا فرض مقرر کیا گیا ہے تو وہ ہمت کبھی نہیں ہارتا اور ہمیشہ اپنی اصلاح کی فکر میں لگا رہتا ہے اور جو ئندہ یابندہ کی مشہور مثل کے ماتحت آخر کامیاب ہو ہی جاتا ہے۔

بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ توبہ کا دروازہ کھولنے سے بدی کا بھی دروازہ ساتھ ہی کھل جاتا ہے اور بجائے اخلاق میں ترقی کرنے کے انسان بداخلاقی کے ارتکاب پر اور بھی دلیر ہو جاتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جب چاہوں گا توبہ کرلوں گا اور خدا سے صلح کرلوں گا لیکن یہ خیال بالکل غلط ہے۔ چاہوں گا تو یہ کرلوں گا کا خیال کبھی ایک عقلمند انسان کے دل میں پیدا ہی نہیں ہو سکتا کیونکہ اسے کیا معلوم ہے کہ میں کب مروں گا اگر اچانک موت آجائے تو توبہ کس وقت کرے گا؟

علاوہ ازیں توبہ کی حقیقت کو یہ لوگ نہیں سمجھے۔ توبہ کوئی آسان امر نہیں ہے اور انسان کے اختیار میں نہیں ہے کہ جب چاہے اپنی مرضی سے توبہ کرلے کیونکہ توبہ اس عظیم الشان تغیر کا نام ہے جو انسان کے قلب کے اندر پیدا ہو کر اس کو بالکل گداز کر دیتا ہے اور اس کی ماہیت کو ہی بدل ڈالتا ہے۔

توبہ کے معنے اپنے پچھلے گناہوں پر شدید ندامت کا اظہار کرنے اور آئندہ کے لئے پورے طور پر خدا سے صلح کرلینے اور اپنی اصلاح کا پختہ عہد کرلینے کے ہیں۔ اب یہ حالت یک دم کس طرح پیدا ہو سکتی ہے؟ یہ حالت تو ایک لمبی کوشش اور محنت کے نتیجہ میں پیدا ہو گی۔ ہاں شاذونادر کے طور پر یکدم بھی پیدا ہو سکتی ہے مگر جب بھی ایسا ہو گا کسی عظیم الشان تغیر کے سبب ہو گا۔ جو آتش فشاں مادہ کی طرح اس کی ہستی کو ہی بالکل بدل دے اور ایسے تغیرات بھی انسان کے اختیار میں نہیں ہیں۔ پس توبہ کی وجہ سے کوئی شخص گناہ پر دلیر نہیں ہو سکتا بلکہ توبہ اصلاح کا حقیقی علاج اور مایوسی کو دور کرتی ہے اور کوشش اور ہمت پر اکساتی ہے اور یہ دھوکا کہ توبہ گناہ پر اکساتی ہے محض عربی زبان کی ناواقفیت اور اسلامی تعلیم سے بے رغبتی اور اس خیال کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے کہ توبہ اس امر کا نام ہے کہ انسان کہہ دے کہ یا اللہ میرے گناہ معاف کر۔ حالانکہ گناہوں کی معافی طلب کرنے کا نام توبہ نہیں بلکہ استغفار ہے۔ توبہ گناہوں کی معافی طلب کرنے کو نہیں کہتے بلکہ گناہوں کی معافی سچی توبہ کا صحیح نتیجہ ہے۔

پانچواں ذریعہ جو اسلام نے انسان کے اخلاق کی درستی کے لئے تجویز کیا ہے وہ بظاہر پہلے ذریعہ کے مخالف نظر آتا ہے مگر مؤید اور مطابق۔ اور وہ یہ ہے کہ اسلام نے اس بد اثر کو مٹانے کی کوشش کی ہے جو مخفی طور پر ماں اور باپ سے بچہ اخذ کرلیتا ہے اس تعلیم کو پہلی تعلیم کے مخالف نہیں سمجھنا چاہئے۔ یہ بالکل سچی بات ہے کہ انسان پاکیزہ فطرت لے کر آتا ہے لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ وہ ماں باپ کے اثر کے ماتحت بعض بدیوں کے میلان کو بھی لے کر آتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ فطرت اور میلان میں فرق ہے فطرت تو وہ مادہ ہے جسے ضمیر کہتے ہیں۔ یہ ہمیشہ پاک ہوتی ہے کبھی بد نہیں ہوتی خواہ ڈاکو یا قاتل کے ہاں بھی کوئی بچہ کیوں پیدا نہ ہو اس کی فطرت صحیح ہوگی مگر ایک کمزوری اس کے اندر رہے گی کہ اگر اس کے والدین کے خیالات گندے تھے تو ان خیالات کا اثر اگر کسی وقت اس پر پڑے تو یہ انکو جلد قبول کرنے کے لئے تیار ہو جائے گا۔ جیسا کہ مرضوں کا حال ہے کہ جو بیماریاں پختہ ہوتی ہیں اور جزو بدن ہو جاتی ہیں ان کا اثر بچوں پر اس رنگ میں آجاتا ہے کہ ان بیماریوں کے بڑھانے والے سامان اگر پیدا ہو جائیں تو وہ اس اثر کو نسبتاً جلدی قبول کر لیتے ہیں۔ یہ اثر جو ایک بچہ اپنے ماں باپ سے قبول کرلیتا ہے ان خیالات کا نتیجہ ہوتا ہے جو ماں باپ کے ذہنوں میں اس وقت جوش مار رہے ہوتے ہیں جب وہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ گو یہ اثر نہایت ہی خفیف ہوتا ہے اور بیرونی اثرات بھی اس کو بالکل مٹا دیتے ہیں مگر اسلام نے اس باریک اثر کو نیک بنانے کا بھی انتظام کیا ہے اور وہ یہ کہ ماں باپ کو نصیحت کی ہے کہ جس وقت وہ علیحدگی میں آپس میں ملیں تو یہ دعا کرلیا کریں اَللّٰھُمَّ جَنِّبْنَا الشَّیْطٰنَ وَجَنِّبِ الشَّیْطٰنَ مَارَزَقْتَنَا [۱۸۳]۔ اے خدا ہمیں بد وساوس اور گندے ارادوں سے اور ان کے محرک لوگوں سے محفوظ رکھ اور جو ہماری اولاد ہو اس کو بھی ان سے محفوظ رکھ۔

یہ دعا علاوہ اس اثر کے جو بحیثیت دعا کے اس میں پایا جاتا ہے ایک اور بہت بڑا اثر رکھتی ہے اور وہ یہ کہ والدین کے ذہنوں میں یہ خیالات کی ایک نئی اور عمدہ رَو چلا دیتی ہے جس کی وجہ سے اگر ان کے عام خیالات پوری طرح پاک نہ بھی ہوں تب بھی اس وقت پاکیزگی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اول تو دعا اور اس مضمون کی دعا خود ہی خیالات کو نیکی کی طرف پھیر دیتی ہے دوسرے دیکھا گیا ہے کہ والدین کو اپنی اولاد کی نسبت یہ بہت خیال ہوتا ہے کہ گو ہم بد ہیں مگر

ہماری اولاد نیک ہو۔ گو بعض والدین اس کے خلاف بھی ملتے ہیں مگر عام قاعدہ یہی ہے کہ والدین اپنی اولاد کو بد دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ پس اس قریباً طبعی خواہش کی وجہ سے جب والدین اپنی اولاد کی نسبت ایسی دعا کریں گے تو ان کا قلب بہت ہی پاکیزہ تبدیلی حاصل کرے گا اور چونکہ بچہ پر قدرتی طور پر اسی وقت کے خیالات اثر کر سکتے ہیں جس وقت بچہ کے اجزاء باپ کے جسم سے علیحدہ ہوتے ہیں اور ماں سے پیوستگی حاصل کرتے ہیں اس لئے یہ دعا جو ماں باپ کے ملنے کے وقت کے لئے سکھائی گئی ہے اگر ماں باپ کے اندر کوئی ناپاکی ہے تو اس کے بد اثرات سے بچہ کو بچا لے گی۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ صاف طور پر اس فائدہ کی طرف ان الفاظ میں اشارہ فرماتے ہیں۔ فَاِنَّہٗ اِنْ یُّقَدَّرْ بَیْنَھُمَا وَلَدٌ فِیْ ذٰلِکَ لَمْ یَضُرَّہٗ شَیْطَانٌ اَبَدًا [۱۸۴]۔ یعنی اللہ تعالیٰ ایسے بچوں کو جن کے والدین تعلق باہمی کے وقت یہ دعا پڑھ لیتے ہیں مَسِّ شیطان سے بچاتا ہے جس سے مراد آپ کے نقطہ یہ ہے کہ اس شیطانی اثر سے بچاتا ہے جو ماں باپ سے منتقل ہو سکتا تھا نہ کہ کلی طور پر کیونکہ اس دعا کا طبعی اثر ہرگز صحبت بد کے اثر سے یا اور دوسرے اثروں سے نہیں بچا سکتا۔ باقی رہا اس دعا کا اثر بحیثیت دعا کے تو وہ تو اس وقت ظاہر ہو گا جبکہ یہ دعا اس حد تک پہنچے گی جس حد تک پہنچ کر دعا قبولیت کا مقام حاصل کرتی ہے ورنہ خالی الفاظ کے دہرا دینے سے وہ اثر ظاہر نہیں ہو سکتا۔

چھٹا ذریعہ جو اسلام نے اخلاق کی درستی کے لئے اختیار کیا ہے وہ ان راستوں کو کھولنا ہے جن کے ذریعہ سے ایسی تحریکات دل میں داخل ہوتی ہیں جو نیکی کی طاقت کو ابھارتی ہیں ان میں سے بعض اوپر بیان ہو چکی ہیں جیسے مثلاً دعا ہے' عبادت ہے' روزہ ہے' ذکر الٰہی ہے اس لئے ان ذرائع کو اس جگہ دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ پس میں تین اور راستوں کا بطور مثال ذکر کرتا ہوں۔

میں قرآن کریم کے اس حکم کو لیتا ہوں جو اس نے صحبت نیک کے متعلق دیا ہے۔ وہ فرماتا ہے کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ [۱۸۵]۔ اے مسلمانو! سچے لوگوں کی صحبت میں بیٹھا کرو۔ یہ ثابت شدہ بات ہے کہ انسان ہمیشہ اپنے گردوپیش کے حالات سے متأثر ہوتا ہے۔ پس جو شخص اپنی صحبت کے لئے نیک لوگوں کو اور اخلاق والے لوگوں کو چنے گا وہ بہت جلد اپنے اندر ایک عجیب تبدیلی دیکھے گا جو اسے کھینچ کر نیکی کی طرف لے جائے گی اور بد خیالات کے ترک کر دینے میں اس کو مدد دے گی۔ اسلام نے اس پر ایسا زور دیا ہے کہ ہمیشہ سے مسلمان اپنے وطن اور مال کو چھوڑ

کر ایسے لوگوں کی صحبت میں جاکر رہتے ہیں جو ان کی طبائع پر نیک اثر ڈال سکیں اور ان کی مقناطیسی تاثیر کی مدد سے اپنے لمبے سفر کو طے کر لیتے ہیں اور اپنے شاہد مقصود کو پالیتے ہیں۔

دوسرا راستہ جو اسلام نے نیکیوں کے حصول کے لئے کھولا ہے وہ احکام بھی ہیں جو حلال اور حرام سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس وقت تک دنیا نے اس عظیم الشان صداقت کو محسوس نہیں کیا کہ انسان کی خوراک کا اس کے اخلاق پر نہایت ہی گہرا اثر پڑتا ہے اور نہ صرف یہ کہ اس صداقت کو محسوس نہیں کیا بلکہ اس امر میں اسلام پر لوگ نکتہ چینی کرتے ہیں حالانکہ یہ امر بدیہیات سے ہے اور ہر روز اس کی صداقت کے نئے ثبوت ملتے جاتے ہیں۔ بہرحال دنیا کچھ بھی کہے قرآن کریم فرماتا ہے یَآیُّھَاالرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا [۱۸۶]۔ اے رسولو! پاک اشیاء کھاؤ۔ اس کے نتیجہ میں تم کو نیک عمل کرنے کی توفیق ملے گی۔

اس آیت سے یہ دھوکا نہیں کھانا چاہئے کہ اس میں صرف نبیوں کو مخاطب کیا گیا ہے کیونکہ قرآن کریم کا قاعدہ ہے کہ اس میں نبیوں کو مخاطب کیا جاتا ہے اور مراد سب تبع ہوتے ہیں۔ مذکورہ بالا قاعدہ کے ماتحت اسلام نے کھانے پینے کے متعلق مختلف احکام دیئے ہیں جن کو لوگ رسم خیال کرتے ہیں لیکن قرآن کریم مدعی ہے کہ وہ اپنے اندر عظیم الشان حکمتیں رکھتے ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ دنیا کے لوگ اس کو تو تسلیم کرتے ہیں کہ جمادات کی جو خصوصیات ہیں یا نباتات کی جو خصوصیات ہیں ان کا اثر تو انسان پر پڑتا ہے مگر وہ اس امر کے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کہ حیوانات کا گوشت کھانے سے بھی کوئی اثر انسان پر پڑتا ہے حالانکہ جس طرح اور چیزوں کا اثر انسان کی طبیعت پر پڑتا ہے ان کا بھی پڑنا چاہئے اور کسی جانور کے خاص اخلاق اس کے کھانے والے میں ضرور پیدا ہونے چاہئیں۔ مگر میں امید کرتا ہوں کہ اب جلد لوگ اس حقیقت کو قبول کرلیں گے کیونکہ اب یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ بعض جانوروں کے کھانے سے انسان ننگا ہونے کی اور بعض کے استعمال سے اپنی طاقت کو ناجائز طور پر خرچ کرنے کی خواہش محسوس کرتا ہے جب یہ علم اور ترقی کر گیا تو اسلام کا دعویٰ ثابت ہو جائے گا۔

خلاصہ یہ کہ مذکورہ بالا اصل کو تسلیم کر کے اسلام نے خوراک کے احکام کو ایک قانون پر مبنی رکھا ہے اور وہ قانون یہ ہے کہ چونکہ انسان کو اپنے تمام طبعی جذبات کو بڑھانے کی ضرورت ہے اس لئے اسے ہر قسم کی غذائیں کھانی چاہئیں سوائے ان غذاؤں کے جن کے استعمال سے کوئی حد

سے بڑھا ہوا ضرر جسمانی یا اخلاقی یا روحانی ہو چنانچہ اسی وجہ سے اسلام نے یہ حکم دیا ہے کہ ترکاری بھی اور گوشت بھی دونوں چیزوں کا استعمال کرنا چاہئے کیونکہ بعض اخلاق نباتات کے استعمال سے ترقی کرتے ہیں اور بعض حیوانات کے استعمال سے۔ جیسے کہ حلم اور نرمی اور ذکاوت اور استقلال نباتات کے استعمال سے پیدا ہوتے ہیں لیکن شجاعت اور وقار اور ہمت اور غیرت حیوانات کے استعمال سے زیادہ ہوتے ہیں۔

پس اسلام نے ہر اک قسم کی غذاؤں کے استعمال کا حکم دیا ہے تا کہ سب کے سب جذبات انسان کے اندر نشوونما پاتے رہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ [۱۸۷] اے مومنو! نیک اعمال کے حصول کے لئے تین باتوں کی ضرورت ہے ایک تو یہ کہ خدا تعالیٰ کی عبادت ظاہر اور باطن کو درست کر کے کرو۔ دوسرے یہ کہ ہر قسم کے کھانے اور پینے کی چیزوں کو استعمال کرو اور ایک ہی طرف زور نہ دے دو تا کہ ہر قسم کے طبعی تقاضے تم میں نشوونما پائیں۔ تُو ان سے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ انسان کو ظاہری صفائی کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہئے یا یہ خیال کرتے ہیں کہ انسان کو باطنی صفائی کی طرف توجہ نہیں کرنا چاہئے یا یہ خیال کرتے ہیں کہ انسان کو ایک ہی قسم کی غذاؤں کے پیچھے پڑ جانا چاہئے کہہ دے کہ خدا کی پیدا کی ہوئی زینت اور اس کے عطا کئے ہوئے عمدہ اور پاک کھانوں کو منع کرنے والے تم کون ہو؟

ہاں اس قاعدہ کے ساتھ کہ انسان کو ہر قسم کی غذائیں جو اس کے مختلف طبعی تقاضوں کو ابھارتی ہیں استعمال کرنی چاہئیں یہ بھی حد بندی لگادی ہے کہ جو غذائیں جذبات کو ایسا ابھارتی ہیں کہ انکو قابو میں رکھنا مشکل ہو جاتا ہے یا جو صحت یا عقل یا اخلاق یا دین پر بد اثر ڈالتی ہیں ان کو استعمال نہیں کرنا چاہئے کیونکہ وہ اصل غرض کو بالکل باطل کر دیتی ہیں۔ ان غذاؤں میں سے سب سے مقدم قرآن کریم نے مفصلہ ذیل چار غذاؤں کو رکھا ہے جو چاروں چار اصول پر مبنی ہیں۔

فرماتا ہے قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ [۱۸۸] کہہ دے کہ میں تو اپنی وحی میں کھانے والے پر حرام نہیں پاتا مگر یہ کہ جو مُردہ ہو یا بہایا ہوا خون ہو۔ یا سؤر کا گوشت کیونکہ ان میں سے ہر ایک ضرر رساں ہے یا وہ

چیز حرام ہے جو دین سے انسان کو باہر نکال دیتی ہے اور بے غیرتی پیدا کر دیتی ہے یعنی وہ چیز جس پر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کا نام بلند کیا گیا ہو یعنی یا تو اسے کسی اور معبود کی خوشی کے خیال سے ذبح کیا گیا ہو یا خدا کے سوا کسی اور کا نام ذبح کے وقت لیا گیا ہو۔ پھر فرماتا ہے مگر جو مُضطرّ ہو جائے اسے کوئی اور کھانا نہ ملے بشرطیکہ جان کے ایسے موقع پر نہ گیا ہو یا کھاتے وقت ضرورت سے زیادہ نہ کھائے تو ایسا شخص اگر ان کھانوں کو کھالے تو اللہ تعالیٰ اس کو ان کے بد اثرات سے بچالے گا۔

اس آیت میں تین چیزوں مُردار اور خون اور سؤر کے گوشت کو طبعی نقصانات کی وجہ سے حرام قرار دیا گیا ہے اور آخری چیز کو دینی نقصان کی وجہ سے چنانچہ مُردار اور خون تو بہت سے زہروں پر مشتمل ہے اور مُردار کی نسبت اغلب گمان یہی ہوتا ہے کہ وہ بیماری یا زہر یا زہریلے جانوروں کے کاٹے سے مرا ہو یا بالکل بوڑھا ہو کر مرا ہو اور یہ سب حالتیں ایسی ہیں کہ ان میں جانور کا گوشت کھانے کی قابلیت سے باہر ہو جاتا ہے اور اگر کسی سخت صدمہ سے مرا ہو تب بھی اس میں زہر پیدا ہو جاتا ہے پس در حقیقت کھانے کے قابل وہی گوشت ہوتا ہے جو ذبح کئے ہوئے جانور کا ہو۔ خون بھی زہروں پر مشتمل ہوتا ہے اور صحت کے لئے مُضرّ سؤر کا گوشت کئی عیب اپنے اندر رکھتا ہے اول تو سؤر کے گوشت میں بعض بیماریاں پائی جاتی ہیں۔ دوم یہ جانور طبعاً غلاظت پسند ہے سوم اس جانور میں ایک اخلاقی نقص ہے جو اور کسی جانور میں نہیں پایا جاتا پس اس کا استعمال جسمانی اور اخلاقی دونوں لحاظ سے مُضرّ ہے مگر چونکہ خوراک کی مُضرّتیں پوشیدہ ہوتی ہیں افسوس ہے کہ اب تک لوگ اس نقص کو محسوس نہیں کر سکے۔ مگر ہم یقین کرتے ہیں کہ وہ دن دور نہیں ہے جب اس جانور کو خوراک کے جانوروں میں سے بالکل نکال دیا جائے گا اور فطرت انسانی کو بے روک بڑھنے کا موقع دیا جائے گا۔

چوتھی چیز جو شرک کے طور پر ذبح کی جائے اور اس کے قربان کرنے کا باعث خدا تعالیٰ کے سوا اور ہستیوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی خواہش ہو۔ چونکہ اس میں خدائے وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ کی ہتک کی جاتی ہے کہ اس کی صفات اور دوسری ہستیوں کو دیجاتی ہیں اس لئے اس کو استعمال کرنا انسان کو بے غیرت بناتا ہے بلکہ در حقیقت ایسے جانور کو کھانا دلی ناپاکی اور بے غیرتی کی علامت ہے پس اسلام نے اس کو بھی حرام کیا ہے۔

مذکورہ بالا چیزوں کے علاوہ جنہیں ممتاز طور پر بیان کیا گیا ہے اور بعض اشیاء بھی ممنوع قرار دی گئی ہیں اور ان کی مناعی کی حکمت بھی وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی ہے یعنی جسمانی یا اخلاقی

نقصان۔ چنانچہ اسلام درندے جانوروں اور شکاری پرندوں اور اندھیرے اور غلاظت میں رہنے والے جانوروں اور حلال جانوروں میں سے غلاظت کا استعمال کرنے والے جانوروں کا گوشت منع کرتا ہے۔ پینے کی چیزوں میں سے شراب کو حرام فرمایا ہے کیونکہ یہ عقل پر پردہ ڈالتی اور باریک اعصاب کو جو ذہانت اور علم کو ترقی دینے والے ہیں صدمہ پہنچاتی ہے اور گو اسلام اقرار کرتا ہے کہ شراب میں بعض فائدے بھی ہیں مگر فرماتا ہے کہ اس کا نقصان اس کے فائدے سے زیادہ ہے اس لئے اس کو بالکل ترک کر دینا چاہئے۔

غرض اسلام نے اخلاق پر خوراک کے اثر کو قبول کیا ہے اور اس کو خاص قیود اور شرائط سے محدود اور مشروط کر کے اخلاق کے حصول کا ایک نیا دروازہ کھول دیا ہے اور صرف وہی غذائیں استعمال کرنے کی اور اسی مناسبت سے استعمال کرنے کی اجازت دی ہے جن سے اور جس حد تک ان سے اخلاق پر نیک اثر پڑتا ہے۔

تیسرا راستہ نیک اخلاق کے حصول کا اسلام نے یہ تجویز کیا ہے کہ بچپن سے بچہ کے دل پر نیک باتوں کا اثر ڈالا جائے۔ درحقیقت اس نکتہ میں اسلام سب ادیان سے منفرد ہے۔ عام طور پر لوگوں نے یہ سمجھا ہوا ہے کہ شریعت کا اثر بچہ کے بالغ ہونے سے شروع ہوتا ہے۔ مگر اسلام ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ بیشک جب بچہ بالغ ہوگا تبھی سے اس پر شریعت کی حجت ہوگی۔ مگر جو باتیں کہ عادت اور مزاولت سے تعلق رکھتی ہیں جب تک بچپن سے انکی طرف بچہ کو توجہ نہ دلائی جائے گی وہ ان پر آسانی سے کاربند نہ ہو سکے گا اور ہمیشہ وہ اسے دوبھر معلوم ہوں گی۔ علاوہ ازیں اسلام ہمیں بچہ کی تربیت کا زمانہ وہ نہیں بتاتا جب بچہ کچھ ہوش والا ہو جاتا ہے بلکہ وہ ہمیں اس سے بہت پہلے لے جاتا ہے یعنی اس کی پیدائش کے وقت تک۔ چنانچہ اسلام حکم دیتا ہے کہ جس وقت بچہ پیدا ہو اسی وقت اس کے کان میں اسلام کے احکام جو اذان میں بیان ہیں ڈالے جائیں دائیں طرف بھی اور بائیں طرف بھی اور اس میں علاوہ اور حکمتوں کے یہ حکمت بھی ہے کہ بعض دفعہ بچہ ایک کان سے بہرا ہوتا ہے پس دونوں طرف کان میں ان آوازوں کو ڈالنے سے وہ بہر حال سن لے گا سوائے اس صورت کے کہ وہ بالکل بہرا ہو۔

یہ حکم بظاہر ایک رسم معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت اس میں دو بڑے فوائد مخفی ہیں ایک تو والدین کو یہ توجہ دلائی گئی ہے کہ وہ پیدائش سے بچہ کے کان میں نیک باتیں ڈالنے لگیں اور اس میں کیا شک ہے کہ جو والدین اسلام کے حکم کی حقیقت کو سمجھیں گے وہ بچہ کی تربیت کو اس کی

پیدائش کے زمانہ سے ہی شروع کریں گے۔ یہ بالکل عقل کے خلاف ہو گا کہ وہ اس کے پیدا ہونے پر تو اس کے کان میں اسلام کے احکام ڈالیں لیکن پھر جب وہ بڑھنا شروع کرے تو اسے چھوڑ دیں حتیٰ کہ سال گذرنے پر پھر اس کی تربیت شروع کریں۔ بچہ ہر روز عقل میں ترقی کرتا ہے جس بچہ کو پیدائش کے وقت نیک باتوں کی تلقین کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے اس کو بعد میں تلقین کرنے کا حکم پہلے سے بھی زیادہ سخت ہونا چاہئے پس اس حکم میں درحقیقت والدین کو نصیحت ہے۔

دوسرا اہم فائدہ اس حکم میں یہ ہے کہ اس میں بتایا گیا ہے کہ بچہ میں سمجھنے کی عقل تدریجی ہے اور اس کا زمانہ پیدائش سے شروع ہوتا ہے۔ درحقیقت وہ حالت جس کو لوگ سمجھ اور ہوشیاری کی حالت کہتے ہیں وہ یکدم کہیں سے نہیں آجاتی وہ اسی علم سے پیدا ہوتی ہے جو بچہ پیدائش کے وقت سے جمع کر رہا تھا اور اس کے دماغ پر سے کوئی اثر اس کی پیدائش کے وقت سے مٹتا نہیں بلکہ نقش رہتا ہے اور خود گو بھلایا جائے مگر اپنا ورثہ عقل اور فہم کی صورت میں انسان کے پاس چھوڑ جاتا ہے۔ چنانچہ تجربہ اس امر پر شاہد ہے کہ بعض ایسے واقعات معلوم ہوئے ہیں کہ بعض آدمیوں پر اعصابی کمزوری کا حملہ ہو کر وہ خود رفتہ ہو گئے اور انہوں نے ایسی زبانیں بولنی شروع کر دیں جو ان کو معلوم نہ تھیں۔ سننے والوں نے اس کو غیر معمولی قرار دیا مگر آخر معلوم ہوا کہ وہ جو کچھ بولتے تھے وہ چند سنی ہوئی باتیں تھیں جو انہوں نے نہایت بچپن کی حالت میں جبکہ وہ پنگھوڑے میں پڑے ہوئے تھے ان زبانوں کے بولنے والوں سے سنی تھیں۔ جب دماغ کے حصہ موثرہ میں نقص پیدا ہو گیا تو حصہ متاثرہ کام کرنے لگا اور اس کے پرانے نقش سامنے آنے لگ گئے۔ غرض اسلام کی یہ تعلیم نہایت ہی حکمت پر مبنی ہے اور اس پر عمل کر کے دنیا کے اخلاق کی درستی نہایت عمدگی سے ہو سکتی ہے۔

ساتواں دروازہ جو اسلام نے اخلاق کی درستی کے لئے تجویز کیا ہے وہ ان دروازوں کا بند کرنا ہے جن سے گناہ پیدا ہوتا ہے۔ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ اسلام کے اصول کے مطابق بدی باہر سے پیدا ہوتی ہے ورنہ انسان کا دل نیک ہے یعنی انسان کو ایک ایسی ضمیر دی گئی ہے جو اس امر کو پسند کرتی ہے کہ نیکی کی جائے اور بدی سے اجتناب کیا جائے۔ تمام کے تمام انسان خواہ وہ کسی مذہب و ملت کے ہوں وہ اسی فطرت کو لے کر آتے ہیں۔ مگر خالی اس طاقت سے انسان کا کام نہیں چل سکتا کیونکہ ضمیر تو صرف اس کو یہ بتاتی ہے کہ نیکی کر اور بدی سے بچ باقی سوال یہ رہ جاتا

ہے کہ فلاں کام نیک ہے یا فلاں بد اس کا فیصلہ عقل کرتی ہے اور عقل کے فیصلوں کی بنیاد ان علوم پر ہوتی ہے جو انسان اپنے حواس کی معرفت حاصل کرتا ہے۔ پس اگر ان خارجی اثرات کے قبول کرنے میں انسان غلطی کر بیٹھے گا تو لازماً وہ نیکی اور بدی کی تعریف میں بھی غلطی کرے گا اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ اس کی ضمیر بھی دھوکا کھائے گی اور چونکہ وہ نیک کاموں کو بد سمجھے گی ان پر اسے ملامت کرے گی اور چونکہ بد کو نیک سمجھے گی ان پر اس کی تعریف کرے گی۔ پس یہ ضروری ہے کہ ان بد اثرات کو جنہیں انسان قبول کرتا ہے روکا یا کم کیا جائے۔ اسی طرح جو فوری جوش انسان کو بدی کا پیدا ہوتا ہے اس کا محرک بیرونی ہوتا ہے اس کا روکنا بھی ضروری ہے کیونکہ اگر وہ رک جائے تو پھر انسان اپنے نفس پر قابو پالیتا ہے۔ مثلاً ایک شخص شراب پیتا ہے وہ اسی وقت بے تاب ہوتا ہے جب لوگوں کو شراب پیتے ہوئے دیکھتا ہے یا ان چیزوں کو دیکھتا ہے جو شراب کے پینے یا رکھنے میں مستعمل ہوتی ہیں یا ان وقتوں پر اسے اس کا خیال آتا ہے جن وقتوں میں وہ شراب پیا کرتا تھا۔ اب اگر ایک شخص کو ایسی جگہوں سے الگ رکھا جائے اور ان چیزوں کو جو اسے شراب کی یاد دلائیں اس کے سامنے سے دور رکھا جائے تو یقیناً کچھ مدت میں اس کی عادت جاتی رہے گی اور یہ اپنے نفس پر قابو پالے گا۔

اسلام نے اس حقیقت کو اپنے احکام میں مدنظر رکھ کر ایسے احکام دیئے ہیں جن سے ان راستوں کو بند کر دیا ہے جن سے بدی یا بدی کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ مگر تعجب ہے کہ ایسا علم النفس کا مسئلہ جس کے پیش کرنے سے اسلام نے دنیا پر اپنے احسانات میں مزید اضافہ کیا ہے لوگوں کی مخالفت کے بڑھانے کا سب سے بڑا آلہ ثابت ہوا ہے اور وہ لوگ بھی اس کی حقیقت کو ابھی نہیں سمجھے جو علم دوست اور سچائی کے متلاشی ہیں۔

ان تمام تعلیمات کا بیان کرنا جن سے اسلام نے گناہ کے دروازوں کو بند کیا ہے مشکل امر ہے مگر میں چند مثالیں اس کی پیش کرتا ہوں۔

پہلی مثال اس قسم کے احکام کی وہ احکام ہیں جو اسلام نے عفت کے قیام کے لئے دیئے ہیں چنانچہ اسلام صرف دوسرے مذاہب کی طرح یہ نہیں کہتا کہ تو زنا نہ کر کیونکہ زنا نہ کر کوئی ایسا حکم نہیں جس کے سننے کے ہم محتاج ہوں۔ سوال یہ ہے کہ کس طرح انسان زنا سے بچے؟ اسلام اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ تو اس گناہ کے دروازے بند کر کے اس سے بچ سکتا ہے اور وہ دروازے آنکھ ' کان اور جلد ہیں ' کیونکہ زنا کی تحریک انسان کو انہی دروازوں سے ہوتی ہے۔ جب کوئی

انسان حسن کو دیکھتا ہے یا حسن کی تعریف کو سنتا ہے یا خوبصورت آواز سنتا ہے یا ایک نرم اور ملائم جسم کو چُھوتا ہے تو اگر وہ حسن یا اس کا ذکر یا آواز یا جسم اس کی خواہش کے مطابق ہوتا ہے تو اس کو اس کی طرف رغبت پیدا ہو جاتی ہے اور نتیجہ وہ انتہائی قرب ہوتا ہے جسے کُل دنیا کی عقلوں نے اخلاق اور سوسائٹی کے لئے ایک خطرناک زہر قرار دیا ہے پس اسلام نے اس دروازہ کو بند کرنے کے لئے حکم دیا ہے قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ۔ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوَاتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ [189]

مومنوں کو کہہ دے اپنی آنکھوں کو نیچا رکھا کریں اور ان تمام راستوں کی جن سے بدی کا خیال داخل ہوتا ہے حفاظت کیا کریں۔ یہ ان کے لئے بہت ہی نیکی پیدا کرنے کا موجب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتا ہے جو وہ کرتے ہیں۔ اسی طرح مومن عورتوں سے کہہ دے کہ وہ اپنی آنکھوں کو نیچا رکھیں اور تمام ان راستوں کو جن سے بدی کا خیال داخل ہوتا ہے محفوظ رکھیں اور اپنی زینت کو لوگوں پر ظاہر نہ کریں سوائے اس کے کہ خود بخود ظاہر ہو اور چاہئے کہ اپنی گردن سر اور منہ کو کپڑے سے ڈھانکیں اور اپنی زینت کو سوائے اپنے خاوندوں یا اپنے باپ دادوں یا اپنے خاوندوں کے باپ دادوں یا اپنی اولاد یا اولاد کی اولاد یا اپنے خاوندوں کی اولاد یا انکی اولاد یا اپنے بھائیوں یا اپنے بھائیوں کی اولاد یا بہنوں کی اولاد یا عورتوں یا غلاموں یا ایسے ملازم مَردوں کے جو بالکل بوڑھے ہیں یا جن میں شہوانی مادے نہیں پائے جاتے۔ یا بچوں کے جو ابھی تک بقائے نسل کے تعلقات سے واقف نہیں کسی پر ظاہر نہ کریں اور چاہئے کہ ایسے طور پر پیر نہ ماریں کہ انکی مخفی زینت اس سے ظاہر ہو اور اے مومنو! تم سب لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرو تاکہ کامیاب ہو جاؤ۔

ان آیات میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ان تمام راستوں کو مرد اور عورت بند کریں جن سے گناہوں کی تحریک انسان کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ ان راستوں میں سے پہلا راستہ آنکھ ہے اس کے متعلق حکم دیا کہ نظر کو نیچا رکھیں۔ دوسرا راستہ کان ہے اس کے متعلق حکم دیا کہ عورت مرد اور مرد عورت کی آواز راگ وغیرہ کے طور پر نہ سنے اور بِلا وجہ اور بے تعلق عورتوں یا مردوں کے حسن کے قصے اور واقعات نہ سنیں۔ تیسرا راستہ جلد ہے اس کے متعلق حکم دیا کہ ایک دوسرے کو بِلا وجہ اور بِلا ضرورتِ طبعی چھوئیں نہیں چونکہ آنکھیں نیچی رکھنے کا فعل ایسا ہے کہ ایسے مقامات پر جہاں مرد اور عورت ضرور تا جمع ہوتے ہوں جیسے کہ شارع عام ہے مشکل ہوتا ہے اس لئے عورتوں کو کہا کہ جب وہ باہر نکلیں تو اپنے سروں' سینوں اور منہ کے ایسے حصوں کو ڈھانپ لیں جو راستہ دیکھنے کے کام یا سانس لینے کے کام نہیں آتے۔

یہ احکام ایسے باحکمت ہیں کہ اگر کوئی بِلا تعصب اور بے تعلق ہو کر ان پر غور کرے تو ان کی خوبی کا اقرار کئے بغیر رہ ہی نہیں سکتا کیونکہ ان سے بدیوں کا قلع قمع کر دیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یورپ کے لوگوں پر بوجہ ان کی عادت اور قدیم رسوم کے یہ خیالات شاق گزرتے ہیں مگر ان کی حیرت اور گھبراہٹ صرف اور صرف عادات اور رسوم کے سبب سے ہے ورنہ ان احکام پر عمل کرنا مرد اور عورت کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں۔

اسلام ہرگز یہ حکم نہیں دیتا کہ عورتیں گھروں میں بند ہو کر بیٹھ جائیں۔ ابتدائے اسلام میں ہرگز مسلمان عورتیں ایسا نہیں کرتی تھیں بلکہ جنگوں میں شامل ہوتی تھیں زخمیوں کی مرہم پٹیاں کرتی تھیں' علوم مردوں سے پڑھتی تھیں اور مَردوں کو پڑھاتی تھیں' سواری کرتی تھیں غرض ان کو پوری عملی آزادی حاصل تھی۔ صرف اس امر کا ان کو حکم تھا کہ اپنے سر' گردنیں اور منہ کے وہ حصے جو سر اور گردن کے ساتھ وابستہ ہیں ان کو ڈھانپے رکھیں تا وہ راستے جو گناہ پیدا کرتے ہیں بند رہیں اور اگر اس سے زیادہ احتیاط کر سکیں تو نقاب اوڑھ لیں لیکن یہ کہ گھروں میں بند رہیں اور تمام عملی کاموں سے الگ رہیں یہ نہ اسلام کی تعلیم ہے اور نہ اس پر پہلے کبھی عمل ہوا ہے۔ جو پردہ آج کل مسلمانوں میں اکثر ممالک میں نظر آتا ہے یہ سیاسی پردہ ہے یعنی چونکہ بہت سے ممالک میں عورتوں کی عزت صرف روپیہ قرار دی گئی ہے جو عورت کی خطرناک ہتک ہے اس لئے مسلمانوں نے سیاستاً ایسے ممالک میں اپنے لئے بعض ایسی قیدیں لگائی ہیں جو انکی عزت اور عصمت کی حفاظت کریں نہ اس لئے کہ ان کا مذہب ایسا حکم دیتا ہے۔

میں نے سنا ہے کہ بعض لوگ اس حکم کو عورت کی ہتک کرنے والا خیال کرتے ہیں۔ مگر مجھے اس پر تعجب ہے اس لئے کہ پردہ آنکھیں نیچی رکھنے کے حکم کے لئے ایک ظاہری تدبیر ہے اور اس حکم میں مرد اور عورت دونوں کو شریک کیا گیا ہے۔ پس اگر ہتک ہے تو دونوں کی ہے نہ کہ عورت کی۔ کیونکہ حکم ایک کے لئے نہیں بلکہ دونوں کے لئے ہے۔ باقی رہا یہ سوال کہ عورت کو کیوں پردہ کے لئے کہا گیا ہے مرد کو کیوں نہیں کہا گیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام مرد اور عورت کے کام کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے عورت کا کام بچوں کی تربیت ہے اور مرد کا کام ان کے لئے سامان معیشت بہم پہنچانا ہے۔ مرد کو اس کے کام کی نوعیت کی وجہ سے باہر رہنا پڑتا ہے پس مرد کا دائرہ عمل بازار اور سڑکیں ہیں اور عورت کا دائرہ عمل اس کا گھر ہے اور شریعت نے ہر ایک کو اپنے دائرہ عمل کی جگہ میں آزاد کیا ہے اور دوسرے پر کچھ قیدیں لگا دی ہیں۔ مرد کو حکم ہے کہ جب وہ کسی کے گھر میں گھُسے تو پہلے اجازت لے اور پھر جائے کیونکہ وہ عورتوں کی آزادی کی جگہ ہے۔ عورت کو باہر نکلنے پر مردوں سے اجازت لینے کا حکم نہیں دیا بلکہ صرف اس قدر احتیاط کر لینے کا حکم دیا ہے جو اوپر بیان ہو چکی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ شریعتِ اسلام اس امر کو تسلیم کرتی ہے کہ جس طرح مرد گھر سے بے تعلق ہے اسی طرح عورت سڑکوں اور بازاروں سے بے تعلق نہیں اس لئے مرد پر اجازت کی شرط جو زیادہ سخت ہے لگائی گئی ہے اور عورت پر صرف اپنے ایک حصہ کو ڈھانک لینے کی۔ پس پردہ میں ہتک یا غیر ہتک کا کوئی سوال نہیں بلکہ اخلاقی ترقی کا ایک زریں ذریعہ ہے اور اس کی مخالفت صرف بوجہ عادات اور رسوم ہے ورنہ میں نے ایسی عورتیں دیکھی ہیں جنہوں نے پردہ شروع کر دیا ہے اور وہ اس میں کوئی بھی تکلیف یا بے آرامی محسوس نہیں کرتیں۔ سوائے ابتدائی چند دنوں کی شرم یا بے آرامی کے جو طبعاً ہونی چاہئے۔

دوسری مثال بدی کے رستے بند کرنے کی شریعتِ اسلام کا میانہ روی کا حکم ہے یہ بات ظاہر ہے کہ طبعی جذبات کے کُلّی طور پر روک دینے سے وہ بغاوت کرتے ہیں اور آخر سب روکوں کو توڑ دیتے ہیں۔ طبعی جذبات کی مثال بالکل اس دریا کی ہے جس میں کبھی کبھی پانی اس کے پھیلاؤ سے زیادہ ہو جاتا ہے۔ اگر ہم بند لگا کر اس پانی کو استعمال کر لیں تو یہ پانی ہمارے لئے فائدے کا موجب ہو جاتا ہے اگر یہ نہ کریں تو آخر وہ بے موقع ٹوٹتا ہے۔ اسلام یہ حکم دیتا ہے کہ مسلمان کو اپنے تمام کاموں میں میانہ روی کی عادت ڈالنی چاہئے۔ یہ نہیں کہ ایک ہی طرف کا ہو جائے اگر

وہ ایک طرف کا ہو جائے گا تو ضرور اس کے طبعی جذبات زور کر کے کناروں پر سے بہہ پڑیں گے مثلاً یہ کہ رہبانیت اختیار کرے یا اپنے سب مال کو لوگوں میں تقسیم کر دے اور اپنے اور اپنے بیوی بچوں کی ضرورت کے لئے کچھ نہ رکھے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ اس کے شہوانی جوش کسی وقت اس کو اس کے پاؤں پر سے اٹھا کر لے جاویں گے اور یہ حلال طریق کو چھوڑ کر حرام میں مبتلاء ہو گا۔ یا یہ ہو گا کہ اس کی ضروریات خور ونوش چونکہ سب مال کے لُٹا دینے سے باطل نہیں ہو جائیں گی یہ اپنا مال لُٹا کر یا سوال کرنے پر مجبور ہو گا جو بذات خود ناپسند ہے اور یا پھر چوری اُچکّا پن کی طرف مائل ہو گا اور بجائے نیکی میں ترقی کرنے کے گناہ کا مرتکب ہو گا۔ پس شریعت اسلام نے یہ حکم دے کر کہ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا [190]۔ ہم نے تمہیں ایسی قوم بنایا ہے جس کے سب کام میانہ روی پر مبنی ہیں ان دروازوں کو جو گناہ کے ہیں بند کر دیا ہے۔

ایک راستہ بدی کا رسم اور عادات ہیں بہت سی بدیاں انسان اس وجہ سے کرتا ہے اور اسے اس کی عادت کے پورا کرنے کا سامان نہیں ملتا یا رسوم کی وجہ سے وہ بدی کرنے پر مجبور ہوتا ہے مثلاً اس کے پاس روپیہ کافی ہوتا نہیں اور ملک کی رسم چاہتی ہے کہ خاص قسم کا لباس پہنے وہ اس رسم کا مقابلہ نہ کر سکنے کی وجہ سے بدی اور گناہ سے روپیہ کماتا ہے۔ اسلام نے ان دونوں راستوں کو بند کر دیا ہے رسموں کو بھی اور عادتوں کو بھی۔ عادتوں کو تو اس طرح کہ جس قدر کھانے پینے کی چیزیں ایسی ہیں کہ وہ عادی بنا دیتی ہیں ان کو منع فرما دیا ہے۔ چنانچہ شراب اس کی پہلی مثال ہے جو بطور نظیر کے ہے ورنہ ہر اک چیز جو نشہ پیدا کرتی یا انسان کی طاقت کو ساکن کر کے ایک لذت کی حالت پیدا کر دیتی ہے اور آخر انسان کو اپنا عادی بنا لیتی ہے ان سے اسلام منع کرتا ہے۔ رسوم کے متعلق فرماتا ہے کہ وہ ایک بوجھ ہیں جن کو قومی خوف کیوجہ سے انسان اٹھاتا ہے ورنہ وہ بوجھ طاقت سے بڑھ کر ہیں کیونکہ ان میں غریب اور امیر مقروض اور آزاد کا لحاظ نہیں رکھا گیا اور لوگوں کو مجبور کیا گیا ہے کہ وہ اپنی خیالی عزت کی حفاظت اور اپنے ہم چشموں میں ذلیل نہ ہونے کی غرض سے گناہ اور بدی میں مبتلاء ہوں اور ظاہر کی خاطر باطن کو تباہ کر لیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ رسول کریم ﷺ کی آمد کی ایک غرض ہی یہ بیان فرماتا ہے کہ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ [191]۔ یہ نبی حکم دیتا ہے اچھی باتوں کا اور روکتا ہے بُری باتوں سے یعنی کامل شریعت لایا ہے۔ پھر فرماتا ہے یہ رسول کریم ﷺ حلال

کرتا ہے پاک اور نفع رساں چیزوں کو اور حرام قرار دیتا ہے ان چیزوں کو جو بے فائدہ ہیں۔ یعنی اس کی شریعت بطور چٹی اور سزا کے نہیں بلکہ ہر اک حکم اپنے اندر کوئی نفع یا ازالۂ ضرر رکھتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ جن کو یہ اُتار ہی نہ سکتے تھے اگر اُتارتے تو سزا ملتی اتارتا ہے یعنی رسوم جو کہ بوجھ بھی ہوتے ہیں مگر باوجود اس کے انسان ان کو اتار نہیں سکتا کیونکہ جانتا ہے کہ قوم ناراض ہو جائے گی اور رہنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ پھر فرماتا ہے کہ اور یہ رسولؐ وہ طوق اتارتا ہے جو انہوں نے پہنے ہوئے تھے یعنی ان عادات کو دور کرتا ہے جو بطور رسم کے تو نہ تھیں لوگ تو ان کے ترک کرنے پر سزا نہیں دیتے تھے مگر یہ خود ان کو اتارنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے چنانچہ دیکھ لو رسول کریم ﷺ نے کس طرح ایک ایسی قوم میں سے جو شراب کی ایسی عادی تھی کہ آدھی رات کو اٹھ کر شراب پینا شروع کرتی تھی اور عشاء کے وقت تک شراب پیتی ہی جاتی تھی ایک حکم سے شراب کو مٹا دیا اور اس طرح مٹایا کہ پھر شراب نے بطور قومی شربت کے قدم نہ رکھا۔ اب اس وقت سائنس نے اس کی مضرّتوں کو بہت ہی واضح کر دیا ہے اور عام طور پر ڈاکٹر اس کے مخالف ہوتے جاتے ہیں مگر پھر بھی بعض حکومتیں باوجود سخت کوشش کے اس کا رواج اچھی طرح نہیں مٹا سکیں۔

خلاصہ یہ کہ رسم اور عادات بھی گناہ کا مرتکب بنا دیتی ہیں۔ ایک شرابی کو شراب' ایک افیونی کو افیون' ایک کوکین استعمال کرنے والے کو کوکین نہ ملے تو وہ بیسیوں جرم کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے جن پر وہ دوسری کسی صورت میں بھی آمادہ نہ ہوتا۔

اوپر جو راستے گناہ کے بیان کئے گئے ہیں وہ بطور مثال کے ہیں مگر پھر بھی مضمون سمجھانے کے لئے کافی ہیں اس لئے چونکہ اخلاق کی تعلیم کے تمام ضروری پہلوؤں پر اجمالاً بحث ہو چکی ہے۔ اب اسلام کی اس تعلیم کے بیان کرنے کی طرف توجہ کرتا ہوں جو اس نے تمدن کے متعلق دی ہے۔

اسلام کی تعلیم تمدن کے متعلق

تمدن کے قوانین سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ قوانین مراد ہیں جن کے ذریعہ سے ان بنیادوں

کو قائم کیا جائے جو سوسائٹی کے بنانے کے لئے ضروری ہیں اور پھر وہ حقوق مراد ہیں جو بنی نوع انسان کو ایسے امور میں حاصل ہیں جن میں ان کے فوائد متّحد ہیں اور اسی طرح وہ فرائض جو بنی نوع انسان کی مشترک ترقی کے لئے افراد کے ذمہ لگائے گئے ہوں۔

میں جب غور کرتا ہوں تو میرے نزدیک تمدن اخلاق کے ہی ایک حصہ کو جامۂ عمل پہنانے کا نام ہے۔ اخلاق اور تمدن میں درحقیقت یہی فرق ہے کہ علمِ اخلاق تو افراد کی پاکیزگی سے بحث کرتا ہے اور علمِ تمدن قومی پاکیزگی سے بحث کرتا ہے گویا اخلاق کا وہ نقطہ جو فرد سے وابستہ ہے ہم اسے اخلاق سے موسوم کرتے ہیں اور اخلاق کا وہ نقطہ جو مجموعۂ افراد سے تعلق رکھتا ہے ہم اسے تمدن کہہ لیتے ہیں۔ جب ہم اخلاق کا ذکر کرتے ہیں تو ہم گویا یہ بحث کرتے ہیں کہ انسان کو اپنے نفس کو پاک بنانے کے لئے کیا اعمال کرنے چاہئیں؟ اور جب ہم تمدن کا ذکر کرتے ہیں تو گویا ہم یہ بحث کرتے ہیں کہ مختلف افراد آپس میں محبت سے رہنے اور بحیثیتِ قومی ترقی کرنے کے لئے کس طرح معاملہ کریں؟ پس صرف فرق یہ ہوگا کہ اول الذکر موقع پر ہم صداقت کی حقیقت پر بحث کریں گے اور ثانی الذکر موقع پر ہم اس صداقت کو مختلف افراد کے متعلق استعمال کرنے کے طریق پر بحث کریں گے۔

اس مفہوم کو بیان کر دینے کے بعد جو میں تمدن کا سمجھتا ہوں میں اسلام کی تعلیم تمدن کے متعلق بیان کرتا ہوں۔

سب سے پہلے تو میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم نے علاوہ مختلف جگہ پر تمدن کے احکام بیان کرنے کے تمدن کے متعلق ایک مکمل سورۃ اتاری ہے جو مختصر مگر تمدن کی اقسام کے بیان کرنے اور اس کی اصلاح کی طرف توجہ دلانے پر مشتمل ہے اور یہ عجیب بات ہے کہ قرآن کریم کی سب سے آخری سورۃ یہی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک آخری ترقی انسان کی جسمانی ضروریات کے متعلق تمدن میں درستی ہی ہے۔ اس سورۃ میں قرآن کریم میں تمدن کو اللہ تعالیٰ کی تین صفات کے ماتحت تین قسموں میں تقسیم کیا ہے سب سے پہلی قسم تمدن کی اہلی تعلقات بیان کی ہے جو خدا تعالیٰ کی صفت ربوبیت کے ماتحت ہے۔ اس میں خاندان اور قوم کے تعلقات پر بحث اور ان کے آپس کے فرائض کو بیان کیا جاتا ہے۔ اہلی تعلقات میں وہ رشتہ داریاں بھی شامل ہیں جو نسبی یا صہری تعلقات کے سبب سے ہوتی ہیں اور وہ برادرانہ تعلقات بھی شامل ہیں جو بوجہ ایک ملک اور ایک علاقہ میں رہنے کے پیدا ہو جاتے ہیں۔

دوسری قسم تمدن کی بادشاہت اور ملکیت کے تعلقات کا بیان ہے یہ قسم بادشاہ اور رعایا اور مالک اور نوکر کے تعلقات پر بحث کرتی ہے اور یہ صفت خدا تعالیٰ کی صفت مالکیّت کے ماتحت ہے۔

تیسری قسم تمدن کی یہ بیان کی ہے کہ ایک ملک کا دوسرے ملک سے اور ایک مذہب کا دوسرے مذہب سے کیا تعلق ہو اور کن قواعد پر انکی بنیاد ہو؟ یہ قسم اللہ تعالیٰ کی صفت الوہیت کے ماتحت ہے۔

صفت ربوبیت خاندان اور برادری کے تعلقات پر روشنی ڈالتی ہے صفت مالکیت بادشاہت اور ملکیت پر روشنی ڈالتی ہے اور صفت الوہیت تمام بنی نوع انسان کے تعلقات اور مذہبی تعلقات پر روشنی ڈالتی ہے۔

اب میں تینوں اقسام کے متعلق اسلام کے الگ الگ احکام بیان کرتا ہوں۔ پہلا تعلق بقائے نسل کے قانون کو مدنظر رکھتے ہوئے میاں بیوی کا معلوم ہوتا ہے اس تعلق کی درستی پر خاندان کی اصلاح کا بہت کچھ دارومدار ہے اور خاندانی تعلقات پر قومی تعلقات کا دارومدار ہے اور اسی طرح یہ سلسلہ وسیع ہوتا چلا جائے گا۔ اسلام میاں بیوی کے تعلق پر پہلی بحث تو یہ کرتا ہے کہ اس تعلق کی بناء اخلاق پر ہونی چاہئے نہ کہ ظاہری حسن و شکل پر یا مال و دولت پر۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے نکاح سے پہلے تقویٰ کا خیال کرلو اور آئندہ جس قسم کی اولاد اس تعلق کے نتیجہ میں پیدا ہوگی اس پر غور کرلو۔ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں تُنْکَحُ الْمَرْاَۃُ لِاَرْبَعٍ لِمَالِھَا وَلِحَسَبِھَا وَجَمَالِھَا وَلِدِیْنِھَا فَاظْفُرْبِذَاتِ الدِّیْنِ تَرِبَتْ یَدَاکَ [۱۹۲]۔ کوئی شخص تو حسب کی خاطر نکاح کرتا ہے کوئی نسب کی خاطر، کوئی خوبصورتی کی خاطر، کوئی مال کی خاطر اے مسلمان! خدا تجھے سمجھ دے تو دیندار اور نیک عورت سے شادی کیجیو۔

کیسی پاکیزہ تعلیم ہے اگر شادی کرتے وقت اس امر کو مدنظر نہ رکھا جائے کہ عورت یا مرد کا دماغ اور طبعی میلان اور ذہانت کیسے ہیں تو اول تو باہمی تعلقات ہی ٹھیک نہیں رہیں گے جس سے تمدن خراب ہوگا۔ دوسرے اولاد کبھی اچھی نہ پیدا ہوگی کیونکہ یہ دیکھا گیا ہے کہ ماں باپ کی ذہانت اور ان کے افکار کا اثر اولاد پر ضرور پڑتا ہے۔ ہوشیار ماں باپ کے لڑکے ہوشیار پیدا ہوتے ہیں اور بیوقوف ماں باپ کے بچے بیوقوف پیدا ہوتے ہیں چنانچہ یوجنکس (EUGENICS - علمِ اصلاحِ نوعِ انسانی) کے علم نے تو اب اس مضمون پر بہت کچھ

روشنی ڈالدی ہے اور گو میرے نزدیک اس علم کے ماہرین استنباط نتائج میں حد سے بہت ہی بڑھ گئے ہیں لیکن پھر بھی اس حد تک ان کی بات درست ہے اور اسلام ان کی تائید کرتا ہے کہ ماں باپ کی دماغی قابلیتوں اور ان کے خیالات کا اثر ایک حد تک اولاد پر ضرور پڑتا ہے پس اس وجہ سے خاوند اور بیوی کا انتخاب ایک نہایت ہی اہم مسئلہ ہے۔

پس شریعت اسلام نے پہلی بنیاد تو تمدن کی یہ رکھی کہ نکاح میں عقل اور فہم اور ذکا کو خوبصورتی اور مال اور خاندان پر ترجیح دیدی۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ اسلام حسب نسب یا مال یا خوبصورتی کو بالکل ہی نظرانداز کرتا ہے بلکہ میرا یہ مطلب ہے کہ اسلام ان کو اصل مقصود قرار نہیں دیتا۔ اگر کوئی عورت مرد دیانتداری سے محض ذہانت اور اخلاق اور دین کی وجہ سے آپس میں ایک دوسرے سے تعلق پیدا کرنا چاہتے ہیں اور ساتھ ہی خوبصورتی اور مال اور حسب و نسب بھی مل جاتا ہے تو یہ بہت اچھی بات ہے مگر یہ امور مقصود نہیں ہونے چاہئیں۔ اگر شادیاں اس اصل پر ہونے لگیں تو ملک کی اخلاقی حالت کی درستی کے علاوہ آئندہ نسلیں نہایت ہی اعلیٰ درجہ کی پیدا ہوں۔

اس غرض کو پورا کرنے کے لئے اسلام نے یہ حکم بھی دیا ہے کہ علاوہ اس کے کہ میاں بیوی آپس میں ایک دوسرے کی نسبت تسلی کرلیں عورت کے رشتہ دار بھی تسلی کرلیں کہ واقع میں مرد ایسے اخلاق کا ہے کہ اس سے رشتہ کرنا عورت کے لئے بھی اور آئندہ نسل کے لئے بھی مفید ہوگا اور نکاح کے لئے یہ شرط لگائی ہے کہ مرد کی پسند ہو عورت کی منظوری ہو اور عورت کے باپ یا بھائی جو خاندان کا بڑا مرد ہو اس کی منظوری ہو اور اگر کوئی مرد خاندان میں نہ ہو تو حاکم شہر اس امر کی تسلی کرے کہ کسی عورت کو کوئی شخص دھوکا دے کر تو شادی نہیں کرنے لگا۔ عورت اور مرد میں اس وجہ سے فرق رکھا گیا ہے کہ مرد طبعاً ایسے امور میں حیا کم کرتا ہے اور خود دریافت کرلیتا ہے اور عورت شرم کرتی ہے اور اس کے احساسات تیز ہوتے ہیں جن کی وجہ سے وہ جلد دھوکا میں آجاتی ہے۔ پس اس کے لئے اس کے خاندان کے بڑے مرد کی تحقیق اور منظوری یا ایسے کسی آدمی کی عدم موجودگی میں حاکم شہر کی منظوری ضروری رکھی ہے۔ اگر اس حکم پر عمل کیا جائے تو وہ بہت سے دھوکے اور فریب جو شریف الطبع اعتماد کرنے والی عورتوں سے کئے جاتے ہیں یک دم دور ہو جائیں۔ چونکہ اسلام میں پردہ کا حکم ہے اس لئے نکاح کے ابتدائی امور طے ہو جانے اور دیگر امور میں تسلی ہو جانے پر مرد اور عورت کو آپس میں ایک دوسرے کو کھلے طور

پر دیکھنے کی اجازت دی ہے تا کہ اگر شکل میں کوئی ایسا نقص ہو جو بعد میں محبت کے پیدا ہونے میں روک ہو تو اس کا علم مرد و عورت کو ہو جائے۔

شادی کے ساتھ ہی شریعت اسلام نے عورت کے لئے علیحدہ جائداد کا انتظام کیا ہے اور اس کو شادی کا ایک ضروری جزو قرار دیا ہے اسے اسلامی اصطلاح میں مہر کہتے ہیں۔ اس کی غرض یہ ہے کہ عورت کی ایک علیحدہ جائداد بھی رہے تا کہ وہ اپنی شخصیت کو قائم رکھ سکے اور اپنے طور پر صدقہ دے سکے یا صلہ رحمی کر سکے۔ گویا مہر کے ذریعہ سے پہلے دن سے ہی مرد سے یہ اقرار کرالیا جاتا ہے کہ عورت اس امر کی حقدار ہے کہ اپنی الگ جائداد بنائے اور خاوند کو اس کے مال پر کوئی تصرف نہیں ہو گا۔ پھر عورت کا یہ حق مقرر کیا ہے کہ خاوند عورت کو بِلا کسی کھلی کھلی بدی کے سزا نہیں دے سکتا۔ اگر سزا دینی ہو تو اس کے لئے پہلے ضروری ہو گا کہ محلّہ کے چار واقف مَردوں کو گواہ بنا کر ان سے شہادت لے کہ عورت واقعہ میں خلافِ اخلاق افعال کی مرتکب ہوئی ہے۔ اس صورت میں بے شک سزا دے سکتا ہے۔ مگر وہ سزا تدریجی ہو گی چنانچہ فرمایا وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَاتَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلاً اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا- وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا [۱۹۳]۔ پہلے وعظ۔ اگر وہ اس سے متأثر نہ ہو تو کچھ عرصہ کے لئے اس سے علیحدہ دوسرے کمرے میں سونا۔ اگر اس کا اثر بھی عورت پر نہ ہو تو گواہوں کی گواہی کے بعد بدنی سزا کا دینا۔ جس کے لئے شرط ہے کہ ہڈی پر چوٹ نہ لگے اور نہ اس مار کا نشان پڑے۔

اور یہ بھی شرط ہے کہ یہ سزا صرف فحش کی وجہ سے دیجاتی ہے نہ کہ گھر کے کام وغیرہ کے نقص کی وجہ سے۔ قطع تعلق کی صورت میں حکم ہے کہ وہ چار ماہ سے زیادہ کا نہیں ہو سکتا۔ اگر چار ماہ سے زیادہ کوئی خاوند اپنی بیوی سے الگ رہے تو اسے قانون مجبور کرے گا کہ عورت کے حقوق ادا کرے اور خرچ کی ادائیگی سے تو وہ ایک دن کے لئے بھی انکار نہیں کر سکتا۔ مرد پر فرض ہے کہ عورت کے کھانے پینے، پہننے اور مکان کی ضروریات مہیا کرے خواہ عورت مالدار اور مرد غریب ہی کیوں نہ ہو۔ اسی طرح مرد کو حکم ہے کہ عورت سے محبت اور پیار کا معاملہ کرے نہ حکومت اور سختی کا بلکہ قرآن کریم نے فرمایا کہ عورتوں سے صلح ہو یا جنگ دونوں صورتوں میں احسان کا ہی معاملہ کرو۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اِسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا [۱۹۴]۔

عورتوں سے نیک معاملہ کرنے کے متعلق میری نصیحت کو یاد رکھو۔ اسی طرح فرمایا لَا یَفْرَکْ مُؤْمِنٌ مُؤْمِنَۃً اِنْ کَرِہَ مِنْھَا خُلُقاً رَضِیَ مِنْھَا اٰخَرَ [۱۹۵]۔ خاوند اپنی بیوی سے نفرت نہ کرے اس وجہ سے کہ اس میں کوئی عیب ہے کیونکہ اگر اس میں کوئی عیب ہے تو کوئی خوبی بھی ہے۔ اسی طرح آپ نے فرمایا عورت کا حق اس کے خاوند پر یہ ہے کہ وہ جیسا کپڑا خود پہنے ویسا اسے پہنائے اور جیسا کھانا خود کھائے ویسا اسے کھلائے اور یہ کہ اسے گالی نہ دے اور اس سے الگ جا کر نہ رہے [۱۹۶]۔ پھر فرمایا کہ کسی مرد کے لئے جائز نہیں کہ دن رات عبادت یا دوسرے کاموں میں مشغول رہے اور اپنی بیوی کے حقوق کو نظر انداز کر دے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے وقت میں سے ایک حصہ اپنی بیوی کے لئے بھی فارغ کرے [۱۹۷]۔

اسی طرح فرمایا کہ خِیَارُکُمْ خِیَارُکُمْ لِنِسَاءِ ھِمْ [۱۹۸]۔ تم میں سے اچھے لوگ وہ ہیں جو اپنی عورتوں سے اچھا سلوک کرتے ہیں ان کے بالمقابل عورت کو یہ حکم دیا کہ وہ اپنے خاوند کی فرمانبردار رہے۔ اس کے مال کو ضائع ہونے سے بچائے [۱۹۹]۔ اس کی عزت کی حفاظت کرے اس کی اولاد کی اچھی طرح پرورش کرے۔

اگر عورت مرد کے تعلقات کسی وقت بگڑ جائیں تو حکم ہے کہ جس قدر ہو سکے صلح کی کوشش کریں۔ اگر آپس میں صلح نہ ہو سکے اور فساد بڑھتا ہی جائے تو اسلام کہتا ہے کہ ایک حکم مرد کے عزیزوں یا عزیز نہ ہوں تو دوستوں میں سے ' ایک عورت کے عزیزوں یا عزیز نہ ہوں تو اس کے خیر خواہوں میں سے مقرر کیا جائے دونوں مل کر نااتفاقی کی وجوہ پر غور کریں۔ اگر ان کے نزدیک صلح ممکن ہو تو ان تجاویز کے ذریعہ سے جو ان کے ذہن میں ہوں صلح کرانے کی کوشش کریں اگر ان کے نزدیک صلح کی کوئی صورت ممکن نہ ہو یا ان کی تجاویز ناکام ہو جائیں تو پھر مرد کو اجازت ہو گی کہ وہ عورت کو طلاق دے دے یعنی اپنے نکاح کے فسخ کرنے کا اعلان کر دے اس اعلان فسخ نکاح کے لئے بھی شرائط مقرر ہیں مثلاً علی الاعلان ہو۔ اسی طرح پسند کیا گیا ہے کہ ایک ایک ماہ کے بعد تین دفعہ کر کے ہو تا کہ شاید اس عرصہ میں پھر دل درست ہو جائیں تو صلح کر لیں جس کا دروازہ آخری اعلان تک کھلا رکھا گیا ہے۔

اگر عورت کو خاوند سے شکایت ہو اور وہ الگ ہونا چاہے تو جس طرح ان کے نکاح کے وقت اس کے سب سے قریبی مرد رشتہ دار یا حاکم کی وساطت ضروری رکھی گئی تھی اس موقع پر بھی یہ شرط مقرر کی گئی ہے کہ وہ حاکم وقت کی وساطت سے خاوند سے علیحدہ ہو۔ اگر حاکم دیکھے کہ اس کا

دعویٰ حق بجانب ہے تو حکماً خاوند سے اس کو الگ کر دے۔

جدائی کے متعلق یہ احکام ہیں کہ اگر خاوند نے کوئی جائداد عورت کو دی ہوئی ہے تو اگر طلاق اس کی طرف سے ہے تو وہ اپنے دیئے ہوئے مال کو بیوی سے واپس نہیں لے سکتا اور اگر حَکم طلاق کا فیصلہ کریں اور ان کے نزدیک قصور عورت کا ہو تو وہ اس سے ایک حصہ مال کا خاوند کو واپس دلا سکتے ہیں اور اگر عورت خود الگ ہونا چاہے تو قاضی اس سے ایسی کوئی جائداد جو خاوند نے اس کو دی تھی اور وہ اب تک موجود ہے خاوند کو واپس دلا دے گا۔ طلاق کی صورت میں جب تک مدتِ طلاق نہ گزر جائے خرچ اور مکان خاوند کے ذمہ ہو گا۔

عورت کے حقوق کو محفوظ کرنے کے لئے یہ بھی شرط لگا دی کہ اس کے رشتہ دار نکاح سے پہلے کوئی رقم نکاح کی شرط میں نہیں لے سکتے تا ایسا نہ ہو کہ عورتوں کے نکاح کے متعلق جو ان کو منظوری کا حق دیا گیا ہے وہ اس کو ناجائز طور پر استعمال کریں۔

چونکہ کئی مجبوریاں ایسی پیش آجاتی ہیں جیسے بقائے نسل یا بقائے صحت یا ضروریات سیاسی وغیرہ جن میں ایک سے زیادہ شادیوں کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے اسلام نے ایک سے زیادہ شادیوں کی بھی اجازت دی ہے مگر شرط یہ ہے کہ بیویوں میں انصاف قائم رکھا جائے۔ لباس میں، خوراک میں، جیب خرچ میں، تعلقات و سلوک میں بیویوں سے بالکل یکساں برتاؤ ہو۔ باری باری ایک ایک عورت کے پاس خاوند رہے اور اگر ایسا نہ کرے تو رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کا حال ایسا ہی ہو گا کہ گویا وہ آدھے دھڑ کے ساتھ اٹھا ہے۔[۲۰۰]

کثرت ازدواج پر عام طور پر اعتراض کیا جاتا ہے اور اسی طرح طلاق پر، لیکن عجیب بات ہے کہ مغرب طلاق کی وجہ سے خدا کے مقدسوں کو پانچ چھ سو سال گالیاں دینے کے بعد اس بات کا قائل ہو رہا ہے کہ طلاق کی بھی کوئی صورت ضرور ہونی چاہئے کیونکہ اس کے بغیر ملک کا تمدن برباد ہو رہا ہے۔ کاش کہ وہ پہلے ہی سوچتا اور خدا کے برگزیدوں پر اعتراض کا خنجر نہ چلاتا اور کم سے کم بدکلامی نہ اختیار کرتا تا آج کی شرمندگی کا دن اسے میسر نہ آتا مگر افسوس ہے کہ یورپ اب بھی اسلام کے قانون کو جس میں سب پہلوؤں کو مدنظر رکھا گیا ہے ایک طرف طلاق کو جس قدر ہو سکے روکا گیا ہے اور دوسری طرف آخری علاج کے طور پر اس کی اجازت بھی دی گئی ہے اختیار نہیں کرنا چاہتا اور خدا کی بات کو چھوڑ کر خود نئے قوانین بنانا چاہتا ہے جس کا نتیجہ ابھی سے خراب نکلنا شروع ہو گیا ہے اور طلاق کی حد سے بڑھی ہوئی آزادی سے نکاح کا وہ تقدس جو اہلی

زندگی کی روح رواں ہے برباد ہو رہا ہے اور خطرہ ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں یہ بنیاد کھوکھلی ہو کر اوپر کی عمارت کو بھی صدمہ پہنچا دے۔

اب رہا کثرت ازدواج کا مسئلہ اس کی طرف ابھی تک مغرب نے سنجیدگی سے توجہ نہیں کی لیکن آخر اس کو ایسا کرنا پڑے گا کیونکہ قدرت کے قوانین کا مقابلہ دیر تک نہیں کیا جا سکتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ ایک عیاشی کا ذریعہ ہے لیکن اگر اسلام کے احکام پر غور کیا جائے تو ہر ایک شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ عیاشی نہیں بلکہ قربانی ہے اور قربانی بھی عظیم الشان قربانی۔ عیاشی کسے کہتے ہیں؟ اسی کو کہ انسان اپنے دل کی خواہش کو پورا کرے مگر اسلامی احکام کے ماتحت ایک سے زیادہ شادیوں میں دل کی خواہش کس طرح پوری ہو سکتی ہے؟ اسلام حکم دیتا ہے کہ ایک بیوی خواہ کتنی بھی پیاری ہو اس کے ساتھ ظاہری معاملہ میں فرق نہ کرو۔ تمہارا دل اسے خواہ اچھا لباس پہنانے کو چاہتا ہو مگر تم اس کو وہ لباس نہیں پہنا سکتے جب تک کہ دوسری کو بھی ویسا ہی لباس نہ پہناؤ۔ تمہارا دل خواہ اسے عمدہ کھانا کھلانے یا اس کے پاس نوکر رکھ دینے کو چاہتا ہے مگر اسلام کہتا ہے کہ تم ہرگز ایسا نہیں کر سکتے جب تک کہ ایسا ہی سلوک دوسری بیوی سے نہ کرو۔ تمہارا دل خواہ ایک بیوی کے گھر کتنا ہی رہنے کو چاہتا ہو مگر اسلام کہتا ہے کہ تم ہرگز ایسا نہیں کر سکتے جب تک اسی قدر تم دوسری بیوی کے پاس نہ رہو یعنی برابر کی باری مقرر کرو۔ پھر تمہارا دل ایک بیوی سے خواہ کس قدر ہی اختلاط کو چاہتا ہو۔ اسلام کہتا ہے بے شک تم اپنے دل کی خواہش کو پورا کرو مگر اسی طرح تمہیں اپنی دوسری بیوی کے پاس جا کر بیٹھنا ہو گا۔ غرض سوائے دل کے تعلق کے جو کسی کو معلوم نہیں ہو سکتا سلوک' معاملہ' امداد' خیر خواہی کسی امر میں فرق کرنے کی اجازت نہیں ہے کیا یہ زندگی عیاشی کی کہلا سکتی ہے یا یہ قوم اور ملک کے لئے یا ان فوائد کے لئے جن کے لئے دوسری شادی کی جاتی ہے ایک قربانی ہے اور قربانی بھی کتنی بڑی قربانی؟

کیسا دکھ اور صدمہ ہوتا ہے یہ دیکھ کر کہ جو لوگ اسلامی احکام سے ایک ذرّہ بھر بھی واقفیت نہیں رکھتے وہ صرف یہ سن کر کہ رسول کریم ﷺ نے ایک سے زیادہ شادیاں کی تھیں یہ اعتراض کر بیٹھے ہیں کہ آپ کے اخلاق نَعُوْذُ بِاللّٰہِ بعد میں آکر خراب ہو گئے تھے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ آپ نے ملک اور قوم کی بہتری کے لئے شادیاں کیں اور آپ کے انصاف کا حال پڑھ کر انسان کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ آپ کو عدل کا اس قدر خیال تھا کہ آپ مرض کے شدید بخار کی حالت میں دو آدمیوں کے کاندھے پر ہاتھ

رکھ کر جب کہ آپ کے پاؤں زمین پر گھسٹتے جاتے تھے ایک بیوی کے گھر سے دوسری بیوی کے گھر جاتے تھے۔ حتیٰ کہ وفات سے چند دن پہلے آپؐ کی بیویوں نے درخواست کی کہ آپؐ کو تکلیف ہوتی ہے آپؐ ایک ہی گھر میں آرام سے رہیں اور خود ہی انہوں نے عائشہؓ کا گھر تجویز کیا۔[۲۰۱]

بعض ایک سے زیادہ شادیوں کو ظلم قرار دیتے ہیں مگر یہ ظلم نہیں کیونکہ ایسی ضرورتیں پیش آتی ہیں جب شادی نہ کرنا ظلم ہو جاتا ہے۔ ایک عورت جو پاگل ہو جائے' کوڑھی ہو جائے' یا اس کی اولاد نہ ہو اس وقت اس کا خاوند کیا کرے؟ اگر وہ دوسری شادی نہیں کرے گا اور کسی بدکاری وغیرہ میں مبتلاء ہو گا تو یہ اس کا اپنی جان اور سوسائٹی پر ظلم ہو گا اور اگر وہ کوڑھی ہے تو اپنی جان پر ظلم ہو گا اگر اولاد نہیں ہوئی تو قوم پر ظلم ہو گا اور اگر وہ پہلی عورت کو جدا کر دے تو یہ حد درجہ کی بے حیائی اور بے وفائی ہو گی کہ جب تک وہ تندرست رہی یہ اس کے ساتھ رہا اور جب وہ اس کی مدد کی سب اوقات سے زیادہ محتاج تھی اس نے چھوڑ دیا۔ غرض بہت سے مواقع ایسے پیش آتے ہیں کہ دوسری شادی جائز ہی نہیں کہ یہ بہت کمزور لفظ ہے بلکہ ضروری نہیں بلکہ ایک قومی فرض ہو جاتا ہے۔

میاں بیوی کے تعلقات کے بعد اولاد پیدا ہوتی ہے جو تمدن کی گویا دوسری اینٹ ہیں اولاد کے متعلق اسلام نے یہ حکم دیا کہ انکی عمدگی سے پرورش کی جائے۔ والدین پر ان کا پالنا اور ان کی ضروریات کو پورا کرنا فرض ہے ان کو خرچ کی تنگی کی وجہ سے مار دینا جیسا کہ وحشی قبائل میں رواج تھا' بصورت لڑکیوں کے بوجہ تکبر کے مار دینا جیسا کہ کئی جنگی قوموں میں دستور تھا منع ہے۔ اولاد کی پیدائش کے متعلق حکم دیا کہ خاوند اگر چاہے کہ اس کے اولاد نہ ہو تو اس کے لئے عورت سے اجازت لینا ضروری ہو گا بغیر عورت کی اجازت کے اولاد کو روکا نہیں جا سکتا۔[۲۰۲]

پھر فرمایا کہ بچوں کو علم اور اخلاق سکھائے جائیں اور بچپن سے انکی تربیت کی جائے تاکہ وہ بڑے ہو کر مفید بن سکیں۔ اولاد کے درمیان بھی یکساں سلوک کرنے کا حکم دیا۔ بچپن میں انکی خواہشات اور ضروریات کے مطابق سلوک تو خیر اور بات ہے مگر جب وہ بڑے ہو جائیں تو حکم دیا کہ جو تحفہ دے وہ سب کو دے ورنہ کسی کو نہ دے۔ اولاد کو تربیت کی خاطر اگر مارنا پڑے تو حکم دیا کہ منہ پر نہ مارے کہ تمام آلاتِ حواس اس میں جمع ہیں اور ان کے نقصان سے بچہ کی آئندہ زندگی پر اثر پڑتا ہے۔

لڑکیوں کی تربیت کے متعلق خاص حکم ہے۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جس کے گھر میں

لڑکی پیدا ہو اور وہ اس کی اچھی طرح تربیت کرے تو اس کا یہ کام اس کو آگ سے بچانے والا ہوگا۔ [۲۰۳] یعنی لڑکیوں کی اچھی طرح تربیت کرنی اور اُن سے حسن سلوک کے سبب سے اللہ تعالیٰ اس سے اچھا معاملہ کرے گا۔

اسی طرح آپؐ نے فرمایا جس شخص کے ہاں لڑکے ہوں یا لڑکیاں ہوں یا اس کے ذمے بھائیوں یا بہنوں کی پرورش ہو اور وہ ان کو علم سکھائے اور اچھی طرح ان کی ضروریاتِ زندگی کا انتظام کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلہ میں اس شخص کو جنت دے گا [۲۰۴]۔ یعنی وہ اس کام کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کے مزید فضل کو جذب کرے گا نہ یہ کہ خواہ وہ اور کوئی بدی کرے اس کا اثر اس کی روحانیت پر کوئی نہ ہوگا۔ اسی طرح فرمایا جس کے گھر لڑکی ہو اور وہ نہ اسے قتل کرے نہ اسے ذلیل کرکے رکھے نہ لڑکوں کو اس پر فضیلت دے تو خدا تعالیٰ اسے جنت دے گا۔

اولاد کی صحت کا خیال رکھنے کا خاص حکم دیا ہے رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں اے لوگو! اپنے بچوں کو مخفی طور پر قتل نہ کرو [۲۰۵]۔ کیونکہ مرد کا عورت سے ایام رضاعت میں ملنا جوانی میں جاکر بچے کے قویٰ کو نقصان دیتا ہے یعنی ان دنوں میں اس کا اثر خاص طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ اس ارشاد سے ایک عام قانون بچہ کی صحت کے خیال کا نکلتا ہے کیونکہ اس غرض کے لئے اگر شہوات طبعیہ کو روکنا پسند کیا گیا ہے تو دوسری قربانیاں تو اس سے ادنیٰ ہی ہیں۔

اہلی زندگی میں ایک سوال ورثہ کا ہے اس میں اسلام نے ایسی مکمل تعلیم دی ہے کہ تمام غیر متعصب لوگ خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں اس کی خوبی اور اس کی حکمت کو تسلیم کرتے ہیں۔ اول تو اسلام نے ورثہ کے معاملہ میں عورتوں کو بھی حصہ دار مقرر کیا ہے دوسرے والدین کو حصہ دار مقرر کیا ہے سوم خاوند اور بیوی کو حصہ دار مقرر کیا ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ رشتہ دار عقلاً ضرور وارث ہونے چاہئیں۔ علاوہ مذکورہ بالا ہدایتوں کے شریعت اسلام حکم دیتی ہے کہ وارثوں کو ان کے ورثہ سے محروم نہ کیا جائے۔ پس کوئی شخص اپنے مال سے وارثوں کو محروم نہیں کرسکتا ہاں مرنے والے کو یہ حق دیا ہے کہ اپنے مال میں سے ایک ثُلث وصیت کردے اس سے زیادہ مال وصیت کرنے کا کسی کو حق نہیں کیونکہ اس سے وارثوں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ حکم ہے کہ وصیت وارث کے حق میں نہیں کی جاسکتی وارثوں کو وہی حصہ ملے گا جو ان کے لئے مقرر ہو چکا ہے۔ غیر وارث کو حصہ دیا جاسکتا ہے۔

عورت کا حصہ مرد سے اکثر حالتوں میں نصف رکھا ہے جن میں برابر رکھا ہے وہاں خاص

حکمتوں کے ماتحت کیا گیا ہے بعض لوگ اس فرق میں بے انصافی دیکھتے ہیں حالانکہ عورتوں کے حقوق اب تک بھی محفوظ نہیں ہیں صرف اسلام ہی ہے جس نے عورتوں کو پورے حق دلائے ہیں۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ اسلام نے ماں پر خرچ کی کوئی ذمہ داری نہیں رکھی تمام اخراجات مرد پر رکھے ہیں۔ اس وجہ سے مرد کی مالی ذمہ داری بہ نسبت عورت کے بہت زیادہ ہوتی ہے پس وہ زیادہ حصہ کا مستحق تھا۔ بچوں کی پرورش بیوی کی پرورش مرد کے ذمہ ہے عورت اگر نکاح کرے گی تو اس کا اور اس کی اولاد کا خرچ اس کے خاوند کے ذمہ ہوگا۔ اگر نہ کرے گی جسے اسلام پسند نہیں کرتا تو وہ اکیلی جان ہوگی مگر مرد اگر نکاح کرے گا اور اسی کا اسلام اسے حکم دیتا ہے تو اسے اپنی بیوی اور بچوں کا خرچ برداشت کرنا ہوگا پس مرد کا عورت سے دُگنا حصہ مرد کی رعایت کے طور پر یا عورتوں کی ہتک کے طور پر نہیں ہے بلکہ واقعات کو مدنظر رکھ کر یہ حکم دیا گیا ہے اور عورتوں کو اس میں ہرگز نقصان نہیں بلکہ وہ شاید پھر بھی فائدہ میں رہتی ہیں۔

اولاد پر والدین کے حقوق اس طرح مقرر فرمائے ہیں کہ وہ اپنے والدین کی عزت کریں ان کی فرمانبرداری کریں اور جب وہ ناقابل ہو جائیں تو ان کی ضروریات کے کفیل ہوں اور ان کے احساسات کو صدمہ نہ پہنچنے دیں۔ ان سے تُرش روئی سے پیش نہ آویں بلکہ ان کے لئے دعائیں کریں اور خدا تعالیٰ سے ان کی بہتری کے لئے عرض کرتے رہیں۔

بھائیوں کا بھائیوں پر یہ حق مقرر فرمایا ہے کہ وہ اپنے لاوارث بھائیوں کو پالیں اور اسی طرح اگر بھائی لاوارث ہوں تو ان کے وارث بنیں۔ دوسرے رشتہ داروں پر بھی یہی حق مقرر کیا گیا ہے کہ اگر بھائی بھی نہ ہوں تو باپ کی طرف کے رشتہ دار وہ نہ ہوں تو ماں کی طرف کے رشتہ دار پرورش کریں اور ان کے لاوارث مرنے کی صورت میں ان کے وارث ہوں۔

خاندان کے بعد محلہ دار اور ہم وطن لوگوں کے تعلقات ربوبیت میں شامل ہیں۔ ان کے متعلق اسلام حکم دیتا ہے کہ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ [206] اور اپنے والدین سے نیک سلوک کرو اور یتامیٰ سے اور مسکینوں سے اور قریب کے ہمسایہ سے اور دور کے ہمسایہ سے اور شریک فی العمل سے اور مسافر سے اور غلاموں سے۔

تمدن کی اساس مختلف لوگوں کے نیک تعلقات ہی ہیں اور خصوصاً غرباء کی خبر گیری جو گویا پیچھے رہے ہوئے بھائی ہیں۔ اسلام نے ان سب لوگوں کے حقوق کو بیان کر کے تعلقات کو نہایت

مضبوط بنیاد پر قائم کردیا ہے۔

یتیم وہ ہیں جن کے ماں باپ نہیں ان کی خبر گیری کی ذمہ داری سوسائٹی پر رکھی کہ مالداروں کو چاہئے کہ ان کو اپنے بچوں کی طرح پالیں۔ دوسری ذمہ داری یہ رکھی کہ مساکین جو بوجہ مال نہ ہونے کے کوئی کام نہیں کرسکتے ان کی مدد کریں اور ان کو کام کا موقع دیں اس کے بعد ان لوگوں کو لیا جو مالدار ہیں۔ یعنی ہمسائے خواہ قریب کے ہوں خواہ دور کے یعنی گھر کے پاس جن کا گھر ہو یا شہر کے دور حصوں میں رہنے والے ہوں یا یہ کہ کسی دوسرے ہمسایہ شہر کے باشندے ہوں ان کی نسبت فرمایا کہ ان سے نیک سلوک کرو تا کہ محبت بڑھے اور تعلقات مضبوط ہوں۔

پھر فرمایا کہ شریک فی العمل یعنی جو لوگ ساتھ ملازم ہوں یا تجارت یا پیشہ میں شریک ہوں ان کا بھی خاص حق ہوتا ہے ان کی بھی خاص مدد کرنی چاہئے۔

اگرچہ میں مزدوروں اور پیشہ وروں کی مجالس کا تو قائل نہیں ہوں جو میرے نزدیک صرف یورپ کے تمدن کا نتیجہ ہیں اگر اسلامی تمدن کے قوانین کی اتباع کی جائے تو بلا ایسی انجمنوں کے مزدوروں کے حقوق احسن طور پر ادا ہوسکتے ہیں مگر میرے نزدیک ایک قسم کی مؤاسات اور مشارکت کا اس حکم سے ضرور پتہ ملتا ہے اور اسلام ہمیں حکم دیتا ہے کہ ایک پیشہ یا ایک کام کرنے والوں کو آپس میں خاص طور پر تعاون اور مدد سے کام لینا چاہئے۔[۲۰۷]

سب سے آخر میں یہ حکم دیا کہ مسافر جو اپنے عزیز رشتہ داروں سے دور ہے اس سے نیک سلوک بھی تمہارا فرض ہے اس سے یہ مراد نہیں کہ غریب مسافر سے نیک سلوک کریں بلکہ ہر مسافر کے متعلق حکم ہے خواہ وہ کتنا بھی امیر کیوں نہ ہو۔تا کہ دور و نزدیک محبت کا تعلق قائم ہو اور امن کی بنیاد رکھی جائے۔

بڑوں اور چھوٹوں کے تعلقات کے متعلق اسلام حکم دیتا ہے کہ لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَلَمْ يُوَقِّرْ كَبِيْرَنَا [۲۰۸]۔ یعنی جو بڑا ہو کر چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور چھوٹا ہو کر بڑوں کا ادب نہ کرے وہ ہمارے طریق پر نہیں۔ اس حکم سے استاد اور شاگرد اور آقا اور ملازم اور اسی قسم کے اور سب تعلقات کے متعلق ایک اصولی ہدایت دی گئی ہے۔

عورت اور مرد کے عام تعلقات کے متعلق یہ تعلیم دی ہے کہ مردوں کو عورتوں کے آرام کا خیال رکھنا چاہئے چنانچہ رسول کریم ﷺ نماز کے بعد تھوڑی دیر بیٹھے رہتے تاکہ پہلے عورتیں آرام سے گزر جائیں۔ جب وہ گزر جاتیں تو پھر آپؐ اٹھتے اور دوسرے مرد بھی آپؐ کے ساتھ

اٹھتے۔[209] سفر میں جب لوگ اونٹوں کو تیز کرتے تو آپ فرماتے کہ شیشوں کا بھی خیال رکھو[210] یعنی عورتیں ساتھ ہیں وہ تمہاری طرح تکلیف برداشت نہیں کر سکتیں اس لئے آہستہ چلو تا ان کو تکلیف نہ ہو۔

خاوندوں کو حکم دیا کہ سفر سے واپس آتے ہوئے گھر میں اچانک داخل نہ ہوں بلکہ دن کے وقت اور پہلے سے مطلع کر کے آئیں تا کہ عورتیں گھر کی اور بدن کی صفائی کا اہتمام کر لیں۔[211]

عورتوں کے متعلق یہ بھی حکم دیا کہ ان کو ان کے بچوں سے جدا نہ کیا جائے[212]۔ جس میں ایک عام قاعدہ بتایا ہے کہ عزیزوں اور رشتہ داروں کو آپس میں جدا نہ کرنا چاہئے بلکہ ان کو آپس میں ملنے کا موقع دیتے رہنا چاہئے۔

آپس کے تعلقات کو قطع کرنے والے سب امور سے منع فرمایا ہے مثلاً یہ کہ کوئی کسی شخص پر الزام نہ لگائے اور اگر کوئی بدکاری کا الزام لگائے اور اس کو ثابت نہ کر سکے تو اسے سخت سزا دی جائے۔

اسی طرح حکم دیا کہ نکاح پر نکاح کی درخواست نہ دے[213]۔ اگر معلوم ہو جائے کہ کوئی شخص کسی جگہ رشتہ کی تحریک کر رہا ہے تو گو اسے معلوم ہو کہ اگر میں درخواست دوں تو مجھے کامیابی کی زیادہ امید ہے اس وقت تک خاموش رہے جب تک پہلی درخواست کا فیصلہ نہ ہو جائے۔

عام شہریت کے اصول

ایک مسلمان شہری کے جو کام اسلام نے مقرر کئے ہیں اب میں ان میں سے بعض کا ذکر کرتا ہوں۔ ایک حق اسلام نے یہ مقرر کیا ہے کہ ہر ایک آدمی محنت کر کے کھائے اور ست نہ بیٹھے۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ بہترین رزق وہ ہے جو انسان اپنے ہاتھوں کی کمائی سے مہیا کرے اور فرمایا کہ داؤد علیہ السلام کی عادت تھی کہ وہ ہاتھ کی محنت سے اپنا رزق پیدا کرتے تھے۔[214]

ایک فرض مسلم شہری کا اسلام نے یہ مقرر کیا ہے کہ وہ سوال نہ کرے۔ رسول کریم ﷺ اس امر کے متعلق خاص طور پر خیال رکھتے تھے اور ہمیشہ سوال سے لوگوں کو منع کرتے رہتے تھے۔[215] حدیث میں آتا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا سوال صرف تین شخصوں کو جائز

ہے۔ ایک اس شخص کو جو فقر سے نکلنے کی بہت کوشش کرتا ہے مگر اسے کوئی کام ہی نہیں ملتا یا وہ بالکل کام کر ہی نہیں سکتا۔ دوسرے وہ شخص جس پر کوئی ایسی چٹی پڑ گئی ہو جو اس کے خیال و گمان سے باہر تھی پس ایسے شخص کے لئے چندہ جمع کیا جا سکتا ہے اور تیسرے ان لوگوں کے لئے سوال جائز ہے کہ جن پر کوئی قومی جرمانہ آپڑا ہو[۲۱۶]۔ یعنی کسی شخص نے کوئی خون وغیرہ کر دیا ہو اور قوم پر تاوان پڑ گیا ہو تو وہ لوگ سوال کر سکتے ہیں۔

ایک فرض مسلم شہری کا یہ ہے کہ جو شخص اس کے سامنے سے آئے اسے اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ کہے[۲۱۷]۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے تم پر سلامتی ہو گویا ہر وقت تعلقات فی مابین کی درستی کی کوشش کرتا رہے۔ پھر جو شخص آتا ہوا ملے اور وہ واقف اور دوست ہو تو مسلم شہری کا فرض یہ ہے کہ اس سے مصافحہ کرے۔

اسی طرح مسلم شہریوں کے یہ فرائض مقرر کئے گئے ہیں کہ جو لوگ اپنے محلّہ کے یا دوسرے واقفوں میں سے بیمار ہوں ان کی عیادت کے لئے جائیں اور ان کی تسلّی اور تشفّی کریں گھر میں گھسیں تو پہلے اجازت لے لیں۔ پہلے اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ کہیں اگر گھر میں کوئی ہو اور جواب دے کہ اس وقت نہیں مل سکتا تو بلا ملال کے واپس چلے جائیں۔ اگر کوئی نہ ہو تو بھی واپس چلے جائیں۔[۲۱۸]۔ اگر ان کے سامنے کوئی شخص کوئی ایسی بات کہہ دے جو کسی دوسرے شخص کے خلاف ہو تو اس کو دبا دیں اور اس شخص تک نہ پہنچائیں جس کو کہی گئی ہے ورنہ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ یہ سمجھا جائے گا کہ وہ بات اسی نے کہی ہے۔ آپؐ فرماتے ہیں کہ کہنے والے کی مثال تو ایسی تھی کہ اس نے تیر مارا اور لگا نہیں اور جس نے اس کو وہ پہنچا دی جس کے حق میں کہی گئی تھی اس کی مثال ایسی ہے جیسے اس نے تیر اٹھا کر اس شخص کے سینے میں چبھو دیا۔[۲۱۹]۔

اسی طرح مسلم شہریوں کا یہ فرض ہے کہ جو شخص فوت ہو جائے اس کے جنازے کی تیاری میں مدد دیں اور قبر تک لے جائیں اور دفنائیں[۲۲۰]۔ لیکن سب کے جانے کی ضرورت نہیں اگر بقدر ضرورت آدمی چلے جائیں تو یہ کافی ہو گا۔ لیکن اگر کوئی بھی نہ جائے تو سب گنہگار ہونگے اس فرض کی ادائیگی کا مسلمان اس قدر خیال رکھتے تھے کہ صحابہ کے زمانہ کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر مذاہب کے لوگوں تک کے جنازوں کے ساتھ مسلمان جاتے تھے۔

اسی طرح مسلم شہریوں کا فرض ہے کہ ایسی باتیں جو وقار کے خلاف ہوں اور لوگوں کو

تکلیف دینے والی ہوں نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مسلمان بازاروں اور گلیوں میں وقار کے ساتھ چلتے ہیں۔ رسول کریم ﷺ نے کسی شخص کو دیکھا کہ ایک جوتی پہنے ہوئے چل رہا ہے تو آپ نے اسے منع فرمایا اور فرمایا کہ یا آدمی دونوں جوتیاں پہنے یا ایک بھی نہ پہنے۔ [۲۲۱] مسلم شہریوں کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ راستوں یا لوگوں کے جمع ہونے کی جگہوں میں کوئی غلاظت نہ پھینکیں اور ان کو گندہ نہ کریں رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ اس شخص پر خدا کی ناراضگی نازل ہوتی ہے جو راستوں میں پاخانہ کرتا ہے یا درختوں کے نیچے جہاں لوگ آکر بیٹھتے ہیں۔ [۲۲۲]

اسی طرح مسلم شہری کا یہ بھی فرض ہے کہ راستوں اور پبلک جگہوں کو صاف رکھنے کی کوشش کرے اور جس قدر مدد ان کے صاف کرنے میں دے سکتا ہے دے۔ چنانچہ رسول کریمؐ فرماتے ہیں جو شخص راستہ میں سے لوگوں کو ایذاء دینے والی چیزیں ہٹاتا ہے اس پر خدا کا فضل نازل ہوتا ہے۔ [۲۲۳]

مسلم شہری کا ایک یہ بھی فرض ہے کہ اگر وہ چیزیں فروخت کرے تو ضرر رساں چیزوں کو فروخت نہ کرے۔ مثلاً سڑی ہوئی یا موسم کے لحاظ سے بیماریاں پیدا کرنے والی چیزوں کو اس کے لئے یہ کہنا کافی نہیں کہ لوگ جان کر اور سوچ سمجھ کر ان چیزوں کو لیتے ہیں بلکہ اس کا فرض ہے کہ وہ خود لوگوں کی صحت کا خیال رکھے اور ایسی چیزوں کو فروخت ہی نہ کرے۔

مسلم شہری کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ پبلک جگہوں پر بلند آواز سے لڑے اور جھگڑے نہیں اور لوگوں کے امن اور آرام میں خلل نہ ڈالے اور اس کا یہ بھی فرض ہے کہ ایسی جگہیں کہ جن کو لوگ استعمال کرتے ہیں ان کو گندہ نہ کرے۔ مثلاً کھڑے پانی میں پیشاب نہ کرے یا اور کوئی غلاظت ان میں نہ پھینکے اور اس کا یہ بھی فرض ہے کہ گندہ کلام منہ پر نہ لائے اور نہ پبلک جگہوں پر کوئی ایسا فعل کرے جو لوگوں کو ایذاء دیتا ہو۔ مثلاً ننگا نہ پھرے یا اور ایسی ہی کوئی حرکت نہ کرے۔

پھر اسلام ہمیں یہ بھی سکھاتا ہے کہ ایک مسلم شہری کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ لوگوں کو اچھی باتیں سکھاتا رہے اور بد باتوں سے روکتا رہے مگر نرمی اور محبت سے سکھائے تا لوگ جوش میں آکر حق سے اور بھی دور نہ ہو جائیں اور مسلم شہری کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ لوگوں کو علم سکھائے اور جو کچھ اُسے معلوم ہو اُسے چھپائے نہیں بلکہ لوگوں تک اس کا فائدہ عام کرے۔ کیونکہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص کسی علم کو چھپاتا ہے اور باوجود لوگوں کے پوچھنے کے

ظاہر نہیں کرتا اس کے منہ میں قیامت کے دن آگ کی لگام ہوگی [۲۲۴]۔ اس حکم کا یہ مطلب نہیں کہ جو ایجادیں وغیرہ لوگ کریں ان کو لوگوں پر ظاہر کردیں اور خود فائدہ نہ اٹھائیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ علم کو دنیا سے ضائع نہ ہونے دیں اور اس کو چھپائیں نہیں ورنہ فائدہ اٹھانا جائز اور درست ہے اور پیٹنٹ یا رجسٹری کے رواج سے تو علوم کی حفاظت کا ایک دروازہ کھل ہی گیا ہے۔

مسلم شہری کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ بہادر رہے لیکن ظالم نہ ہو۔ وہ نہ کمزوروں پر نہ عورتوں پر نہ بچوں پر نہ اور کسی پر ظلم کرے بلکہ وہ جانوروں تک پر ظلم نہ کرے چنانچہ لکھا ہے کہ عبداللہ جو حضرت عمرؓ خلیفہ ثانی کے لڑکے تھے انہوں نے ایک دفعہ چند نوجوانوں کو دیکھا کہ زندہ جانوروں پر نشانہ پکا رہے ہیں۔ جب ان لوگوں نے آپ کو دیکھا تو بھاگ گئے آپ نے فرمایا خدا ان پر ناراض ہوا جنہوں نے یہ کام کیا۔ میں نے رسول کریمؐ سے سنا ہے آپ نے فرمایا خدا اس پر ناراض ہوا جس نے کسی جاندار چیز کو نشانہ بنایا یعنی باندھ کر [۲۲۵] یا پَر وغیرہ توڑ کر۔ ورنہ یوں شکار اسلام میں منع نہیں۔

اسلام کا یہ حکم کیسا لطیف ہے جس کی تیرہ سو سال سے تعلیم دی جاتی رہی ہے جو ابھی بعض متمدن ممالک کے ذہنوں میں داخل نہیں ہوئی کیونکہ تھوڑا ہی عرصہ ہوا بعض مغربی ممالک میں زندہ کبوتروں پر نشانے پکانے کی ایک لہر چلی تھی اور بعض جگہ اسے جبراً روکنا پڑا تھا۔

اسی طرح لکھا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ایک گدھے کو دیکھا کہ اس کے منہ پر داغ دیا ہوا تھا آپؐ نے اسے نہایت ناپسند فرمایا اور فرمایا کہ منہ پر جانور کو زیادہ تکلیف ہوتی ہے آئندہ داغ ران پر دیا جائے [۲۲۶]۔ اور آپ ﷺ کے حکم سے ہی ران پر داغ دینے کا رواج چلا۔ اسی طرح آپ نے دیکھا کہ کسی نے قمری کے بچوں کو پکڑ لیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس طرح اسے بچوں کی وجہ سے تکلیف نہ دو۔ فوراً بچے اُڑا دو اور آپ نے فرمایا کہ جانوروں پر رحم کرنے اور بھوک میں کھلانے اور پیاس میں پلانے پر بھی خدا تعالیٰ رحم کرتا ہے۔ [۲۲۷]

پھر مسلم شہری کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کی جانوں کو خطرے میں نہ ڈالے چنانچہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ جس علاقہ میں کوئی وبائی بیماری ہو وہاں کے لوگ دوسرے شہروں میں نہ جائیں اور دوسرے لوگ اس علاقہ میں نہ آئیں۔ [۲۲۸] کیا ہی لطیف حکم ہے جسے آج قرنطینہ کے نام سے ایک نئی ایجاد قرار دیا جارہا ہے۔ حالانکہ اس حکم کی ابتداء اسلام سے

شروع ہوئی ہے۔ اگر اس حکم پر لوگ عمل کریں تو نہ قرنطینہ کے قیام کی ضرورت رہتی نہ سرکاری نگرانیوں کی۔ خود بخود ہی وبائیں دب سکتی ہیں۔

مسلم شہری کا یہ بھی فرض ہے کہ جس وقت وہ اپنے ہمسایہ کو مصیبت میں اور مشکل میں دیکھے اور اس کے پاس مال ہو تو وہ اپنے مال سے اسے بقدرِ ضرورت قرض دے اور اس وقت جبکہ وہ مصیبت میں مبتلاء ہے اس سے یہ حساب نہ کرنے بیٹھے کہ تُو مجھے اس کے بدلہ میں کیا دے گا کیونکہ اس کے اخلاق وسیع اور اس کا حوصلہ بلند ہونا چاہئے۔ اسے تکلیف اور دکھ کے اوقات میں لوگوں کا مددگار ہونا چاہئے اور اپنے بھائیوں کی مدد اسے اپنا فرض سمجھنا چاہئے۔ اسے محنت سے اپنی روزی کمانی چاہئے نہ کہ صرف روپیہ قرض دے کر اور لوگوں کو ان کی تکلیف کے وقت اپنے قبضہ میں لا کر یا اسراف کی عادت پیدا کر کے۔

مسلم شہری کا ایک یہ بھی فرض ہے کہ وہ قومی اور ملکی فرائض کے لئے قربانی کرنے کے لئے تیار رہے اور اپنی ذمہ واری کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرے۔ کیونکہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَا لِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ [۲۲۹]۔ جو شخص اپنے مال کی حفاظت کے لئے مارا جاتا ہے وہ خدا کے حضور میں مقبول ہے اور قرآن کریم فرماتا ہے کہ تم لوگ کیوں لڑنے سے انکار کرتے ہو حالانکہ تمہارے بھائی اور بہنیں دوسرے لوگوں کے ظلم کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔ [☆۲۳۰]

مسلم شہری کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ کسی کو ہلاک ہوتا دیکھے تو اس کو بچائے اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو کہا گیا ہے کہ اس پر سخت عذاب اور خدا تعالیٰ کی ناراضگی نازل ہوگی۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص کسی کو قتل ہوتا ہوا دیکھتا ہے اور خاموش کھڑا رہتا ہے اور اس کے بچانے کے لئے کوشش نہیں کرتا وہ خدا کی لعنت کے نیچے ہے۔ [☆☆۲۳۰]۔ پس ڈوبتوں کو بچانا' آگوں کو بجھانا' زلزلوں' کانوں کے پھٹنے' مکانوں کے گرنے' ریلوں کے ٹکرانے اور بجلیوں کے گرنے کے وقت لوگوں کی مدد کرنی اور ہر ایک مصیبت میں جس میں اس کی مدد لوگوں کی جان بچا سکتی ہے ان کی جان کو بچانا ایک مسلم کا فرض ہے ورنہ وہ خدا کے حضور میں جوابدہ ہوگا اور وہ خدا کے فضل کو کبھی حاصل نہیں کرے گا۔

اسی طرح ایک مسلم شہری کا فرض ہے کہ وہ اپنے بھائی کی طرف ہنسی کے ساتھ بھی ہتھیار کا منہ نہ کرے۔ یہ حکم رسول کریم ﷺ نے لوہے کے ہتھیاروں کے متعلق دیا ہے [۲۳۱]۔ پس

بارود سے چلنے والے ہتھیاروں کے متعلق تو اور بھی سختی سے یہ حکم چسپاں ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس حکم پر عمل نہ کرنے کے سبب سے سینکڑوں آدمیوں کی محض غلطی سے جانیں جاتی رہتی ہیں۔

پھر مسلم شہری کا یہ بھی فرض ہے کہ کبھی ہمت نہ ہارے اور مایوس نہ ہو بلکہ مصائب اور تکالیف میں ایک پہاڑ کی طرح کھڑا رہے۔ حوادث کی آندھیاں چلیں اور آفات کی موجیں اٹھ اٹھ کر اس سے ٹکرائیں مگر وہ مقابلہ سے نہ گھبرائے بلکہ ان کو دبانے کی کوشش کرے۔ یہاں تک کہ یا تو اسے موت آجائے یا وہ ان مشکلات کو زیر کر کے اپنے لئے کامیابی کا راستہ کھول لے۔ وہ بزدلی سے اپنی ذمہ داریوں سے بچنے کے لئے خودکشی نہیں کرتا کیونکہ اس کا مذہب اسے اس بزدلی سے روکتا ہے اور نڈر اور بہادر بننے کی تعلیم دیتا ہے۔

یہ ہے ایک مسلم شہری۔ مگر اس وقت میری مراد مسلم شہری سے وہ مسلم نہیں جو اپنے مذہب کو بھول کر مغرب کی طرف ایک پیاسے کی طرح دیکھ رہا ہے بلکہ اس مسلم سے میری مراد وہ مسلم ہے جو آج سے تیرہ سو سال پہلے کا تھا اور جسے اب پھر مسیح موعود علیہ السلام دنیا میں لائے ہیں۔

یتامیٰ کے متعلق احکام

عام مسلم شہری کے فرائض کی چند مثالیں بیان کرنے کے بعد اب میں وہ احکام بیان کرتا ہوں جو تمدن کا ایک زبردست جزو ہیں لیکن عام طور پر لوگ ان کی طرف توجہ نہیں کرتے میری مراد ان احکام سے یتامیٰ کے حقوق ہیں۔ کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی جس کے یتامیٰ کا پورا انتظام نہ ہو۔ اسلام نے اس شاخِ تمدن کے احکام کو بھی نہایت عمدگی سے بیان کیا ہے۔

یتامیٰ کے لئے حکم ہے کہ انکا کوئی گارڈین مقرر کیا جائے جو قریبیوں کی موجودگی میں سب سے قریبی رشتہ دار ہونا چاہئے ان کے اموال کو بالکل محفوظ رکھا جائے۔ جو گارڈین مقرر ہو اگر غریب ہو تو بقدر محنت اسے کچھ معاوضہ دیا جائے اگر امیر ہو تو مفت کام کرے۔ یتیموں کو جاہل نہیں رکھنا چاہئے بلکہ جو پیشہ ان کے مناسب حال ہو ان کا آبائی پیشہ یا جس کی طرف ان کو خاص رغبت ہو ان کو سکھایا جائے۔ ان کے اخلاق کا خاص طور پر خیال رکھا جائے نہ تو اس قدر آزاد رکھا جائے کہ ان کے اخلاق بگڑ جائیں اور نہ اس قدر سختی کی جائے کہ ان کے طبعی قویٰ بالکل دب جائیں اور ترقی کرنے کا مادہ ہی بالکل جاتا رہے۔ ان سے معاملہ کرتے ہوئے محبت اور پیار کے پہلو کو خاص طور پر مدنظر رکھا جائے کیونکہ ان کے دل نرم ہوتے ہیں اور وہ اس نعمت سے جو سب سے زیادہ

قیمتی ہے یعنی والدین کی محبت اس سے محروم ہوتے ہیں۔ جب وہ بالغ ہو جائیں تو اس وقت سے حکومت ان کی عقل اور تجربہ کا خیال رکھنا شروع کرے اور اگر ان میں اپنے مال کی حفاظت کی صلاحیت دیکھے اور جس وقت دیکھے ان کے مال ان کے سپرد کر دے لیکن اگر ان کی عقل میں فتور معلوم ہو یا عقل میں اس قدر کمزوری معلوم ہو کہ وہ اپنے اموال کی حفاظت ہی نہیں کر سکتے تو ان کو ان کی جائداد نہ دی جائے بلکہ وہ برابر زیر نگرانی رہے اور اس میں سے ان کے کھانے کپڑے وغیرہ کے ضروری اخراجات ادا کئے جایا کریں۔

لین دین کے معاملات

تمدنی معاملات میں سے ایک اہم شاخ آپس کے لین دین کے تعلقات بھی ہیں کیونکہ ہمیشہ انسان پر ایسے وقت آتے رہتے ہیں کہ وہ ان اوقات میں دوسروں سے مدد لینے کا محتاج ہوتا ہے لیکن چونکہ اس کی یہ حالت عارضی ہوتی ہے وہ اس مدد کو واپس بھی کرنا چاہتا ہے اس حالت کا علاج اسلام نے قرض یا رہن بتایا ہے۔ یعنی چاہئے کہ جو شخص امداد کا محتاج ہو اس کو مالدار لوگ حسب ضرورت اور قابلیتِ ادائیگی قرض دیں خواہ کوئی چیز رکھ کر یا یونہی۔ اس کے لئے اسلام نے یہ حکم دیئے ہیں کہ قرض کے معاملہ کو تحریر میں لایا جائے اور یہ امر اختیاری نہیں بلکہ اسلام نے اس کو فرض مقرر کیا ہے کیونکہ تمدن کی خرابی میں بہت کچھ دخل قرضوں کے جھگڑوں کا بھی ہوتا ہے۔ اور فرمایا کہ اگر قرض لینے والا اَن پڑھ ہے تو وہ دوسرے سے لکھوائے اور اس تحریر پر کم سے کم دو گواہوں کی گواہی ثبت ہو اور یہ بھی ضروری ہے کہ قرض کی ادائیگی کے لئے وقت مقرر کیا جائے کیونکہ یہ دیکھا گیا ہے کہ بعض دفعہ اس وجہ سے فساد پڑ جاتا ہے کہ قرض دینے والا سمجھتا ہے کہ تھوڑے ہی دنوں میں روپے واپس مل جائیں گے اور لینے والا خیال کرتا ہے کہ میں جلدی روپیہ مہیا نہیں کر سکتا۔ پھر فرمایا کہ قرض لینے والے کو چاہئے کہ وقت پر قرض ادا کر دے لیکن اگر ان واقعات کے ذریعہ سے جو اس کے اختیار میں نہ تھے وہ قرض ادا کرنے پر قادر نہیں تو پھر قرض دینے والے کو چاہئے کہ میعاد کو بڑھا دے اور اس پر سہولت کا زمانہ آنے تک وصولی کو پیچھے ڈال دے۔ لیکن اگر قرض وصول کرنے والے کو خود بھی سخت ضرورت پیش آجائے تو چاہئے کہ مسلمانوں میں سے کوئی شخص اس جگہ کے صاحب مقدرت لوگوں سے چندہ جمع کر کے قرضہ ادا کر دے۔ مگر شرط یہ ہے کہ قرضہ لینے والے کو کوئی سچی مجبوری ہو اس کی کسی غفلت یا شرارت کا دخل نہ ہو اور اگر کوئی قرض لینے والا مر جائے پیشتر اس کے کہ قرض ادا کرے تو اس کی جائیداد میں سے قرض ادا

کیا جائے اور اگر جائیداد بھی نہ ہو تو رشتہ دار اس کا قرض ادا کریں اور اگر رشتہ دار بھی نہ ہوں تو حکومت اس کا قرض ادا کرے۔

حکومت کو خاص حالات میں قرضوں کی ادائیگی کا ذمہ وار قرار دے کر اسلام نے قرض کے طریق کو نہایت آسان کر دیا ہے۔ اس حکم کی وجہ سے مالدار لوگوں پر اپنے غریب بھائیوں کی مدد کرنا بہت آسان ہو گیا ہے۔ اس حکم سے لوگ ناجائز فائدے بھی حاصل نہیں کر سکتے کیونکہ اول تو کوئی شخص پسند نہیں کرے گا کہ وہ اپنا روپیہ کسی کو اس خیال سے دیدے کہ اگر یہ بے جائداد کے مر گیا تو مجھے روپیہ حکومت دے دیگی۔ دوسرے چونکہ حکومت یہ دیکھے گی کہ قرض ضروری تھا اور جائز تھا اور مرنے والا سچی مجبوریوں کی وجہ سے اس کو ادا نہیں کر سکا۔ قرض دینے والے کو یہ خطرہ بھی لگا رہے گا کہ شاید میرا روپیہ نہ ملے اور وہ حقیقی ضروریات پر ہی قرض دے گا۔

ایسے اموال فروخت نہ کریں جو ناقص مصالح سے بنے ہوئے ہوں اور ان کو معلوم ہو کہ یہ ناقص ہیں گو ان کی شکل اچھی ہو۔ اسی طرح یہ بھی منع ہے کہ ظاہری نقص کو چھپا کر رکھے مثلاً اگر غلہ گیلا ہو گیا ہے تو جائز نہیں کہ اوپر خشک غلہ رکھ کر گیلے غلہ کو چھپا لے۔ اور اسی طرح یہ جائز نہیں کہ مثلاً پھٹے ہوئے تھان کے ناقص حصہ کو دبا کر رکھے بلکہ چاہئے کہ نقص کو گاہک پر ظاہر کر دے۔ اور اگر کوئی بلا نقص کے اظہار کے سودا فروخت کرتا ہے تو گاہک کا حق ہوگا کہ مال واپس کر کے اپنی قیمت لے لے۔ اور پھر ایک ہدایت یہ ہے کہ سودا ہو چکنے کے بعد اور مال وصول کر لینے اور روپیہ دینے کے بعد بیع فسخ نہیں ہو سکتی۔

اسی طرح یہ حکم ہے کہ مال کی دو قیمتیں مقرر نہ کرے مثلاً یوں نہ کرے کہ ہوشیار آدمی کو زیادہ مال دے اور بچہ یا ناواقف کو کم کیونکہ گو اس کا اختیار ہے کہ جو چاہے اپنے مال کی قیمت مقرر کرے مگر اس کو یہ حق نہیں جس سے جو قیمت چاہے لے لے۔ ہاں اگر کوئی خریدار ایسا ہے کہ اس سے کوئی خاص ذاتی تعلق ہے تو اس کے ساتھ رعایت کر سکتا ہے جیسے رشتہ دار یا استاد یا کوئی ہمسایہ تاجر وغیرہ۔

اسی طرح اسلام حکم دیتا ہے کہ تاجر جب کسی چیز کو فروخت کرے تو یا تو اسے لکھ لے یا اس پر گواہ مقرر کر لے تا ایسا نہ ہو کہ ایک شخص پہلے کسی کے پاس ایک چیز فروخت کرے اور پھر خریدار پر چوری کا الزام لگا دے یا قیمت کی وصولی کا دعویٰ دوبارہ کر دے یا چوری کی چیز فروخت کر دے۔ اور جب خریدار پکڑا جائے تو تاجر اس کے پاس بیچنے سے انکار کر دے۔ پس اسلام ان

سب باتوں کو روکتا ہے۔

اسی طرح اسلام حکم دیتا ہے کہ جو چیز کوئی خریدے اس کو بغیر وزن کئے یا دیکھے دوسرے کے آگے فروخت نہ کرے کیونکہ اس میں جھگڑوں کا دروازہ کھلتا ہے۔ کیونکہ خرید میں چونکہ دو واسطے پڑجائیں گے ہر ایک بیچنے والوں میں سے یہ کہے گا کہ میں نے تو چیز اچھی دی تھی دوسرے نے خراب کردی ہوگی۔ پس اسلام کہتا ہے کہ دو تاجر متواتر بے دیکھے اور وزن کئے کوئی چیز فروخت نہ کریں۔

اسی طرح اسلام حکم دیتا ہے کہ جھوٹے مقابلہ سے قیمت نہ بڑھائی جائے مثلاً یہ نہ کیا جائے کہ تاجر ایک اپنے ساتھی کو سِکھا کر کھڑا کردے اور وہ ایک چیز کے زیادہ دام دینے پر تیار ہو جائے اور اس طرح گاہک کو یہ بتایا جائے کہ اب اس چیز کی قیمت بڑھ گئی ہے اور لوگ اسے زیادہ قیمت پر خریدنے کے لئے تیار ہیں اور نہ نیلام کے وقت جھوٹی بولی دلوا کر قیمت کو بڑھایا جائے۔

اسی طرح اسلام یہ حکم دیتا ہے کہ باہر سے آنے والے تاجروں کو شہر سے باہر جا کر نہ ملا جائے بلکہ پہلے ان کو منڈی میں آنے دیا جائے تا ان کو اصل بھاؤ معلوم ہو جائے اور نہ ان کو کوئی نقصان ہو اور نہ خرید و فروخت میں کوئی فساد ہو۔

اسی طرح اسلام یہ حکم دیتا ہے کہ غیر معیّن اشیاء کی خرید و فروخت نہ کی جائے بلکہ چیز کو دیکھ کر خریدا جائے خواہ خود خواہ اپنے کسی ایجنٹ کی معرفت۔ یہ نہ کیا جائے کہ جوئے کی طرح چیزیں خریدی جائیں۔ مثلاً اس طرح بیع نہ کریں کہ فیصلہ کرلیں کہ جس تھان کو کنکری لگ جائے وہ ایک پہلے سے مقرر کی ہوئی قیمت پر خریدار کا ہو جائے گا اور نہ اسی قسم کے ذرائع کو استعمال کرکے خرید و فروخت کریں۔ اس حکم سے اسلام نے وہ غیر طبعی طریق جو لاٹری کے نام سے موسوم ہے اس کو بالکل روک دیا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ طریق واقع میں فطرتِ صحیحہ کے مخالف نہیں؟ یہ طریق یقیناً ایک جوئے کی قسم ہے اور ایسا ہی برا ہے جیسے کہ جوئے کی کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ قسم۔

کانفرنسوں، مجلسوں اور دعوتوں کے متعلق احکام اور آداب

آپس کے برادرانہ تعلقات جو خاندانی تعلقات کہلا سکتے ہیں اور جن کی اقسام مَیں اس وقت بیان کر رہا ہوں ان میں سے ایک قسم مجالس اور دعوتوں کے آداب بھی ہیں۔ برادری کے اکثر کام کانفرنسوں، مجلسوں اور دعوتوں

کے ذریعے ہی طے ہوتے ہیں اور ان اجتماعوں کا انسانی تمدن پر ایک نہایت وسیع اور گہرا اثر پڑتا ہے۔ پس میں اس حصہ کے متعلق جو احکام اسلام نے دیئے ہیں ان کو بھی بیان کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔

دعوتوں کے متعلق تو اسلام کے احکام یہ ہیں کہ جو لوگ دعوت میں بلائے جائیں ان کو چاہئے کہ جہاں تک ہو سکے دعوت کو قبول کریں کیونکہ دعوت محبت کی زیادتی کے لئے ہوتی ہے اور بے محل انکار محبت کو قطع کرتا ہے۔ پھر حکم ہے کہ دعوت کے موقع پر کوئی شخص بِن بلائے نہ جائے اور کوئی شخص کسی کے ساتھ چلا جائے تو چاہئے کہ جس کے ساتھ وہ جائے وہ پہلے صاحب خانہ سے اجازت لے لے۔ اسی طرح یہ حکم ہے کہ کھانے کے وقت سے پہلے جا کر لوگ نہ بیٹھیں بلکہ مقررہ وقت پر جائیں' کھانے کے وقت صفائی کا خیال رکھیں ہاتھ دھو کر بیٹھیں' حرص کے ساتھ نہ کھائیں اور اپنے آگے سے کھائیں' کھانا کھاتے وقت کھانے کی مذمت نہ کریں نہ اس قسم کی تعریف کریں کہ اس سے رذالت اور خوشامد ٹپکتی ہو' جب کھانا کھا چکیں تو ہاتھ دھوئیں اور دعا کریں جس میں صاحب خانہ اور اس کے رشتہ داروں کے لئے جنہوں نے اس کھانے کے تیار کرنے میں تکلیف اٹھائی تھی اللہ تعالیٰ سے فضل اور برکت طلب کریں۔ اگر صاحب خانہ کی طرف سے ایسی کوئی درخواست یا التجا نہ ہو تو وہاں بیٹھے نہ رہیں بلکہ جلد فارغ ہو کر رخصت ہو جاویں۔

کانفرنسوں اور مجالس کے متعلق اسلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ صرف تین قسم کی انجمنیں اور کانفرنسیں مفید ہو سکتی ہیں۔

اول مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ [۲۳۲]۔ جن انجمنوں کا کام غرباء کی خبر گیری اور حاجتمندوں کی حاجت روائی ہو۔ **دوسرے** اَوْمَعْرُوْفٍ جو علوم اور فنون کی تحقیق اور ترویج اور تعلیم اور اشاعت کی غرض سے بنائی گئی ہوں اور **تیسرے** اَوْاِصْلَاحٍ بَیْنَ النَّاسِ [۲۳۳]۔ جو فسادوں اور جھگڑوں کے مٹانے کے لئے بنی ہوں خواہ اہلی فسادوں کے دور کرنے کے لئے' خواہ ملکی' خواہ قومی' خواہ بین الاقوامی فسادوں کے دور کرنے کے لئے' خواہ ملکوں یا قوموں کے سیاسی انتظامات چلانے کے لئے کہ وہ بھی اصلاح کا ہی کام کرتے ہیں

ان کانفرنسوں اور انجمنوں کے انتظامات کے متعلق اسلام یہ تعلیم دیتا ہے۔ اول جب اس قسم کی کوئی مجلس ہو تو چاہئے کہ سب لوگ اس امر کو مد نظر رکھیں کہ اس جگہ پر بہت سے لوگ جمع

ہوں گے اور ایسی جگہوں میں کثرتِ انفاس سے بُو پیدا ہو جاتی ہے اس کو ہم اور نہ بڑھائیں وہ کوئی بدبودار چیز کھا کر جس سے منہ میں سے بُو آنے لگتی ہو جیسے پیاز لہسن وغیرہ یا حقہ اور سگریٹ وغیرہ کی قسم کی چیزیں استعمال کر کے نہ جائیں تا باقی ساتھیوں کو تکلیف نہ ہو۔ دوسرے ایسے موقع پر خوب صفائی کر کے اور نہا دھو کر اور اگر ہو سکے تو خوشبو لگا کر جانا چاہئے تا کہ طبیعت میں نشاط پیدا ہو اور ہوا صاف ہو۔

تیسرے مجلس کا حلقہ بڑا بنا کر بیٹھیں تا ایک دوسرے کے تنفّس سے لوگ تکلیف نہ اٹھائیں۔

چوتھے یہ کہ جس کو کوئی متعدی مرض ہو وہ ان جگہوں میں نہ جائے جن میں لوگ جمع ہوتے ہیں کیونکہ اس طرح ان لوگوں کو اس مرض کے لگنے کا خطرہ ہوتا ہے اس حکم کی اس قدر تاکید ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک کوڑھی کو حج بیت اللہ سے روک دیا اور کہا کہ اپنے گھر میں زیادہ بیٹھا کرو اختلاط کی جگہوں میں نہ جایا کرو تا کہ لوگوں کو بیماری نہ لگے۔

پانچویں جب کوئی شخص کلام کرنے کے لئے کھڑا ہو تو لوگوں کو چاہئے کہ اس کی طرف منہ کر کے توجہ سے کلام سنیں اور اس کی بات کو قطع نہ کریں اور دورانِ تقریر میں شور نہ کریں خواہ وہ کس قدر ہی طبیعت کے برخلاف کیوں نہ ہو۔

چھٹے یہ کہ جب بولیں آہستگی اور وقار سے بولیں۔ ایسی طرز پر کلام نہ کریں کہ لوگ سمجھ ہی نہ سکیں۔

ساتویں یہ کہ جب مجلس میں کوئی اور شخص آجائے تو اس کے لئے جگہ بنا دیں۔

آٹھویں یہ کہ اگر کسی شخص کو کوئی ضرورت پیش آجائے تو وہ اجازت لے کر جائے بلا اجازتِ صدر وہاں سے باہر نہ نکلے۔

نویں یہ کہ جب کوئی شخص عارضی طور پر جائے اور پھر اس کے واپس آنے کا ارادہ ہو تو اس کی جگہ پر کوئی اور نہ بیٹھے۔

دسویں یہ کہ وہ شخص جو آس پاس بیٹھے ہوں اور یہ معلوم ہو کہ یہ کسی غرض سے پاس بیٹھے ہیں تو خواہ ان کے درمیان کوئی جگہ خالی بھی ہو وہاں نہ بیٹھے۔

گیارھویں یہ کہ جس مجلس میں تین آدمی ہوں وہ ایسی حالت میں آپس میں کلام نہ کریں کہ تیسرے آدمی کے دل میں وسوسہ پیدا ہو کہ یہ شاید میرے متعلق بات کرتے ہیں۔

بارھویں یہ کہ کلام ترتیب سے کریں یکدم باتیں شروع نہ کریں۔
تیرھویں یہ کہ جب کلام شروع کریں صدر کو مخاطب کریں۔
یہ مختصر نقشہ ان تمدنی احکام کا ہے جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ہمارے سامنے پیش کیا ہے یا آپؑ کے بتائے ہوئے اصول کے مطابق ہم نے اسلامی تعلیم سے اخذ کیا ہے پس یہ سچا اسلامی تمدنی نقشہ ہے اور ساتھ ہی خالص احمدی نقشہ ہے۔ اہلی زندگی کے متعلق اسلامی تمدنی احکام بیان کر چکنے کے بعد اب میں ان احکام کو بیان کرتا ہوں جو اسلام نے حکومت اور رعایا کے تعلقات یا امراء اور غرباء کے تعلقات کے متعلق بیان فرمائے ہیں۔

تمدن کی دوسری قسم
یعنی حکومت اور رعایا، امیر اور غریب کے متعلق احکام

جب میں یہ کہتا ہوں کہ امیر اور غریب تو میری مراد اس سے وہ فاقہ زدہ لوگ نہیں ہیں جو لوگوں کے صدقہ اور احسان پر پلتے ہیں بلکہ اس سے میری مراد وہ لوگ ہیں جو اس قدر سرمایہ نہیں رکھتے کہ بنی نوع انسان کے کسی حصہ کو اپنا ماتحت بنا کر رکھ سکیں اور میں نے امیر اور غریب کے الفاظ جان بوجھ کر چُنے ہیں اس لئے کہ جو مضمون میں آگے بیان کرنے لگا ہوں وہ انہی ناموں سے اچھی طرح بیان ہو سکتا ہے۔

اس ہیڈنگ کے ماتحت سب سے پہلے یہ سوال ہوتا ہے کہ اسلام حکومت کی کیا تعریف کرتا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اسلام کے نزدیک حکومت اس نیابتی فرد کا نام ہے جس کو لوگ اپنے مشترکہ حقوق کی نگرانی سپرد کرتے ہیں۔ اس مفہوم کے سوا اسلام میں اور کوئی مفہوم اسلامی نقطہ نگاہ کے مطابق نہیں اور سوائے نیابتی حکومت کے اسلام اور کسی حکومت کا قائل نہیں۔ قرآن کریم نے اس مفہوم کو ایک نہایت ہی عجیب لفظ کے ساتھ ادا کیا ہے اور وہ لفظ امانت ہے۔ قرآن کریم حکومت کو امانت کہتا ہے یعنی وہ اختیار لوگوں نے کسی شخص کو دیا ہو نہ وہ جو اس نے خود پیدا کیا ہو یا بطور ورثہ کے اس کو مل گیا ہو۔ یہ ایک لفظ ہی اسلامی حکومت کی تمام کیفیات کو بیان کرنے کے لئے کافی ہے۔

قرآن کریم میں حکومت کا ذکر بادشاہ سے شروع کر کے رعایا کی طرف نہیں چلایا گیا بلکہ ملک

کے لوگوں سے شروع کر کے حاکم کی طرف لے جایا گیا ہے۔ میرے نزدیک اس کا پورا لطف حاصل نہیں ہو گا جب تک میں اس آیت کو ہی پیش نہ کر دوں جس میں اسلامی حکومت اور اس کے فرائض کو نہایت ہی مختصر لیکن محیط الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ اِنَّ اللّٰہَ نِعِمَّا یَعِظُکُمْ بِہٖ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ سَمِیْعًا بَصِیْرًا [۲۳۴]۔ اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ حکومت کی امانتوں کو ان کے حق دار لوگوں کے سپرد کرو اور جب اے حاکمو! تم حاکم ہو جاؤ تو انصاف کے ساتھ حکمرانی کرو۔ اللہ تعالیٰ جس امر کی تم کو نصیحت کرتا ہے وہ بہت اچھی ہے اور اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے۔

اس آیت میں پہلے تو عامۃ الناس کو مخاطب کیا ہے کہ حاکم بنانا تمہارے اختیار میں ہے تمہارے سوا اور کوئی شخص حاکم بنانے کا مجاز نہیں گویا ورثہ کے ذریعہ سے کوئی شخص حاکم نہیں بن سکتا۔ کسی شخص کو حق نہیں کہ محض کسی کا بیٹا ہونے کے سبب سے لوگوں کی گردنوں پر حکومتوں کا جؤا رکھے۔ دوسرا امر یہ بتایا کہ یہ حکومت کے حقوق ایک قیمتی چیز ہیں جس طرح کہ امانت قیمتی ہوتی ہے پس کسی ایسے شخص کے سپرد نہ کرنا جو اس کے قابل نہ ہو بلکہ اسی شخص کے سپرد کرنا جو دیانتداری سے اس امانت کو محفوظ رکھے۔

تیسرا حکم یہ دیا ہے کہ چونکہ حکومت کوئی مستقل چیز نہیں بلکہ ان حقوق کو کسی شخص کے سپرد کر دینے کا نام ہے جن کو بوجہ بہت سے لوگوں کے اشتراک کے لوگ فرداً فرداً ادا نہیں کر سکتے اس لئے اس کو امانت خیال کرنا چاہئے کیونکہ وہ حقوق و فرائض جن کے مجموعے کا نام حکومت ہے کسی خاص شخص کی ملکیت نہیں بہ حیثیت مجموعی جماعت ان کی مالک ہے۔

چوتھا حکم حاکم کو یہ دیا گیا ہے کہ جو کچھ تم کو دیا جاتا ہے وہ چونکہ بطور امانت کے ہے اس کو اسی طرح محفوظ بِلا خراب یا تباہ کرنے کے اپنی موت کے وقت واپس دینا ہو گا یعنی حکومت کی پوری حفاظت اور اہل ملک کے حقوق کی نگرانی رکھنی ہو گی اور یہ تمہارا اختیار نہ ہو گا کہ اس حق میں کوئی نقصان کر دو۔

پانچواں امر اس آیت سے یہ نکلتا ہے کہ حکام کو چاہئے کہ دوران حکومت میں لوگوں کے حقوق کو پوری طرح ادا کریں اور کسی قسم کا فساد پیدا نہ کریں۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان اس معاملہ میں کمزوری دکھائیں گے اور دوسری قوموں کی دیکھا دیکھی پھر

بادشاہت کی طرف رجوع کریں گے مگر فرماتا ہے کہ جو نصیحت ہم نے کی ہے کہ وراثت کی بادشاہت کے قریب بھی نہ جاؤ بلکہ انتخاب کے ساتھ بہترین دماغوں کو حکومت کے لئے منتخب کیا کرو۔ وہی اچھی اور مفید ہے اور اللہ تعالیٰ سننے والا دیکھنے والا ہے یعنی دنیا کی مصیبتوں کو دیکھ کر اور ان کی دعاؤں کو سن کر ہم نے یہ طریقِ حکومت تم کو بتایا ہے پس اس کی ناقدری اور ناشکری نہ کرنا۔

مذکورہ بالا آیت سے یہ تو واضح ہو گیا کہ اسلامی حکومت انتخابی ہوتی ہے اور ساتھ ہی نیابتی بھی۔ یعنی یہ سمجھا جاتا ہے کہ بادشاہ ملک کے لوگوں کا ان کی مجموعی حیثیت میں نہ بحیثیت افراد نائب ہے مگر اب میں اسلامی حکومت کا ایک مختصر نقشہ کھینچ دیتا ہوں جس سے اس کے تمام پہلو ذہن میں مستحضر ہو سکیں۔

اسلام کا یہ حکم ہے کہ مسلمان مل کر ایک ایسے شخص کو جسے وہ اس کام کے لائق سمجھیں منتخب کریں کہ وہ حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے۔ اس شخص کا انتخاب مغربی ممالک کے پریذیڈنٹوں کی طرح چند سال کے لئے نہیں ہوتا بلکہ ساری عمر کے لئے ہوتا ہے اور اس انتخاب کے بعد پھر اللہ تعالیٰ ہی اس کو اس منصب سے برخواست کر سکتا ہے یعنی اسے وفات دے کر۔ اس شخص کے ہاتھ میں تمام وہ طاقتیں اور اختیارات ہوتے ہیں جو حکومت کو حاصل ہوتے ہیں مگر اس شخص کا فرض ہوتا ہے کہ اپنی ساری عمر کو ملک کی بہتری کے لئے صرف کر دے نہ کہ اپنی بڑائی کے حصول کے لئے۔ اس کا حق بیت المال پر سوائے اس کے اور کوئی نہیں کہ وہ اپنے ملک کی ضروریات پر صرف کرے اپنے لئے وہ آپ گذارہ مقرر نہیں کر سکتا بلکہ ضروری ہے کہ مسلمانوں کی مجلس شوریٰ اس کے لئے گذارہ مقرر کرے۔ اس کا فرض ہے کہ ایک مجلس شوریٰ کے ذریعہ سے ملک کی عام رائے کو معلوم کرتا رہے اور جب ضرورت ہو عام اعلان کر کے تمام افراد سے ان کی رائے دریافت کرے تاکہ اگر کسی وقت ملک کے نمائندوں اور ملک کی عام رائے کی مخالفت ہو جائے تو ملک کی عام رائے کا علم ہو سکے۔ اس سے امید کی جاتی ہے کہ کثرت رائے کا احترام کرے لیکن چونکہ یہ ہر قسم کی سیاسی جنبہ داری سے بالا ہو چکا ہے اور حکومت میں اس کو ذاتی کوئی فائدہ نہیں اس لئے اس کی رائے کی نسبت یقین کیا گیا ہے کہ بالکل بے تعصب ہو گی اور محض ملک و ملت کا فائدہ اسے مدنظر ہو گا اور اس لئے بھی کہ ملک کی عام رائے کا نائب ہونے کے سبب سے یہ ایمان لایا جاتا ہے اور اسلام وعدہ کرتا ہے کہ اسے خدا تعالیٰ کی طرف سے

خاص نصرت حاصل ہوگی پس اس کو اختیار دیا گیا ہے کہ اگر وہ کسی خاص ضرورت سے جو نہایت اہم ہو مشیر کاروں کی کثرت رائے کے فیصلہ کو رد کر دے تو وہ ایسا کر سکتا ہے۔ پس وہ خود مختار ہے ان معنوں میں کہ وہ شوریٰ کے فیصلہ کو مسترد کر سکتا ہے اور وہ پابند ہے ان معنوں میں کہ وہ اسلام کے مقرر کردہ نظام کے ماتحت ہے جسے بدلنے کا اسے اختیار نہیں اور وہ مجبور ہے اس پر کہ بغیر مشورہ کے کوئی فیصلہ نہ کرے اور اس پر کہ حکومت کو موروثی ہونے سے بچائے اور وہ منتخب ہے ان معنوں میں کہ خدا تعالیٰ لوگوں کے ذریعہ سے اسے منتخب کرواتا ہے اور نیابتی حیثیت رکھتا ہے ان معنوں میں کہ اس سے امید کی جاتی ہے کہ سوائے کسی غیر معمولی ضرورت کے اہم امور میں کثرت رائے کے خلاف نہ جائے اور یہ کہ اس کو اپنی ذات کے لئے بیت المال پر کوئی تصرف نہ ہو اور وہ آسمانی طاقت رکھتا ہے ان معنوں میں کہ اس کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا اور یہ کہ خدا تعالیٰ کی خاص نصرت اسے حاصل ہوتی ہے۔

ان اصول کے علاوہ باقی تفاصیل شوریٰ کے انتخاب اور گورنروں کے انتخاب کے متعلق ضروریات وقت کا لحاظ رکھتے ہوئے اسلام نے جان بوجھ کر چھوڑ دی ہیں تاکہ انسانی دماغ کو فروعات میں اپنے طور پر غور کرنے اور ترقی کرنے کا موقع ملے جو خود انسانی عقل کے ارتقاء کے لئے ضروری امر ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے اے مسلمانو! ہر ایک تفصیل رسول سے نہ پوچھا کرو[۲۳۵]۔ کیونکہ بعض باتیں خدا تعالیٰ خود چھوڑ دیتا ہے تا تمہارے اجتہاد کے لئے بھی ایک میدان باقی رہے اگر سب باتیں قرآن ہی بتادے اور تمہاری دماغی ترقی کے لئے کوئی میدان نہ چھوڑے تو یہ امر تم کو تکلیف اور دکھ میں ڈالنے کا موجب ہوگا اور تمہاری ترقیات کے لئے حارج۔

بے شک حکومتوں کے اور طریق بھی دنیا میں موجود ہیں لیکن ہر اک شخص جو اسلامی طریقِ حکومت پر غور کرے گا اس کو تسلیم کرنا ہوگا کہ اس سے بہتر اور کوئی طریق نہیں۔ اس طریق میں ایک طرف تو بہترین نیابتی طریقِ حکومت شامل ہے اور دوسرے اس کو پارٹی فیلنگز سے بھی بالکل بالا کر دیا گیا ہے کیونکہ اسلامی حاکم کسی خاص پارٹی کی مدد یا نصرت کا محتاج نہیں ہوتا۔ پس وہ صرف ملکی فائدہ کو مدنظر رکھتا ہے۔ عمر بھر کے لئے مقرر ہونے کے سبب سے بہترین دماغ ناقابل عمل اور متروک نہیں کئے جاتے بلکہ ملک کا ایک ایک شخص آخر تک ملک کی خدمت میں لگا رہتا ہے۔

گورنروں کا انتخاب گو خلیفہ کے اختیار میں ہے مگر اس میں بھی لوگوں کی عام رائے کا خیال

رکھنا ضروری سمجھا گیا ہے۔ ہم لوگوں کے نزدیک یہی طریق حکومت حقیقی ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ جوں جوں لوگ احمدیت میں داخل ہوتے چلے جائیں گے اپنی مرضی سے بلا کسی جبر کے خود اس طریق حکومت کی عمدگی کو تسلیم کرلیں گے اور بادشاہ بھی ملک کے فائدہ کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے موروثی حقوق کو خوشی سے ترک کردیں گے اور اپنے حق کو اسی حد تک محدود رکھیں گے جس حد میں کہ ملک کے دوسرے افراد کے حقوق محدود کئے گئے ہیں۔

چونکہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو خدا تعالیٰ نے صرف روحانی خلافت دیکر بھیجا تھا اس لئے آئندہ جہاں تک ہوسکے آپ کی خلافت اس وقت بھی جب کہ بادشاہتیں اس مذہب میں داخل ہوں گی سیاسیات سے بالا رہنا چاہتی ہے۔ وہ لیگ آف نیشنز کا اصلی کام سرانجام دیگی اور مختلف ممالک کے نمائندوں سے مل کر ملکی تعلقات کو درست رکھنے کی کوشش کرے گی اور خود مذہبی، اخلاقی، تمدنی اور علمی ترقی اور اصلاح کی طرف متوجہ رہے گی تاکہ پچھلے زمانہ کی طرح اس کی توجہ کو سیاست ہی اپنی طرف کھینچ نہ لے اور دین واخلاق کے اہم امور بالکل نظرانداز نہ ہو جائیں۔

جب میں نے کہا جہاں تک ہوسکے تو میرا یہ مطلب ہے کہ اگر عارضی طور پر کسی ملک کے لوگ کسی مشکل کے رفع کرنے کے لئے استمداد کریں تو ان کے ملک کا انتظام نیابتاً خلافت روحانی کراسکتی ہے مگر ایسے انتظام کو کم سے کم عرصہ تک محدود رکھا جانا ضروری ہوگا۔

حقوق وفرائض حکومت اسلامی

اسلامی حکومت کی شکل بیان کرنے کے بعد اب میں ان حقوق کو بیان کرتا ہوں جو اسلام حکومت کو دیتا ہے اور ان فرائض کو بھی جو اسلام حکومت پر عائد کرتا ہے۔

سب سے پہلا فرض جو اسلام حکومت پر مقرر کرتا ہے یہ ہے کہ حکومت رعایا کے فوائد اور منافع اور ضروریات اور اتفاق اور اخلاق اور حفاظت اور معیشت اور مسکن کی ذمہ دار ہے چنانچہ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں کُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ اَلْاِمَامُ رَاعٍ وَھُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ وَالرَّجُلُ رَاعٍ فِیْ اَھْلِہٖ وَمَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ وَالْمَرْأَۃُ رَاعِیَۃٌ فِیْ بَیْتِ زَوْجِھَا وَمَسْئُوْلَۃٌ عَنْ رَعِیَّتِھَا وَالْخَادِمُ رَاعٍ فِیْ مَالِ سَیِّدِہٖ وَمَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ فَکُلُّکُمْ رَاعٍ

وَمَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ [۲۳۶]۔ تم میں سے ہر ایک مثل گڈریے کے ہے اور ان لوگوں یا چیزوں کے متعلق پورا ذمہ دار ہے جو اس کے سپرد کئے گئے ہیں بادشاہ کے سپرد ایک جماعت کی گئی ہے اور وہ ان کا ہر طرح ذمہ دار اور جوابدہ ہے اور ہر مرد کے سپرد ایک خاندان ہے اور وہ اس خاندان کا ذمہ دار اور جوابدہ ہے اور عورت کے سپرد اولاد کی تربیت اور گھر کی حفاظت ہے اور وہ اس کی ذمہ دار اور جوابدہ ہے اور نوکر کے سپرد اس کے آقا کی جائداد اور مال ہے اور وہ اس کا ذمہ وار اور جوابدہ ہے۔

اس حکم سے ظاہر ہے کہ اسلام نے بادشاہ کو مثل گڈریے کے قرار دیا ہے جس کے سپرد مالک ایک ریوڑ کرتا ہے پس جس طرح اس کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اسے بکھرنے اور پراگندہ نہ ہونے دے، بھیڑیے کے حملہ سے بچائے، اس کی صحت کا خیال رکھے، خوراک کا خیال رکھے، مکان کا خیال رکھے، غرض ہر قسم کی ضرورتوں کا خیال رکھے اسی طرح حکومت اسلامیہ کا فرض ہے کہ وہ اپنے علاقہ کے لوگوں کو تفرقہ اور فساد اور ایک دوسرے کے خلاف ظلم اور بیرونی حملوں سے بچائے اور ان کی تمام ضروریات کا فکر رکھے خواہ وہ علوم کے متعلق ہوں، خواہ تربیت کے، خواہ خوراک کے، خواہ رہائش کے، خواہ صحت کے، خواہ اور کسی قسم کی ہوں۔

یہ تعلیم تو عام ہے اس کے علاوہ تفصیلی فرائض یہ ہیں کہ اسلامی حکومت اس امر کی ذمہ وار رکھی گئی ہے کہ وہ ہر ایک شخص کے لئے خوراک لباس اور مکان مہیا کرے۔ یہ ادنیٰ سے ادنیٰ ضروریات ہیں جن کا پورا کرنا حکومت کے ذمہ ہے کیونکہ اس کے بغیر وہ چیز ہی جس کی حفاظت اس کے سپرد کی گئی ہے زندہ نہیں رہ سکتی۔ مکان اور خوراک کے بغیر جسمانی زندگی محال ہے اور لباس کے بغیر اخلاقی اور تمدنی زندگی محال ہے۔

اصولی احکام جن کو میں پہلے بیان کرچکا ہوں ان کا جو مفہوم مسلمانوں نے سمجھا اور جس طرح ان پر تفصیلی ضروریات کے مطابق عمل کیا وہ میرے نزدیک مثالوں سے اچھی طرح سمجھ میں آجائے گا۔

میں نے بتایا ہے کہ انسانی ضروریات کا ان لوگوں کے لئے مہیا کرنا جو ان کو مہیا نہیں کرسکتے اسلامی حکومت کا فرض ہے اس کے متعلق حضرت عمر کا ایک واقعہ نہایت ہی مؤثر اور کاشفِ حقیقت ہے۔ ایک دفعہ حضرت عمر خلیفہ ثانی باہر تجسّس کر رہے تھے کہ کسی مسلمان کو کوئی تکلیف تو نہیں مدینہ دارالخلافہ سے تین میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں مرار نامی ہے وہاں دیکھا کہ ایک

طرف سے رونے کی آواز آرہی ہے ادھر گئے تو دیکھا ایک عورت کچھ پکا رہی ہے اور دو تین بچے رو رہے ہیں۔ اس سے پوچھا کہ کیا بات ہے اس نے کہا کہ دو تین وقت کا فاقہ ہے کھانے کو کچھ پاس نہیں بچے بہت بیتاب ہوئے تو خالی ہنڈیا چڑھادی تا یہ بہل جائیں اور سو جائیں۔ حضرت عمرؓ یہ بات سن کر فوراً مدینہ کی طرف واپس آئے آٹا، گھی، گوشت اور کھجوریں لیں اور ایک بوری میں ڈال کر اپنے خادم سے کہا کہ میری پیٹھ پر رکھ دے۔ اس نے کہا حضور میں جو موجود ہوں میں اٹھالیتا ہوں آپ نے جواب دیا بے شک تم اس کو تو اٹھاکر لے چلو گے مگر قیامت کے دن میرا بوجھ کون اٹھائے گا؟[۲۳۷] یعنی ان کی روزی کا خیال رکھنا میرا فرض تھا اور اس فرض میں مجھ سے کوتاہی ہوئی ہے اس لئے اس کا کفارہ یہی ہے کہ میں خود اٹھاکر یہ اسباب لے جاؤں اور ان کے گھر پہنچاؤں۔

چونکہ سارے ملک کی خبر ملنی مشکل ہوتی ہے اس لئے اسلامی حکومت میں یہ انتظام ہوتا تھا کہ سب ملک کی مردم شماری کی جاتی تھی اور پیدائش اور موت کے رجسٹر مقرر کئے گئے تھے اور ان کی غرض آجکل کی حکومتوں کی طرح حکومت کے خزانوں کا بھرنا نہیں بلکہ خزانوں کا خالی کرنا ہوتی تھی۔ ان رجسٹروں کے ذریعے سے ملک کی عام حالت معلوم ہوتی رہتی تھی اور جو لوگ محتاج ہوتے ان کی مدد کی جاتی۔

مگر اسلام جہاں غرباء کی خبر گیری کا حکم دیتا ہے وہاں جیسا کہ میں بیان کرچکا ہوں سُستی اور کاہلی کو بھی مٹاتا ہے۔ ان وظائف کی یہ غرض نہ تھی کہ لوگ کام چھوڑ بیٹھیں بلکہ صرف مجبوروں کو یہ وظائف دیئے جاتے تھے ورنہ سوال سے لوگوں کو روکا جاتا تھا۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے ایک سائل دیکھا اس کی جھولی آٹے سے بھری ہوئی تھی آپ نے اس سے آٹا لیکر اونٹوں کے آگے ڈال دیا اور فرمایا اب مانگ۔[۲۳۸] اسی طرح یہ ثابت ہے کہ سوالیوں کو کام کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔

دوسرا فرض حکومت کا عدل کا قائم کرنا ہے۔ حکومت کا کام ہے کہ قضاء کا اعلیٰ درجہ کا انتظام کرے اسلام نے اس کا خاص طور پر حکم دیا ہے اور قضاء کے لئے یہ احکام مقرر کئے ہیں کہ وہ کسی کی رعایت نہ کریں، رشوت نہ لیں، ان کے پاس کوئی سفارش نہ کی جائے اور نہ وہ سفارش کو قبول کریں، شہادت اور ثبوت پر مقدمہ کا فیصلہ کریں، شہادت اور ثبوت مدعی سے طلب کریں ورنہ مدعا علیہ سے قسم لیں، شہادت کے موقع پر دیکھ لیں کہ شہادت دینے والے لوگ ثقہ اور

معتبر ہیں جھوٹے اور اوباش نہیں ہیں۔ قاضیوں کے متعلق حکم دیا کہ وہ لائق اور کام کے قابل ہوں قاضیوں کے فیصلہ کے متعلق یہ حکم دیا کہ گو قاضی غلطی کر سکتا ہے مگر چونکہ فی مابین اختلافات کا فیصلہ انسانوں نے ہی کرنا ہے جو غلطی سے پاک نہیں ہیں اور چونکہ اگر جھگڑا کسی جگہ پر جا کر ختم نہ ہو تو فساد بڑھتا ہے اس لئے قاضیوں کے فیصلہ کو سب فریق کو قبول کرنا ہو گا خواہ اس کو غلط مانیں یا صحیح۔ اور جو شخص اس امر میں چون وچرا کرے اور قضاء کے فیصلہ کی ہتک کرے وہ ہرگز ایک مسلم شہری نہ سمجھا جائے کیونکہ وہ نظامِ سلسلہ کو درہم برہم کرتا ہے۔ کمزوروں اور ناسمجھوں کو اپنے حقوق کے سمجھنے میں مدد دینے کے لے مفتیوں کا ایک سلسلہ جاری کیا جو قانون کے واقف ہوں مگر شرط یہ رکھی کہ یہ مفتی صرف حکومت ہی مقرر کر سکتی ہے اپنے طور پر کوئی شخص مفتی نہیں بن سکتا۔

ان فیصلوں کا اجراء حکومت کے اختیار میں رکھا ہے اور حکم دیا ہے کہ ان کے اجراء میں رحم یا لحاظ سے کام نہ لیا جائے خواہ کوئی بڑا آدمی ہو خواہ چھوٹا۔ حتیٰ کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ اگر میری بیٹی چوری کرے تو میں اس کو بھی سزا دینے سے دریغ نہیں کروں گا[۲۳۹]۔ حضرت عمرؓ نے اپنے لڑکے کو ایک جرم میں خود اپنے ہاتھ سے کوڑے لگائے۔[۲۴۰]

ایک فرض حکومت کا یہ مقرر کیا گیا ہے کہ ملک کی عزت اور آزادی کی حفاظت کرے قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے مسلمانو! سرحدوں پر ہمیشہ مضبوط چوکیاں بنائے رکھو[۲۴۱]۔ جو دوسری حکومتوں کے مقابلہ میں ملک کی حفاظت کریں اور امن اور جنگ میں برابر استقلال سے اس امر کا تعہّد کرو۔

ایک فرض حکومت کا حفظانِ صحت کا خیال ہے چنانچہ راستوں اور پبلک جگہوں وغیرہ کی صفائی کے متعلق قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ رسول کریم ﷺ کو حکم دیتا ہے وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ [۲۴۲]۔ علاوہ قلبی اور جسمانی صفائی کا خیال رکھنے کے گندگی اور غلاظت کو عام طور پر دور کر یعنی اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ پبلک صفائی کا خیال رکھے۔ رسول کریم ﷺ ہمیشہ صحابہ کو مقرر فرماتے تھے کہ وہ آوارہ کتوں کو ماردیں تا ان کے جنون کی وجہ سے لوگوں کو نقصان نہ پہنچے۔[۲۴۳]

ایک فرض اسلامی حکومت کا یہ ہے کہ وہ ملک کی تعلیم کا انتظام کرے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں رسول کریم ﷺ کے فرض میں سے ایک فرض تعلیم مقرر فرمایا ہے فرماتا ہے

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ [۲۴۴]۔ احکام ضروریہ اور ان کی حکمت کا سکھانا اس رسول کا کام ہے۔ کتاب سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ صرف قرآن کریم مراد ہے کیونکہ قرآن کریم میں علم ہیئت، علم نباتات، علم تاریخ، علم الاخلاق، علم طب، علم حیوانات وغیرہ کا ذکر ہے اور ان کی طرف توجہ دلائی ہے پس کتاب کے سکھانے میں ان علوم کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ [۲۴۵] ہر مسلمان پر علم پڑھنا فرض ہے اور آپ ہمیشہ اس امر کا خیال رکھتے تھے۔ بدر میں جو پڑھے لکھے لوگ قید ہوئے آپ نے ان سے معاہدہ کیا کہ بجائے روپیہ دے کر آزاد ہونے کے وہ مسلمان بچوں کو پڑھائیں۔

ایک فرض حکومت اسلام کا یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کی مدد کرے جو پیشہ تو جانتے ہیں لیکن ان کے پاس کام کرنے کو روپیہ نہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں اسلامی بیت المال میں سے ایک حصہ ایسے لوگوں کے لئے مقرر کیا ہوا ہے۔

ایک فرض یہ ہے کہ وہ اندرونی امن کو قائم رکھے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ اسلامی حکومت کا فرض مقرر کرتا ہے کہ وہ امن کو قائم رکھے اور سخت مذمت ان لوگوں کی بیان کرتا ہے جو لوگ فساد کرتے ہیں اور فرماتا ہے کہ ایسے حاکم جن کی غفلت یا ظلم سے فساد پھیلتا ہے خدا تعالیٰ کے حضور میں سخت مجرم ہیں رسول کریم ﷺ نے اسلامی حکومت کا یہ نقشہ کھینچا ہے کہ ایک عورت اکیلی سینکڑوں میل کا سفر کرتی چلی جائے اور اس کو کسی قسم کا خطرہ نہ ہو۔[۲۴۶]

ایک فرض اس کا یہ مقرر کیا گیا ہے کہ وہ ملک کی خوراک کا انتظام رکھے ابتدائی خلفاء کے زمانہ میں اس امر کا خاص خیال رکھا جاتا تھا اور خلفاء خود خوراک کے جمع رکھنے کا تعہّد کرتے تھے اور جب غلہ کی کمی ہوتی تھی تو ہر شخص کے لئے پرچی جاری کرتے تھے جس کے ذریعہ سے وہ سرکاری سٹوروں میں سے غلہ خرید سکے تا ایسا نہ ہو کہ بعض لوگ زیادہ غلہ جمع کرلیں اور باقی محروم رہیں۔

ایک فرض یہ مقرر کیا ہے کہ راستوں کی درستی کا خیال رکھیں تا کہ سفروں اور اِدھر سے اُدھر جانے میں آسانی ہو چنانچہ ابتدائی زمانہ اسلام میں جبکہ گاڑیاں نہیں تھیں صرف پیدل چلتے تھے یہ حکم تھا کہ راستے کم سے کم بیس فٹ چوڑے بنائے جائیں مگر یہ ایک اصول بتایا گیا ہے کہ راستے چوڑے رکھوانے چاہئیں اِس زمانہ میں چونکہ گاڑیاں اور موٹریں بکثرت چلتی ہیں اس لئے آجکل اسی نسبت سے راستوں کو زیادہ چوڑا رکھوانا ضروری ہوگا۔

ایک یہ فرض مقرر کیا ہے کہ بادشاہ ملک کے اخلاق کی نگرانی رکھے اور تعلیم و تربیت کے ذریعہ سے ملک کی اخلاقی حالت کو اچھا کرتا رہے اور خراب نہ ہونے دے۔

بالآخر ایک یہ فرض اسلام نے حکومت کا رکھا ہے کہ یُزَکِّیْھِمْ لوگوں کو بلند کرے اونچا کرے یعنی ان کی ہر قسم کی ترقی کو مدنظر رکھے اس عام حکم میں تمام زمانوں کی ضرورتوں کو شامل کر لیا ہے جو علوم جدیدہ بھی معلوم ہوں ان کو ملک میں رائج کرنا اور تحقیق و تجسس کی طرف لوگوں کو مائل کرنا جو تمدنی سوالات نئے پیدا ہوں ان کو شریعت کے دائرہ کے اندر حل کرنا یہ اسلامی حکومت کا فرض ہے۔

رعایا کے فرائض

حکومت کے ان فرائض کے مقابلہ پر رعایا کے بھی اسلام نے فرائض مقرر کئے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ رعایا کے لوگ اپنی حکومت کے خیر خواہ رہیں' اس سے تعاون کریں اور اس کے احکام کی پوری طرح فرمانبرداری کریں خواہ وہ ان کے منشاء کے مخالف ہی کیوں نہ ہوں۔ مگر شریعت نے اسلامی حاکم کو سیاستاً کو ایک فوقیت دی ہے بحیثیت انسان اس کو کوئی علیحدہ رتبہ نہیں دیا۔ اس کو یہ حق ہے کہ ملک کی بہتری کے لئے بعد مشورہ کے احکام جاری کرے مگر اس کا یہ حق نہیں کہ ذاتی طور پر لوگوں پر حکومت کرے بلکہ اگر ذاتی معاملات میں خلیفہ اور کسی شخص کا جھگڑا ہو جائے مثلاً کسی مالی معاملہ میں اختلاف ہو جائے تو اسے اسی طرح عدالت سے اپنا فیصلہ کرانا ہو گا جس طرح دوسرے لوگ فیصلہ کراتے ہیں اور اس کو کوئی خاص رعائت حاصل نہ ہو گی۔ حضرت عمرؓ خلیفہ ثانی کا ایک دفعہ ایک جھگڑا ابی بن کعبؓ سے ہو گیا تھا۔ قاضی کے پاس معاملہ پیش ہوا۔ انہوں نے حضرت عمرؓ کو بلوایا اور آپ کے آنے پر اپنی جگہ ادب سے چھوڑی۔ حضرت عمرؓ فریق مخالف کے پاس جا بیٹھے اور قاضی سے فرمایا کہ یہ پہلی بے انصافی ہے جو آپ نے کی ہے اِس وقت مجھ میں اور میرے فریق مخالف میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہئے تھا[۲۴]۔ مگر یہ دعاوی انہی امور کے متعلق چل سکتے ہیں جو خلافت کے کام سے علیحدہ ہوں۔

آقا اور ملازمین کے تعلقات

اسلام سے پہلے آقا اور ملازم کی حیثیت ایک بادشاہ اور رعایا کی حیثیت ہی سمجھی جاتی تھی اور اِس وقت بھی باوجود خیال کے بدل جانے کے عملاً یہی نظارہ ہمیں نظر آتا ہے مگر اسلام اس کا علاج ہمیں بتاتا ہے۔ وہ یہ اصول قائم کرتا ہے کہ ایک آقا جس طرح روپیہ دیتا ہے اسی طرح ایک نوکر اپنا وقت اور اپنی

جان دیتا ہے اس لئے لوگوں کا حق نہیں کہ وہ ان سے جابر بادشاہوں والا سلوک کریں اور جب کہ اسلام نے بادشاہوں کے ان حقوق کو بھی منسوخ کر دیا جو عادتاً اور رسمًا ان کو حاصل تھے تو پھر آقا اور ملازم کے ان غیر منصفانہ تعلقات کو وہ کب جائز رکھ سکتا تھا جو اسلام سے پہلے دنیا میں قائم تھے۔ چنانچہ اسلام ہمیں حکم دیتا ہے کہ آقا اپنے ملازم کو گالی نہ دے اور نہ مارے بلکہ ملازم تو الگ رہا غلام کے متعلق بھی اسلام یہی حکم دیتا ہے کہ نہ اس کو گالی دی جائے اور نہ مارا جائے (اس جگہ ضمناً میں اس امر کا بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اسلامی احکامِ غلامی کے متعلق بھی لوگوں کو سخت غلط فہمی ہے۔ اسلام اس طرح غلامی کو جائز نہیں قرار دیتا جس طرح کہ دوسرے مذاہب جائز قرار دیتے ہیں۔ اسلامی احکام کی رُو سے کسی قوم میں سے غلام بنانا صرف اسی وقت جائز ہوتا ہے (۱) جبکہ وہ اس لئے کسی دوسری قوم سے لڑے کہ اس سے جبراً اس کا مذہب چُھڑا دے (۲) جبکہ وہ لوگ جن کو غلام بنایا گیا ہو عملاً اپنی ظالمانہ اور خلاف انسانیت جنگ میں شامل ہوں (۳) جبکہ وہ لوگ جن کو غلام بنایا گیا ہو اس مظلوم قوم کا جس سے وہ اس کی جان سے پیاری چیز مذہب چھڑانا چاہتے تھے خرچ جنگ ادا کرنے کے لئے تیار نہ ہوں۔ اگر یہ باتیں نہ ہوں یعنی جنگ دنیاوی ہو یا وہ شخص جس کو غلام بنایا گیا ہے جنگ میں شامل نہ ہو یا جنگ میں تو شامل ہو مگر خرچ جنگ میں سے اپنا حصہ ادا کرنے کے لئے تیار ہو تو ایسے شخص کو غلام بنانے یا غلام رکھنے کو اسلام ایک خطرناک جرم قرار دیتا ہے۔ اور ہر ایک شخص خیال کر سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص اس لئے تلوار اٹھاتا ہے کہ دوسرے سے جبراً اس کا مذہب چھڑوا دے جس کی نسبت اس دوسرے شخص کا یہ یقین ہے کہ وہ نہ صرف اس کے اس دنیا میں کام آنے والا ہے بلکہ مرنے کے بعد بھی ہمیشہ اسی مذہب نے اس کو ابدی ترقیات دلانی ہیں اور پھر جب پکڑا جائے تو اس خرچ کو ادا کرنے سے وہ خود یا اس کی قوم کے لوگ انکار کر دیں جو اس قوم کو کرنا پڑا تھا جس پر ایسا ظالمانہ حملہ کیا گیا تھا تو وہ ضرور اس امر کا مستحق ہے کہ اس کی آزادی اس سے چھین لی جائے۔ اسلام درحقیقت ایسے شخص کو جو مذہب بزور شمشیر پھیلانا چاہتا ہے اور اپنی طاقت کے گھمنڈ پر دوسرے کے عقائد میں دخل دینا چاہتا ہے انسانیت سے خارج قرار دیتا ہے اور بنی نوع انسان کے لئے اسے ایک خطرناک وجود قرار دیتا ہے اس لئے اس وقت تک کہ اس کے اندر حقیقی ندامت پیدا ہو اسے اس کی آزادی سے محروم کرتا ہے) ایک صحابی فرماتے ہیں کہ ہم سات بھائی تھے ہمارے پاس ایک لونڈی تھی ہم میں سے سب سے چھوٹے بھائی نے اس کے ایک تھپڑ مار دیا۔ رسول کریم

ﷺ نے حکم فرمایا کہ اسے آزاد کردو۔[۲۴۸]

اسی طرح ایک اور صحابی فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ ایک غلام کو مارنے لگا مجھے اپنے پیچھے سے ایک آواز آئی جسے میں پہچان نہ سکا اتنے میں میں نے دیکھا کہ رسول کریم ﷺ چلے آرہے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ اے ابو مسعود! جس قدر تجھ کو اس غلام پر مقدرت حاصل ہے اس سے کہیں زیادہ تجھ پر خدا کو مقدرت حاصل ہے وہ کہتے ہیں ڈر کے مارے میرے ہاتھ سے کوڑا جا پڑا اور میں نے کہا یا رسول اللہ! یہ غلام خدا کے لئے آزاد ہے[۲۴۹]۔ آپ نے فرمایا اگر تُو اسے آزاد نہ کرتا تو آگ تیرا منہ جھلستی

اسی طرح رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص اپنے نوکر سے وہ کام نہ لے جو وہ کر نہیں سکتا اور اگر زیادہ کام ہو تو خود ساتھ لگ کر کام کرائے۔[۲۵۰]

اسی طرح آپؐ فرماتے ہیں کہ اگر کسی کا نوکر کھانا پکا کر اس کے سامنے رکھے تو اصل حق تو یہ ہے کہ وہ اسے ساتھ بٹھا کر کھلائے اگر ایسا نہ کر سکے تو کم سے کم اس میں سے اس کو حصہ دیدے کیونکہ آگ کی تکلیف تو اسی نے اٹھائی ہے۔[۲۵۱]

مزدوری کے متعلق آپؐ فرماتے ہیں کہ مزدور کا پسینہ سوکھنے سے پہلے اس کی مزدوری اس کو ادا کر دی جائے[۲۵۲]۔ اور اس کے حق کے متعلق فرماتے ہیں کہ جو شخص مزدور کو اس کا حق ادا نہیں کرتا قیامت کے دن میں اس کی طرف سے جھگڑوں گا۔[۲۵۳] جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر کوئی مالک مزدور کی مزدوری نہ دے تو حکومت کا فرض ہے کہ اس کو دلوائے۔

اسی طرح ایک حق مزدور کا شریعت نے یہ مقرر کیا ہے کہ اگر اس کو مزدوری کافی نہیں دی جاتی تو وہ حکومت کے ذریعہ سے اپنی داد رسی کرائے اور اگر مزدور سیاسی یا تمدنی حالات کی وجہ سے مجبور ہوں کہ اس آقا کے ساتھ کام کریں تو حکومت کا فرض ہوگا کہ دونوں فریق کا حال سن کر مناسب فیصلہ کرے۔

امراء اور غرباء اور حُکّام کے تعلقات
اور اختیارات پر ایک اجمالی نظر

یہ ایک اہم سوال ہے کہ مختلف لوگوں کے حقوق کا توازن کس طرح قائم رکھا جائے؟ اور

اس وقت کے تمدن کے سب سے پیچیدہ مسائل یہی ہیں اس لئے میں ان مسائل پر ایک اجمالی نظر ڈالتا ہوں تاکہ اسلام نے ان مشکلات کا جو حل تجویز کیا ہے وہ آپ لوگوں کے ذہن میں آجائے۔

یاد رکھنا چاہئے کہ اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ تمام دنیا خواہ زمین ہو' خواہ سورج' خواہ چاند' خواہ ستارے یہ سب انسان کے فائدے اور نفع کے لئے پیدا کئے گئے ہیں پس یہ سب چیزیں اسلامی اصول کے ماتحت تمام بنی نوع انسان کے درمیان مشترک ہیں اور سب بحیثیت مجموعی ان کے مالک ہیں۔

مگر اس اصل کے ساتھ ایک اور اصل بھی ہے جسے اسلام پیش کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس لئے پیدا کیا ہے تاکہ یہ دیکھے کہ کون کیسا عمل کرتا ہے اور یہ کہ خدا تعالیٰ نے انسان کی فطرت کے اندر یہ مادہ رکھا ہے کہ وہ مقابلہ کرکے دوسروں سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے بلکہ خود اسلام اس مقابلہ کی طرف رغبت دلاتا ہے اور فرماتا ہے فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ [۲۵۴]۔ اے مسلمانو! ایک دوسرے سے نیک کاموں میں مقابلہ کرو اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔

جب مقابلہ ہوگا اور کوئی آگے نکل جائے گا اور کوئی پیچھے رہ جائے گا تو لازماً کوئی زیادہ انعام لے جائے گا اور کوئی کم فائدہ حاصل کرے گا اور کوئی بالکل محروم رہ جائے گا پس اس فرق کو اسلام تسلیم کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ یہ فرق ہمارا ہی پیدا کیا ہوا ہے اور اس پر تم کو آپس میں چڑنا نہیں چاہئے۔ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَافَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ [۲۵۵]۔ اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر جو فضیلت دی ہے اس کے متعلق اپنے دل میں یہ خیال نہ کرو کہ ہم دوسروں سے چھین لیں۔ مطلب یہ کہ خدا تعالیٰ کے کام حکمت والے ہوتے ہیں خدا تعالیٰ نے بلاوجہ ایسا نہیں کیا بلکہ کارخانہ عالم اسی سے چلتا ہے اور اسی طرح چل سکتا ہے اگر تم اس نظام میں خلل ڈالو گے یعنی وہ لوگ جو اس طرح مقابلہ میں آگے بڑھ گئے ہیں ان کو ان کے انعامات سے محروم کرو گے تو یہ سب مقابلہ اور کوشش بند ہو جائے گی اور ساتھ ہی دنیا کی ترقی بھی بند ہو جائے گی۔

مگر لوگوں کا حق قائم رکھ کر پھر فرماتا ہے کہ اے وہ لوگو! جن پر خدا تعالیٰ نے فضل کیا ہے اور تم کو ترقی دی ہے تمہارا فرض ہے کہ تم ان بھائیوں کو جو پیچھے رہ گئے ہیں آگے بڑھاؤ اور ان کو اپنے ساتھ شامل کرو کیونکہ تم کو خیال رکھنا چاہئے کہ جس مال پر تم قابض ہو اس میں درحقیقت ان غرباء کا بھی حصہ تھا پس آگے نکل جانے کی وجہ سے تم کو یہ نہیں کرنا چاہئے کہ ان غرباء کو محروم

کر دو بلکہ تم کو یہی خوشی اپنا انعام سمجھنا چاہئے کہ تمہارے کئی بھائی جو تمہاری ہی طرح اس دنیا کے حصہ دار ہیں تمہارے ذریعہ سے پرورش پا رہے ہیں اور خدا تعالیٰ نے تم کو اس درجہ پر پہنچایا ہے کہ تم بھی اس کی طرح اس کی مخلوق کی ربوبیت کرو۔ فرماتا ہے وَاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ [۲۵۶]۔ اور دو محتاجوں کو خدا تعالیٰ کے مال سے جو اس نے تم کو دیا ہے یعنی بطور امانت تمہارے پاس ہے ورنہ اس میں دوسروں کا حق شامل ہے۔

ان اصول سے آپ لوگ سمجھ گئے ہونگے اسلام کے نزدیک افراد کا مقابلہ نہایت ضروری ہے اور اس مقابلہ کو زندہ رکھنے کے لئے دیانتداری سے وہ لوگ جو کچھ کمائیں ان کے پاس رہنا ضروری ہے ہاں چونکہ اس میں علاوہ ان کی محنت کے دوسرے لوگوں کے حقوق شامل ہیں کیونکہ سب بنی نوع انسان کے فائدے کے لئے زمین اور اس کے اندر کی چیزیں پیدا کی گئی ہیں اس لئے چاہئے کہ وہ لوگ کچھ رقم بطور حق ملکیت باقی حصہ داروں کو ادا کر دیں۔

مگر جب اسلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ اس مقابلہ کا جاری رکھنا دنیا کی ترقیات کے لئے ضروری ہے تو ساتھ ہی ایک اور اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت میں تو پھر مقابلہ کے راستوں کا سب بنی نوع انسان کے لئے کھلا رکھنا بھی نہایت ضروری ہے اور اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ جو امور ایسے ہوں کہ ان کے سبب سے عام مقابلہ بند ہو کر چند محدود لوگوں میں مقابلہ آجائے اور باقی سب لوگ مقابلہ سے خارج کئے جا کر صرف تماشا دیکھنے والے بن جائیں ان کی اصلاح کی جائے۔ اسلام اس سوال کی اہمیت تسلیم کرتا ہے اور اس کا جواب اثبات میں دیتا ہے اور مندرجہ ذیل طریق تجویز کرتا ہے جس سے (۱) مقابلہ بھی جاری رہتا ہے۔ (۲) جو لوگ ترقی کریں اور خاص محنت کریں ان کو ان کی محنت اور کوشش کا پھل بھی مل جاتا ہے اور افراد کی ملکیت قائم رہتی ہے (۳) جس قدر حصہ ان آگے نکل جانے والوں کی ترقی میں باقی لوگوں کی مملوکہ اشیاء یا ان کی محنتوں کا تھا وہ بھی لوگوں کو دلایا جاتا ہے (۴) تمام بنی نوع انسان کے لئے ترقی کا دروازہ کھلا رہتا ہے کسی خاص قوم یا خاص خاندانوں میں محدود نہیں رہتا بلکہ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کے لئے بھی اعلیٰ سے اعلیٰ ترقی حاصل کرنے کا موقع موجود رہتا ہے اور کسی جماعت کو نسلاً بعد نسلٍ دوسرے لوگوں پر حکومت حاصل نہیں ہوتی (۵) تمام بنی نوع انسان کی ضروریات بھی بِلا تکلیف پوری ہوتی رہتی ہیں۔ وہ طریق یہ ہیں۔

اول۔ اسلام اس امر کا مدعی ہے کہ جس قدر اشیاء دنیا میں موجود ہیں ان میں سب بنی نوع

انسان شریک ہیں اور اس وجہ سے دنیا میں حقیقی ملکیت کوئی نہیں۔ زید کے پاس جو کچھ ہے وہ اس کی ملکیت ان معنوں میں نہیں کہ دوسروں کا اس میں بالکل حصہ ہی کوئی نہیں بلکہ اس کی ملکیت وہ اس وجہ سے کہلاتی ہے کہ اس کا حصہ دوسروں کی نسبت زیادہ ہو گیا ہے کیونکہ اس نے محنت کرکے اس کو حاصل کیا ہے ورنہ اس میں اور لوگوں کے حصے بھی شامل ہیں چنانچہ اسلام امراء کے مال میں غرباء کا حق قرار دیتا ہے فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ [۲۵۷]۔ امراء کے مال میں ان کا جو بول سکتے ہیں یعنی انسانوں کا بلکہ ان حیوانوں کا بھی جو نہیں بول سکتے بطور حق کے حصہ ہے۔

اسی طرح فرماتا ہے قریبیوں کو اور مسکینوں کو اور مسافروں کو اُن کے حق دو [۲۵۸]۔ پس وہ حکم دیتا ہے کہ روپیہ کو بند رکھنا درست نہیں کیونکہ اس طرح لوگ اپنے حق سے محروم رہ جاتے ہیں اور وہ مجبور کرتا ہے کہ لوگ روپیہ کو یا خرچ کریں یا کام پر لگائیں کیونکہ دونوں صورتوں میں لوگ اس روپیہ سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔ اگر وہ خرچ کرے گا تو بھی روپیہ چکر کھانے لگے گا اور لوگوں کو فائدہ ہو گا اور اگر کسی کام پر لگائے گا تو بھی کچھ لوگ بطور ملازمت کے فائدہ اٹھائیں گے اور کچھ وہ لوگ جن سے لین دین ہو گا فائدہ اٹھائیں گے۔ اگر کوئی شخص ایسا نہ کرے تو اس کے حق میں فرماتا ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۙالَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآاٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا [۲۵۹]۔ اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا متکبروں اور اترانے والے لوگوں کو جو روپیہ بند کرکے رکھ چھوڑتے ہیں اور لوگوں کو بھی کہتے ہیں کہ تم بھی ایسا ہی کرو اور جو کچھ خدا نے اپنے فضل میں سے دیا ہے اس کو چھپا چھوڑتے ہیں ان کو ایسا نہیں چاہئے۔ اگر یہ اس نصیحت کو قبول نہ کریں گے تو ان کو رسوا کرنے والا عذاب آئے گا۔ یعنی اگر وہ اس طرح اپنے اموال کو چھپاتے اور جمع کرتے چلے جائیں گے تو ان کی قوم ذلیل ہو جائے گی اور وہ بھی ساتھ ہی ذلیل ہوں گے۔

اب دوسری صورت جو اموال کے خرچ کرنے کی ہے اس میں یہ نقص ہو سکتا تھا کہ لوگ اپنی جانوں پر سب روپیہ خرچ کر دیں اور اسراف سے کام لیں۔ اس کا علاج اسلام نے یہ کیا ہے کہ ہر قسم کی عیاشیوں کو روک دیا ہے۔ اسلام کھانے میں اسراف کو' پہننے میں اسراف کو' مکان بنانے میں اسراف کو' غرض کہ ہر چیز میں اسراف کو منع کرتا ہے۔ اس وجہ سے ایک مسلمان جو اسلام کے احکام پر عمل کرتا ہے اپنی ذات پر اس قدر روپیہ خرچ ہی نہیں کر سکتا کہ جس سے

دوسرے لوگوں کے حقوق تلف ہو جائیں۔

لیکن چونکہ ہو سکتا تھا کہ بعض لوگ باوجود اسلام کے اس حکم کے کہ روپیہ جمع نہ کیا کریں بلکہ اس کو خرچ کریں یا کام میں لگائیں روپیہ جمع کرتے رہیں اور چونکہ خالی اس حکم سے لوگوں کے وہ حقوق جو تمام اموال میں اسلام تسلیم کرتا ہے پوری طرح ادا نہیں ہو سکتے تھے اس لئے اسلام نے حکم دیا ہے کہ جس قدر جائداد کسی انسان کے پاس سونے چاندی کے سکّے یا اموالِ تجارت کی قسم سے ہو اور اس پر ایک سال گزر چکا ہو اس پر حکومت اس سے اڑھائی فیصدی ٹیکس سالانہ لیا کرے جو ملک کے غرباء اور محتاجوں پر خرچ کیا جائے۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ نے جو الفاظ اس صدقہ کی غرض کے متعلق استعمال فرمائے ہیں ان میں آپ صاف طور پر ظاہر فرماتے ہیں کہ یہ مال اس غرض سے امراء سے لیا جاتا ہے کہ ان کے اموال میں غرباء کا حصہ شامل تھا۔ آپ فرماتے ہیں اِنَّ اللّٰہَ افْتَرَضَ عَلَیْھِمْ صَدَقَۃً فِیْ اَمْوَالِھِمْ تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِیَائِھِمْ وَتُرَدُّ عَلٰی فُقَرَائِھِمْ [۲۶۰]۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو ان کے مالداروں سے لی جائے گی اور ان کے غرباء کی طرف لوٹائی جائے گی۔ "لوٹائی جائے گی" کے الفاظ صاف طور پر ظاہر کرتے ہیں کہ اس ٹیکس کو غرباء کا حق سمجھا گیا ہے اور یہ قرار دیا گیا ہے کہ امراء کی دولت میں غرباء کے حقوق اور ان کی محنت بھی شامل ہے مگر چونکہ ان کے حقوق کا معیّن اندازہ مشکل تھا اس لئے ایک قاعدہ مقرر کر دیا کہ جس کے مطابق ان سے زکوٰۃ لے لی جایا کرے۔

یاد رکھنا چاہئے کہ یہ ٹیکس جسے زکوٰۃ کہتے ہیں آمدن پر نہیں ہے بلکہ سرمایہ اور نفع سب کو ملا کر اس پر لگایا جاتا ہے اور اس طرح اڑھائی فیصد در حقیقت بعض دفعہ نفع کا پچاس فیصدی بن جاتا ہے اس حکم کی موجودگی میں کوئی شخص مال کو بے وجہ جمع نہیں رکھ سکتا کیونکہ اس صورت میں اس کا مال تھوڑے ہی عرصہ میں ٹیکس کی ادائیگی میں ہی خرچ ہو جائے گا۔

قرآن کریم میں بھی اس امر کا اشارہ پایا جاتا ہے کہ زکوٰۃ کی غرض در حقیقت امراء کے مالوں کو پاک کرنا ہے یعنی ان کے مالوں میں جو ملک کے دوسرے لوگوں کی محنت اور ان کے حقوق کا ایک حصہ شامل ہو گیا ہے اس کو ادا کر کے خالص ان کا حق علیحدہ کر دینے کے لئے یہ ٹیکس لگایا جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے خُذْ مِنْ اَمْوَالِھِمْ صَدَقَۃً تُطَھِّرُھُمْ وَتُزَکِّیْھِمْ بِھَا [۲۶۱]۔ لوگوں کے مالوں سے صدقہ لے اور اس طرح ان کو پاک کر یعنی ان کے مال اس ذریعہ سے ہر قسم کی ملونی سے پاک ہو جائیں گے اور دوسروں کے حق ان سے الگ ہو جائیں گے پھر فرماتا ہے چاہئے

کہ یہ مال جو امراء سے وصول کئے جائیں ان سے غرباء کو ترقی کی طرف لے جایا جائے۔

زکوٰۃ کے حکم سے اسلام نے ان تمام حقوق کو ادا کر دیا ہے جو امراء کے مال میں غرباء کی طرف سے شامل تھے اور اس طرح سرمایہ دار اور مزدور میں صلح کرا دی ہے کیونکہ علاوہ مناسب مزدوری کے جو کارکن حاصل کرتے ہیں اسلام ان کے اور ان کے غریب بھائیوں کی خاطر امراء سے اڑھائی فیصد ٹیکس کُل جائداد پر وصول کرتا ہے۔

گو اس ٹیکس کی وصولی سے مالی پہلو تو حل ہو جاتا ہے مگر یہ سوال رہ جاتا ہے کہ امراء نے غرباء یا درمیانی درجہ کے لوگوں کے لئے ترقی کا کوئی راستہ کھلا چھوڑا ہی نہیں پھر وہ ترقی کس طرح کریں؟ اس سوال کا جواب یہ دیتا ہے کہ تمام بنی نوع انسان کا حق ہے کہ ان کے لئے ترقی کا راستہ کھلا رکھا جائے وہ اس امر کو ناپسند کرتا ہے کہ کوئی شخص دوسروں کا راستہ روک کر کھڑا ہو جائے ایک دوڑ جو کئی آدمیوں میں ہو رہی ہو اس میں ہر ایک شخص یکساں ہمدردی کے ساتھ ہر اک دوڑنے والے کو دیکھے گا مگر اس کے ساتھ کسی کو ہمدردی نہیں ہو سکتی جو آگے ہو کر اس طرح کھڑا ہو جاتا ہے کہ کوئی دوسرا آگے نہ بڑھ سکے۔ اگر اس کو جائز رکھا جائے تو مقابلہ وہیں بند ہو جائے گا اور چند لوگ جو پہلے آگے نکل چکے ہیں سب ترقیات اپنے ہی ہاتھ میں رکھیں گے اور کسی دوسرے کو حصہ نہ دیں گے۔ اسلام اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتا اور اس نے اس نقص کی جڑ کو کاٹ کر ترقی کا راستہ سب کے لئے کھول دیا ہے۔

اگر غور کیا جائے تو اس نقص کے باعث کہ بعض ملکوں میں چند گھرانوں میں تمام ترقیات محدود ہو گئی ہیں تین ہیں۔

(۱) جائداد کا تقسیم نہ ہونا بلکہ صرف بڑے لڑکے کے قبضہ میں رہنا اور مال کے متعلق باپ کو اختیار ہونا کہ جس قدر چاہے جس کو چاہے دے دے۔

(۲) سود کی اجازت جس کی وجہ سے ایک ہی شخص یا چند افراد بغیر محنت کے جس قدر چاہیں اپنے کام کو وسعت دے سکتے ہیں۔

(۳) منافع کی زیادتی۔

ان تین نقائص کی وجہ سے بہت سے ممالک میں لوگوں کے لئے ترقیات کے راستے بالکل محدود ہو گئے ہیں۔ جائدادیں جن لوگوں کے قبضہ میں ہیں اور اس وجہ سے غرباء کو جائدادیں پیدا کرنے کا موقع نہیں۔ سود کی وجہ سے جو لوگ پہلے ہی اپنی ساکھ بٹھا چکے ہیں وہ جس قدر چاہیں

روپیہ لے سکتے ہیں۔ چھوٹے سرمایہ دار کو ان کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں منافع کی زیادتی کی وجہ سے دولت ایک آبشار کی طرح چند لوگوں کے گھروں میں جمع ہو رہی ہے۔

اسلام نے ان نقائص کے مٹانے کے لئے تین ہی علاج کئے ہیں۔ اول ورثہ کے تقسیم کئے جانے کا حکم دیا ہے کسی شخص کا اختیار نہیں کہ اپنی جائداد کسی ایک شخص کو دے جاوے تا کہ ایک طبقہ کے پاس دولت محفوظ رہے۔ اسلام حکم دیتا ہے کہ مطابق شریعت تمام اولاد ماں باپ بیوی یا خاوند یا بھائیوں بہنوں میں ہر مرنے والے کی جائداد تقسیم ہو جانی چاہئے۔ اس تقسیم کے بدلنے کا کسی کو اختیار نہیں۔ اس حکم کی وجہ سے ایک اسلامی شریعت پر چلنے والے ملک میں ایک شخص جو بڑی ترقی کر جاتا ہے اس کی اولاد محض اس کی ترقی کے سہارے پر نہیں بیٹھ سکے گی بلکہ اس کی جائداد چونکہ چھ سات جگہ تقسیم ہو جائے گی مکان بھی اور زمینیں بھی اور مال بھی اسلئے سب کو پھر نئے سرے سے محنت کرنی پڑے گی اور چونکہ زمینیں تقسیم ہوتی چلی جائیں گی دو تین نسلوں میں وہ اتنے چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہو جائیں گی کہ ایک معمولی مزدور بھی ان میں سے ایک حصہ خریدنے پر قادر ہو سکے گا اور اپنی آئندہ ترقی کی بنیاد اس پر رکھ سکے گا غرض تقسیم جائداد کے سبب سے کوئی نسلی دیوار نہیں کھڑی ہو سکے گی۔

دوسری روک غرباء کے راستہ میں سود ہے سود کے ذریعہ سے وہ تاجر جو پہلے سے ساکھ بٹھا چکے ہیں جس قدر روپیہ کی ان کو ضرورت ہو آسانی سے بنکوں سے لے سکتے ہیں۔ اگر ان کو اس طرح روپیہ نہ مل سکتا تو وہ یا تو دوسرے لوگوں کو اپنی تجارت میں شامل کرنے پر مجبور ہوتے یا اپنی تجارت کو اس پیمانہ پر نہ بڑھا سکتے کہ بعد میں آنے والے لوگوں کے لئے روک بن سکیں اور ٹرسٹس اور ایسوسی ایشنز قائم کر کے دوسرے لوگوں کے لئے ترقی کا دروازہ بالکل روک دیں۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ مال ملک میں مناسب تناسب سے تقسیم رہتا اور خاص خاص لوگوں کے پاس حد سے زیادہ مال جمع نہ ہو سکتا۔ جو ملک کی اخلاقی ترقی کے لئے مہلک اور غرباء اور درمیانی طبقہ کے لوگوں کے لئے تباہی کا موجب ہوتا ہے۔

تیسری صورت جو نفع کی زیادتی کی تھی اس کا اسلام نے ایک تو اس ٹیکس کے ذریعہ سے انتظام کیا ہے جو غرباء کی خاطر امراء سے لیا جاتا ہے اس ٹیکس کے ذریعہ سے اتنی رقم امراء سے لے لی جاتی ہے کہ ان کے پاس اس قدر روپیہ اکٹھا ہی نہیں ہو سکتا کہ وہ اس کے زور سے ملک کا سارا روپیہ جمع کرنے کی کوشش کریں کیونکہ جس قدر روپیہ ان کے پاس ہو گا اس میں سے ہر

سال ان کو غریبوں کا ٹیکس ادا کرنا ہو گا۔

دوسرے شریعت نے یہ انتظام کیا ہے کہ غرباء میں سے ہوشیار اور ترقی کرنے والے لوگوں کو اس ٹیکس میں سے اس قدر سرمایہ دیا جائے کہ وہ اپنا کام چلا سکیں اس ذریعہ سے نئے نئے لوگوں کو ترقی کرنے کا موقع ملے گا اور کسی کو شکایت کا موقع نہیں رہے گا۔

تیسرے اسلام نے ان ترکیبوں سے منع کر دیا ہے جن کے ذریعہ سے لوگ ناجائز طور پر زیادہ نفع حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ اسلام اس امر کو گناہ قرار دیتا ہے کہ کوئی شخص تجارتی مال کو اس لئے روک رکھے کہ تا اس کی قیمت بڑھ جائے اور وہ زیادہ قیمت پر فروخت ہو۔ پس اس اصل کو مدنظر رکھتے ہوئے ٹرسٹس کی قسم کے تمام ذرائع جن سے نفع کو زیادہ کیا جاتا ہے اسلامی تعلیم کے مطابق ناجائز ہوں گے اور حکومت ان کی اجازت نہ دیگی۔

اب ایک سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اگر سود بند کیا جائے گا تو تمام تجارتیں تباہ ہو جائیں گی مگر یہ امر درست نہیں۔ ممانعتِ سود سے کبھی تجارتیں تباہ نہ ہونگی۔ اب بھی سود کی وجہ سے تجارتیں نہیں چل رہیں بلکہ اس وجہ سے سود کا تعلق تجارت سے ہے کہ مغربی ممالک نے اس طریق کو نشو و نما دیا ہے اگر وہ اپنی تجارتوں کی بنیاد شروع سے سود پر نہ رکھتے تو نہ آج یہ بے امنی کی صورت نظر آتی اور نہ تجارتوں سے سود کا کوئی تعلق ہوتا۔ آج سے چند سو سال پہلے مسلمانوں نے ساری دنیا سے تجارت کی ہے اور اپنے زمانہ کے لحاظ سے کامیاب تجارت کی ہے مگر وہ سود بالکل نہیں لیتے تھے۔ وہ بوجہ سود نہ لینے کے ادنیٰ ادنیٰ غرباء سے روپیہ شراکت کے طور پر لیتے تھے اور ملک کے اکثر حصہ کو ان تجارتوں سے فائدہ پہنچتا تھا۔

پس سود کی وجہ سے تجارتیں نہیں چل رہیں بلکہ سود پر چونکہ ان کی بنیاد رکھی گئی ہے اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سود پر چل رہی ہیں۔ بے شک شروع میں دقّتیں ہونگی لیکن جس طرح سود پر بنیاد رکھی گئی ہے اسی طرح اس عمارت کو آہستگی سے ہٹایا بھی جا سکتا ہے۔

سود اس زمانہ کی وہ جونک ہے جو انسانیت کا خون چوس رہی ہے غرباء اور درمیانی درجہ کے لوگ بلکہ امراء بھی اس ظلم کا شکار ہو رہے ہیں مگر بہت سے لوگ اس چیتے کی طرح جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی زبان پتھر پر رگڑ رگڑ کر کھا گیا تھا ایک جھوٹی لذت محسوس کر رہے ہیں جس کے سبب سے وہ اس کو چھوڑنا پسند نہیں کرتے اور اگر چھوڑنا چاہتے ہیں تو سوسائٹی کا بہاؤ ان کو الگ ہونے نہیں دیتا۔

اس کے دو خطرناک اثر ملکوں کے امن کے خلاف پڑ رہے ہیں۔ ایک اس کے ذریعہ سے دولت محدود ہاتھوں میں جمع ہو رہی ہے۔ دوسرے اس کی وجہ سے جنگیں آسان ہو گئی ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ دنیا کا کوئی انسان بھی اس جنگ عظیم کی جو پچھلے دنوں ہوئی ہے جرأت کر سکتا تھا اگر سود کا دروازہ اس کے لئے کھلا نہ ہوتا؟ جس قدر روپیہ اس جنگ پر خرچ ہوا ہے مختلف ممالک اس روپے کے خرچ کرنے کے لئے کبھی تیار نہ ہوتے اگر اس کا بوجھ براہ راست ملک کی آبادی پر پڑ جاتا۔ اس قدر عرصہ تک جنگ محض سود کی وجہ سے جاری رہی ورنہ بہت سی سلطنتیں تھیں جو اس عرصہ سے بہت پیشتر جس میں پچھلی جنگ جاری رہی جنگ کو چھوڑ بیٹھتیں کیونکہ ان کے خزانے ختم ہو جاتے اور ان کے ملک میں بغاوت کی ایک عام لہر پیدا ہو جاتی۔ یہ سود ہی تھا جس کی وجہ سے اس وقت تک لوگوں کو بوجھ محسوس نہیں ہوا لیکن اب کمریں اس کے بوجھ کے نیچے جھکی جا رہی ہیں اور غالباً کئی نسلیں اس قرضہ کے اتارنے میں مشغول چلی جائیں گی۔ اگر سود نہ لیا جاتا تو جنگ کا نتیجہ وہی ہوتا جو اب ہوا ہے یعنی وہی اقوام جیت جاتیں جو اب جیتی ہیں۔ مگر فرانس اس قدر تباہ نہ ہوتا' جرمنی اس طرح برباد نہ ہوتا' آسٹریا اس طرح ہلاک نہ ہوتا' انگلستان پر یہ بار نہ پڑتا' اول تو جنگ چھیڑنے ہی کی حکومتوں کو جرأت نہ ہوتی اور اگر جنگ چھڑ بھی جاتی تو ایک سال کے اندر جوش مدھم ہو کر کبھی کی صلح ہو چکی ہوتی اور آج دنیا شاہراہ ترقی پر چل رہی ہوتی۔ حکومتیں آجکل آلاتِ جنگ کے کم کرنے پر زور دے رہی ہیں۔ یہ بھی ایک اچھی بات ہے مگر آلات تو ارادے کے ساتھ فوراً ہی بن جاتے ہیں۔ جس چیز کے توڑنے کی ضرورت ہے وہ سود ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ سود جنگ کے پیدا کرنے کا موجب ہے اور آج ہم اپنی آنکھوں سے یہ نظارہ دیکھ رہے ہیں۔

پس جنگیں خواہ اندرونی ہوں خواہ بیرونی تبھی بند ہوں گی اور ملکوں میں امن تبھی قائم ہو گا جب سود کے رواج کو تمدن کے دائرہ سے باہر نکال دیا جائے گا۔ بے شک تب دودھ کی نہریں چلیں گی اور امیر غریب پر ظلم نہیں کر سکے گا اور بادشاہتیں بادشاہتوں پر چڑھائی کرنے سے ڈریں گی اور تبھی جنگ کی طرف مائل ہوں گی جب ان کو یقین ہو گا کہ ان کے ملک کی عزت خطرہ میں ہے اور یہ کہ لوگ اس کے بچانے کے لئے ہر اک قربانی کے لئے تیار ہیں۔ حاکم اپنا دل خوش کرنے کے لئے کبھی جنگ نہیں کر سکیں گے۔

ایک نقص اور ہے جس کی وجہ سے بعض لوگوں کے ہاتھ میں مال زیادہ جمع ہوتا ہے اور وہ

کانوں کی دریافت ہے اس کا علاج اسلام نے یہ کیا ہے کہ کانوں میں سے پانچواں حصہ گورنمنٹ کا مقرر کیا ہے اور جو مال کانوں کے مالک جمع کریں اور اس پر سال گزر جائے اس پر زکوٰۃ الگ ہے گویا اس طرح حکومت کانوں میں حصہ دار ہو جاتی ہے اور غرباء کے لئے ایک کافی رقم مل جاتی ہے جس سے ان کے حقوق ادا کئے جاسکتے ہیں۔ اگر کوئی شخص جس کی زمین میں سے کان نکلی ہو اس سے فائدہ اٹھانے کی توفیق نہ رکھے تو چونکہ گورنمنٹ کا بھی اس میں حصہ ہے گورنمنٹ مناسب معاوضہ دے کر اسے خرید سکتی ہے یا اور کسی کے پاس اس کے حصہ کو فروخت کرنے کی اجازت دے سکتی ہے اس طرح کانوں کی وجہ سے جو نظام تمدن میں نقص ہے وہ بھی دور ہو جاتا ہے۔

حکومتوں کے آپس کے تعلقات

حکومتوں اور رعایا اور امراء اور غرباء کے تعلقات کے بیان کرنے کے بعد اب میں ان تعلیمات کو بیان کرتا ہوں جو اسلام نے بین الاقوامی تعلقات کے متعلق دی ہیں۔

یاد رکھنا چاہئے کہ اسلامی تعلیمات کا مطمح نظر تو یہ ہے کہ دنیا میں ملکی حکومتوں کو اڑا کر ساری دنیا میں ایک ہی حکومت قائم کر دی جائے تا لڑائیوں اور جھگڑوں کا خاتمہ ہو جائے۔ اسلام مختلف ممالک کو اس قدر اندرونی آزادی دیتا ہے کہ اسلامی سیاسیات کے ماتحت وہ نہایت آسانی سے اپنی قومی اغراض اور خصوصیات کو پورا کر سکتے ہیں اور پھر بھی ایک کُل کا جزو بن سکتے ہیں۔ مگر اسلام اس مقصد کے حصول کے لئے کسی قسم کی جسمانی جدوجہد کرنے کی اجازت نہیں دیتا بلکہ اسے صرف لوگوں کی اپنی رائے اور ارادے پر چھوڑ دیتا ہے اور مسلمان حکومتوں کو بھی پابند نہیں کرتا۔ جب تک دنیا میں یہ روح پیدا نہ ہو کہ لوگ مقامی امور کو اپنی اپنی مرضی کے مطابق طے کر کے باقی امور میں ایک ہو جائیں اور لڑائی کی طرف میلان اور ایک دوسرے کے خلاف تیاریاں اور جوش اعلیٰ مقاصد کے لئے قربان کر دیئے جائیں اس وقت تک ہمیں موجودہ حالت پر قانع رہنا چاہئے اور میں اس کے مطابق جو قانون اسلام نے مقرر کئے ہیں ان کو بیان کرتا ہوں۔

دیکھا جاتا ہے کہ تمام لڑائیاں اور جھگڑے ایک دوسرے کے ملک پر طمع کی نظر رکھنے یا آپس میں ایک دوسرے سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسلام اس کے متعلق یہ دو حکم دیتا ہے جو اس سلسلہ جنگ وجدال کو بالکل مٹا دیتے ہیں۔ اوّل فرماتا ہے وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَامَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ وَرِزْقُ

رَبِّکَ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی [۲۶۲] اور اے مسلم! تو اپنی آنکھوں کو دنیاوی منافع کی طرف جو تمہارے سوا دوسری اقوام کو ہم نے دیئے ہیں تاکہ ان کے اعمال کی آزمائش کریں اٹھا اٹھا کر نہ دیکھ اور تیرے رب نے جو تجھے دیا ہے وہی تیرے لئے اچھا ہے اور زیادہ دیر تک رہنے والا ہے یعنی مرنے کے بعد بھی وہی کام آئے گا اور جو دوسری اقوام پر تعدّی کرکے مال لوگے تو وہ نفع نہیں دے گا اور نہ قائم رہے گا۔

دوسرا باعث اس قسم کے ناجائز فوائد اٹھانے کا آپس کی دشمنیاں ہوتی ہیں۔ کوئی قومی مغائرت یا نفرت دل میں ہوتی ہے یا کسی وقت کسی قوم سے کوئی تکلیف پہنچی ہوتی ہے پھر صلح بھی ہو جاتی ہے اور معاملہ رفع دفع بھی ہو جاتا ہے مگر ایک قوم اس کو دل میں رکھ لیتی ہے اور آہستہ آہستہ دوسری حکومت کو کمزور کرتی چلی جاتی ہے اور دباؤ یا دھوکے سے اس سے ناجائز فوائد اٹھانے شروع کر دیتی ہے تاکہ اسے نقصان پہنچائے۔ اسلام اسے ناپسند کرتا ہے اور صرف سچائی کا معاملہ کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یٰٓاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ [۲۶۳] اے مومنو! اپنے تمام کاموں کو خدا کے لئے کرو۔ اور انصاف سے دنیا میں معاملہ کرو اور کسی قوم کی دشمنی تم کو اس امر پر نہ اُکساوے کہ تم عدل کا معاملہ نہ کرو تم بہر حال انصاف کا معاملہ کرو یہ بات تقویٰ کے مطابق ہے اللہ تعالیٰ کو اپنی ڈھال بناؤ۔ اللہ تعالیٰ اس سے جو تم کرتے ہو خبردار ہے۔

ان دونوں احکام کے ماتحت کوئی حقیقی مسلمان حکومت' بین الاقوامی تعلقات کو خراب کرنے کا موجب نہیں ہو سکتی کیونکہ مسلمانوں کو حکم ہے کہ وہ دوسری قوموں کے مالوں اور حکومتوں کی طرف کبھی طمع کی نگاہ نہ ڈالیں اور نہ صرف یہ کہ مِنْ حَیْثُ الْفَرد با اخلاق ہوں بلکہ چاہئے کہ مِنْ حَیْثُ الْقَوْم بھی با اخلاق ہوں۔

باہمی معاہدات کے متعلق اسلام یہ حکم دیتا ہے کہ معاہدات کی اس قدر پابندی کرو کہ جس قوم سے تمہارا معاہدہ ہے اس سے جس جس قوم کا معاہدہ ہے وہ بھی اگر عملاً جنگ میں شامل نہ ہو تو خواہ وہ ایک بر سر جنگ قوم کا حصہ ہی ہو تو اس سے جنگ نہ کرو۔ ایک قوم جو معاہدہ کر چکی ہے اگر اس سے شرارت کا خطرہ ہے تو حکم دیتا ہے کہ باوجود اس کی شرارت کے یہ نہ کرو کہ اچانک اس پر حملہ کر دو اور موقع سے فائدہ اٹھاؤ بلکہ اس کو پہلے نوٹس دو کہ ہم معاہدہ کو ختم کرتے ہیں کیونکہ

تمہاری طرف سے معاہدہ کی خلاف ورزی ہوئی ہے۔ اس کا اعلان کر کے پھر بھی اگر وہ باز نہ آئیں تو پھر بے شک جنگ کر سکتے ہو یونہی نہیں۔

مگر امن کے قیام کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ ہر ایک ملک جنگ کے لئے تیار رہے تا شریر اور کمینہ دشمن اس کی کمزوری کو دیکھ کر اس سے ناجائز فائدہ نہ اٹھانا چاہے۔ پس فرمایا کہ خود تو دوسرے کے ملک سے ناجائز فائدہ نہ اٹھانا چاہو لیکن دوسری اقوام جب تک موجود ہیں جنگ کا خطرہ ہے پس اپنے طور پر دفاع کے لئے پوری طرح تیار رہو تا تمہاری کمزوری دوسرے کو جنگ کی تحریک نہ کر دے۔

اگر جنگ ہو جائے تو اس وقت کے لئے حکم دیتا ہے کہ عورتوں، بچوں اور اپنی عمر کو مذہبی کاموں کے لئے وقف کر دینے والوں اور بوڑھوں کو کچھ نہ کہو، صرف ان لوگوں کو مارو اور لڑائی میں مارو جو جنگ کر رہے ہوں اور اگر کوئی ہتھیار رکھ دے اور کہے کہ میں نہیں لڑتا تو پھر اس کو قتل کرنا ناجائز ہوگا۔ کسی ملک کا بے فائدہ نقصان بھی نہ کرو جب تک کوئی بھی صورت دشمن کے زیر کرنے یا اپنے بچانے کی ہے اس کے کھیتوں اور درختوں اور مکانوں کو بچاؤ اور بلا سبب اس غرض سے نقصان نہ پہنچاؤ کہ بعد میں ان کی حکومت کمزور رہے گی۔ اور اگر کوئی قوم صلح کا پیغام دے تو اس خیال سے کہ اس کے دل میں شرارت ہے وہ صرف وقفہ چاہتی ہے صلح سے انکار نہ کرو بلکہ جب تک شرارت ظاہر نہ ہو جنگ کو مٹانے اور صلح کرنے کی کوشش کرو۔

جھگڑوں کو مٹانے کے لئے ایک عجیب حکم دیا ہے جسے آج ہم لیگ آف نیشنز کی شکل میں دیکھتے ہیں لیکن ابھی تک یہ لیگ ویسی مکمل نہیں ہوئی جس حد تک کہ اسلام اس کو لے جانا چاہتا ہے اسلام یہ حکم دیتا ہے کہ وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىْ تَبْغِىْ حَتّٰى تَفِىْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ [۲۶۴]۔ یعنی اگر دو قومیں مسلمانوں میں سے آپس میں لڑ پڑیں تو ان کی آپس میں صلح کرا دو۔ یعنی دوسری قوموں کو چاہئے کہ بیچ میں پڑ کر ان کو جنگ سے روکیں اور جو وجہ جنگ کی ہے اس کو مٹائیں اور ہر ایک کو اس کا حق دلائیں لیکن اگر باوجود اس کے ایک قوم باز نہ آئے اور دوسری قوم پر حملہ کر دے اور مشترکہ انجمن کا فیصلہ نہ مانے تو اس قوم سے جو زیادتی کرتی ہے سب قومیں مل کر لڑو یہاں تک کہ خدا کے حکم کی طرف وہ لوٹ آئے یعنی ظلم کا خیال چھوڑ دے۔ پس اگر وہ اس امر کی طرف مائل ہو جائے تو ان دونوں قوموں

میں پھر صلح کرادو مگر انصاف اور عدل سے اور مروّت سے کام لو۔ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

اس آیت میں بین الاقوامی صلح کے قیام کے لئے مندرجہ ذیل لطیف گُر بتائے ہیں۔

سب سے اول جب دو قوموں میں لڑائی اور فساد کے آثار ہوں معاً دوسری قومیں بجائے ایک یا دوسری کی طرف داری کرنے کے ان دونوں کو نوٹس دیں کہ وہ قوموں کی پنچائت سے اپنے جھگڑے کا فیصلہ کرائیں۔ اگر وہ منظور کرلیں تو جھگڑا مٹ جائے گا۔ لیکن اگر ان میں سے ایک نہ مانے اور لڑائی پر تیار ہو جائے تو دوسرا قدم یہ اٹھایا جائے کہ باقی سب اقوام اس کے ساتھ مل کر لڑیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ سب اقوام کا مقابلہ ایک قوم نہیں کر سکتی ضرور ہے کہ جلد اس کو ہوش آجائے اور وہ صلح پر آمادہ ہو جائے۔ پس جب وہ صلح کے لئے تیار ہو تو تیسرا قدم یہ اٹھائیں کہ ان دونوں قوموں میں جن کے جھگڑے کی وجہ سے جنگ شروع ہوئی تھی صلح کرادیں۔ یعنی اس وقت اپنے آپ کو فریقِ مخالف بنا کر خود اس سے معاہدات کرنے نہ بیٹھیں بلکہ اپنے معاہدات تو جو پہلے تھے وہی رہنے دیں۔ صرف اسی پہلے جھگڑے کا فیصلہ کریں جس کے سبب سے جنگ ہوئی تھی اس جنگ کی وجہ سے نئے مطالبات قائم کرکے ہمیشہ کے فساد کی بنیاد نہ ڈالیں۔

چوتھے یہ امر مدنظر رکھیں کہ معاہدہ انصاف پر مبنی ہو یہ نہ ہو کہ چونکہ ایک فریق مخالفت کر چکا ہے اس لئے اس کے خلاف فیصلہ کردو بلکہ باوجود جنگ کے اپنے آپ کو ثالثوں کی ہی صف میں رکھو فریق مخالف نہ بن جاؤ۔ ان امور کو مدنظر رکھ کر اگر کوئی انجمن بنائی جائے تو دیکھو کہ کس طرح دنیا میں بین الاقوامی صلح ہو جاتی ہے سب فساد اسی امر سے پیدا ہوتا ہے کہ اول تو جب جھگڑا ہوتا ہے دوسری طاقتیں الگ بیٹھی دیکھتی رہتی ہیں اور جب دخل دیتی ہیں تو الگ الگ دخل دیتی ہیں۔ کوئی کسی کے ساتھ ہو جاتی ہے اور کوئی کسی کے ساتھ اور یہ جنگ کو بڑھاتا ہے گھٹاتا نہیں۔ اگر دوسری طاقتیں آپس میں مل کر بغیر اپنے خیالات کے اظہار کئے کے پہلے یہ فیصلہ کرلیں کہ حکومتوں کی پنچائت کے ذریعہ اس جھگڑے کو طے کیا جائے اور سب مل کر متفقہ طور پر ایک کو نہیں دونوں کو یا جس قدر حکومتیں جھگڑ رہی ہوں سب کو توجہ دلائیں کہ لڑنے کی ضرورت نہیں بین الاقوامی مجلس میں اپنے خیالات پیش کرو اور انصاف کے اس اصل کو مدنظر رکھیں کہ وہ پہلے سے کوئی خیالات نہ قائم کرلیں جس طرح جج فریقین کی باتیں سننے سے پہلے کوئی رائے قائم نہیں کرتا۔

پھر دونو فریق کی بات سن کر ایک فیصلہ کریں جو فریق تسلیم نہ کرے سب مل کر اس سے لڑیں اور جب وہ زیر ہو جائے تو اس وقت اپنے مطالبات اپنی طرف سے نہ پیش کریں بلکہ پہلے ہی جھگڑے کو سلجھا دیں۔ کیونکہ اگر ایسے موقع پر شکست خوردہ قوم کو لوٹنے کی تجویز ہوئی اور ہر ایک قوم نے مختلف ناموں سے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تو لازماً ان فائدہ اٹھانے والی قوموں میں آپس میں بھی تباغض اور تحاسد بڑھے گا اور جس قوم کو وہ زیر کریں گی اس کے ساتھ بھی نیک تعلقات پیدا نہیں ہو سکیں گے اور مجلس بَیْنَ الْاَقْوَام سے دنیا کی حکومتوں کو سچی ہمدردی بھی پیدا نہ ہو سکے گی۔ پس چاہئے کہ اس جنگ کے بعد صرف اسی جھگڑے کا تصفیہ ہو جس پر جنگ شروع ہوئی تھی نہ کہ کسی اور امر کا۔

اب رہا یہ سوال کہ جو اخراجات جنگ پر ہوں گے وہ کس طرح برداشت کئے جاویں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اخراجات جنگ سب قوموں کو خود برداشت کرنے چاہئیں اور یہ بوجھ ہرگز زیادہ نہیں ہوگا۔ اول تو اس وجہ سے کہ مذکورہ بالا انتظام کی صورت میں جنگیں کم ہو جائیں گی اور کسی قوم کو جنگ کرنے کی جرأت نہ ہوگی۔ دوسرے چونکہ اس انتظام میں خود غرضی اور بوالہوسی کا دخل نہ ہوگا سب اقوام اس کی طرف مائل ہو جائیں گی اور مصارف جنگ اس قدر تقسیم ہو جائیں گے کہ ان کا بوجھ محسوس نہ ہوگا۔

تیسرے چونکہ اس انتظام کا فائدہ ہر اک قوم کو پہنچے گا کیونکہ کوئی قوم نہیں جو جنگ میں مبتلاء ہونے کے خطرہ سے محفوظ ہو اس لئے انجام کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ خرچ موجودہ اخراجات سے جو تیاری جنگ کی نیت سے حکومتوں کو کرنے پڑتے ہیں کم ہوں گے اور اگر بفرض محال کچھ زائد خرچ کرنا بھی پڑے تو جس طرح افراد کا فرض ہے کہ امن عامہ کے قیام کی خاطر قربانی کریں اقوام کا بھی فرض ہے کہ قربانی کر کے امن کو قائم رکھیں۔ وہ اخلاق کی حکومت سے بالا نہیں ہیں بلکہ اس کے ماتحت ہیں۔

میرے نزدیک سب فساد اسی اختلاف کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے جو قرآن کریم کی پیش کردہ تجویز سے کیا جاتا ہے (۱) یعنی آپس کے انفرادی سمجھوتوں کی وجہ سے جو پہلے سے کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ حالانکہ ان کی بجائے سب اقوام کا ایک معاہدہ ہونا چاہئے۔

(۲) جھگڑے کو بڑھنے دینے کے سبب سے۔

(۳) حکومتوں کے جنبہ داری کو اختیار کر کے ایک فریق کی حمایت میں دخل دینے کے سبب

ہے۔

(۴) شکست کے بعد اس قوم کے حصے بخرے کرنے اور ذاتی فوائد اٹھانے کی خواہش کے پیدا ہو جانے کے سبب سے

(۵) امن عامہ کے لئے قربانی کرنے کے لئے تیار نہ ہونے کے سبب سے۔

ان پانچوں نقائص کو دور کر دیا جائے تو قرآن کریم کی بتائی ہوئی لیگ آف نیشنز بنتی ہے اور اصل میں ایسی ہی لیگ کوئی فائدہ بھی دے سکتی ہے نہ وہ لیگ جو اپنی ہستی کے قیام کے لئے لوگوں کی مہربانی کی نگاہوں کی جستجو میں بیٹھی رہے۔

اصل بات یہ ہے کہ کبھی بین الاقوامی جھگڑے دور نہ ہوں گے جب تک اقوام بھی اپنے معاملات کی بنیاد اخلاق پر نہ رکھیں گی جس طرح کہ افراد کو کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے کاموں کی بنیاد اخلاق پر رکھیں اسی طرح حکومتوں کو بھی اخلاق کی نگہداشت کی طرف توجہ دلانی چاہئے۔ فساد بعض اسباب سے پیدا ہوتے ہیں۔ پہلے ان کی اصلاح کرنی چاہئے پھر خود جھگڑے کم ہو جائیں گے اور اگر باوجود اس اصلاح کے کسی وقت کوئی جھگڑا پیدا ہو جائے تو اس کے دور کرنے کے لئے اسلامی اصول پر ایک انجمنِ اصلاح بنانی چاہئے جو ان جھگڑوں کا فیصلہ کرے۔

وہ وجوہ جن سے جھگڑے پیدا ہوتے ہیں چند اخلاقی نقص ہیں۔

(۱) یہ کہ حکومتوں اور رعایا کے تعلقات درست نہیں۔ اگر اسلامی نقطہ نظر کو مدنظر رکھا جائے کہ ہر ایک ملک کی رعایا کا فرض ہے کہ یا تو اس حکومت سے تعاون کرے جس کے ماتحت وہ رہتی ہے یا اس ملک کو چھوڑ کر چلی جائے تا دوسروں کا بھی امن برباد نہ ہو تو کبھی کسی قوم کو دوسری قوم پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہو کیونکہ کوئی قوم اس امر کو پسند نہیں کرے گی کہ ایک بنجر ملک پر قبضہ کرے۔

اور (۲) یہ نقص ہے کہ مختلف حکومتوں کو یہ یقین ہے کہ ان کی قومیں صرف اس خیال سے کہ وہ ان کی حکومتیں ہیں ان کا ساتھ دینے کو تیار ہیں اس لئے وہ بے خوف ہو کر دوسری قوموں پر حملہ کر دیتی ہیں اگر مندرجہ ذیل اصل جسے اسلام نے پیش کیا ہے قبول کیا جائے کہ تو اپنے بھائی کی مدد کر۔ اگر وہ مظلوم ہے تو دوسروں کے ظلم سے اسے بچا اور اگر وہ ظالم ہے تو اس کو اپنے نفس کے ظلم سے بچا۔ تو جنگوں میں بہت کچھ کمی آجائے۔ اس وقت قومی تعصب اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اپنی قوم کا سوال پیدا ہوتا ہے تو سب لوگ بلا غور کرنے کے ایک آواز پر جمع ہو جاتے ہیں اور

یہ نہیں سوچتے کہ اگر ہماری حکومت کی غلطی ہے تو ہم اس کو سمجھا دیں۔ غرض ایک طرف غداری اور ایک طرف قومی تعصب جنگوں کا بہت بڑا موجب ہیں۔ اور ان کا دور ہونا نہایت ضروری ہے۔

دنیا جب تک اس گُر کو نہیں سمجھے گی کہ حُبّ الوطنی اور حُبّ الانسانیت کے دونوں جذبات ایک جگہ جمع ہو سکتے ہیں اس وقت تک امن نہیں ہو سکتا۔ اسلام نے کیا چھوٹے سے فقرے میں اس مضمون کو ادا کر دیا ہے اُنْصُرْ اَخَاکَ ظَالِمًا اَوْمَظْلُوْمًا [۲۶۵]۔ یعنی تو اپنے بھائی کی خواہ وہ ظالم ہو خواہ مظلوم مدد کر۔ مظلوم کی اس طرح کہ اسے دوسروں کے ظلم سے بچا اور ظالم کی اس طرح کہ تُو اس کو ظلم کرنے سے بچا۔

کیا لطیف پیرایہ میں حب الوطنی اور حب الانسانیت کے جذبات کو جمع کر دیا ہے۔ جب کوئی شخص اپنے ہم قوموں کو دوسری قوموں پر ظلم کرنے اور ان کے حقوق غصب کرنے سے روکتا ہے تو وہ حب الوطنی کے خلاف کام نہیں کرتا کیونکہ اس سے زیادہ حب الوطنی اور کیا ہو گی کہ اپنے ملک کے نام کو ظلم کے دھبّہ سے بچائے اور پھر ساتھ ہی وہ حب الانسانیت کے فرض کو بھی ادا کر رہا ہوتا ہے کیونکہ وہ اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ خود زندہ رہو اور دوسروں کو زندہ رہنے دو۔

(۳) تیسرا اخلاقی نقص یہ ہے کہ قومی برتری کا خیال بہت بڑھ گیا ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْھُمْ کوئی قوم دوسری قوم کو حقیر نہ سمجھے۔ شاید وہ کل کو اس سے اچھی ہو جائے اور فرماتا ہے تِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُھَا بَیْنَ النَّاسِ [۲۶۶]۔ یہ دن ترقی و تنزل کے بدلتے رہتے ہیں ایک قوم جو ترقی کی طرف جا رہی ہو دوسری قوموں کو حقیر سمجھ کر فساد کا بیج نہ ڈالے کہ کل شاید اس کی باری آئے جسے آج حقیر سمجھا جا رہا ہے۔ جب تک کہ لوگ اسلام کی تعلیم کے مطابق یہ نہیں سمجھیں گے کہ ہم سب ایک ہی جنس سے ہیں اور یہ کہ ترقی تنزل سب قوموں سے لگا ہوا ہے کوئی قوم شروع سے ایک ہی حالت پر نہیں چلی آئی اور نہ آئندہ چلے گی کبھی فساد دُور نہ ہو گا۔ لوگوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ قوموں کو زیروزبر کرنے والے آتش فشاں مادے دنیا سے ختم نہیں ہو گئے۔ نیچر جس طرح پہلے کام کرتی چلی آئی ہے اب بھی کر رہی ہے پس جو قوم دوسری قوم سے حقارت کا معاملہ کرتی ہے وہ ظلم کا ایک نہ ختم ہونے والا چکر چلاتی ہے۔

مذہبی تعلقات ایک اہم سوال تمدن میں مذہبی تعلقات کا ہے اس کے متعلق میں اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ اسلام سب مذاہب سے زیادہ مذہبی رواداری کا قائل ہے

(۱) مثلاً اسلام حکم دیتا ہے کہ کسی مذہب کے بزرگوں کو گالیاں نہ دو۔

(۲) اسلام اس امر کی تعلیم دیتا ہے کہ سب اقوام میں نبی گزرے ہیں پس سب مذاہب ابتداءً اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی آئے ہیں اسی وجہ سے کسی مذہب کو بکُلّی خراب نہیں کہا جاسکتا۔

(۳) اسلام کہتا ہے کہ مذہب کے لئے جنگ جائز نہیں کیونکہ راستی اور جھوٹ میں امتیاز ہوچکا ہے۔ اب وہی زندہ ہوگا جو سچائی سے زندہ ہوتا ہے اور وہی مرے گا جسے سچائی مارتی ہے یہ ایک غلط خیال ہے کہ اسلام دین کو تلوار سے پھیلانے کی اجازت دیتا ہے۔ اسلام تو صاف طور پر کہتا ہے کہ ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور اس وقت تک لڑو جب تک وہ تم سے لڑتے ہیں۔ کیا جو مذہب اس امر کی تعلیم دیتا ہے وہ تلوار کا مؤیّد کہلا سکتا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے تلوار سے اسلام کو مٹانا چاہا خدا نے ان کو تلوار سے ہی مٹادیا اور دفاع کے طور پر تلوار چلانا ہرگز ناپسندیدہ نہیں ہوسکتا۔ اگر اسلام تلوار سے پھیلا تھا تو وہ تلوار چلانے والے کہاں سے آئے تھے؟ اور جس مذہب نے ایسے تلوار چلانے والے پیدا کرلئے تھے کہ جنہوں نے اپنا سب کچھ قربان کرکے باوجود سارے ملک کی مخالفت کے اس کو دنیا میں قائم کردیا اس مذہب کے لئے یہ کیا مشکل تھا کہ وہ دلائل کے زور سے دوسرے لوگوں سے بھی اپنی صداقت منوالیتا۔ یہ الزام اس مذہب پر جس نے سب سے پہلے رواداری کی تعلیم دی ہے ایک سخت ظلم ہے اور خدا تعالیٰ نے اسی وجہ سے مسیح موعود علیہ السلام کو بغیر تلوار کے دنیا میں بھیجا ہے کہ تا آپ کے ذریعہ سے اسلام کو دنیا میں پھیلا کر یہ ثابت کرے کہ اسلام اپنی صداقت کے ذریعہ سے پھیل سکتا ہے اور زیادہ دن نہیں گزریں گے کہ دنیا دیکھ لے گی کہ وہ سچ مچ پھیل گیا۔

تمدن کے متعلق اس تعلیم کے بیان کرنے کے بعد جو اس زمانہ کے موعود کی معرفت ہمیں ملی ہے میں اس حصہ تعلیم کے بیان کرنے کی طرف توجہ کرتا ہوں جو حالات مَابَعْدَ الْمَوْتِ کے متعلق اسلام نے دی ہے۔

سوال چہارم

حالاتِ مَابَعْدَ الْمَوْت

جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے خدا تعالیٰ کی ہستی کے بعد اگر کوئی سوال دنیا کی توجہ کو اپنی طرف کھینچتا رہا ہے تو وہ "حالاتِ مَابَعْدَ الْمَوْت" ہیں اور واقع میں جو مذہب کہ مَابَعْدَ الْمَوْت کے حالات پر کوئی روشنی نہیں ڈالتا وہ ایک جسم بے جان ہے۔ اسلام نے اس مسئلہ پر خاص طور پر زور دیا ہے بلکہ اس قدر زور دیا ہے کہ دوسری اقوام نے اس کے اس اصرار کو بھی اس کے خلاف بطور حربہ کے استعمال کیا ہے۔ مگر یہ مسئلہ جس قدر اہم ہے اسی قدر باریک اور قابل غور بھی ہے۔

ہم کبھی ایسے مسائل کی تہہ کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ الہام کی روشنی ہمیں ان کی طرف ہدایت نہ دے کیونکہ جو اِس دنیا میں ہے وہ اُس دنیا کے حالات معلوم نہیں کر سکتا مگر اس ہستی کے ذریعہ سے جس کے لئے سب جگہیں یکساں ہیں یہ دنیا اور وہ دنیا ان کے علاوہ اور جس قدر دنیائیں ہیں سب اس کے لئے آئینہ ہیں کوئی چیز نہیں جو اس سے مخفی ہو۔ پس وہی اس جگہ کا حال بتلا سکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جس قدر لوگوں نے اپنی عقل سے مابعد الموت حالات کو بیان کرنا چاہا ہے انہوں نے سخت ٹھوکر کھائی ہے اور دوسروں کو بھی ٹھوکر دی ہے۔ کوئی تو بَعْثْ بَعْدَ الْمَوْت کے بالکل منکر ہو گئے ہیں، کوئی اسے بالکل اس دنیا کی طرح ایک دوسری دنیا خیال کرتے ہیں، کوئی اس کو مان کر ارواح کو انعام اور جزاء کے لئے واپس دنیا میں لاتے ہیں کوئی اور مختلف خیالات اس کے متعلق پیش کرتے ہیں لیکن حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اس کے متعلق جو تعلیم دی ہے وہ ایسی عجیب اور ایسی جدید اور ایسی اعلیٰ ہے کہ یکدم عقل اس سے تسلی پاتی ہے اور فطرت اس کی سچائی کو قبول کرتی ہے اور قانون قدرت اس کی تصدیق کرتا ہے اور جن کو مشاہدہ نصیب ہو وہ اس کی حقیقت کو بعینہٖ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں اور یقین کا مرتبہ حاصل کرتے ہیں۔ درحقیقت جس طرح مذہب کے دوسرے حصوں میں آپ کی تعلیمات نے جنکی بنیاد یقیناً قرآن کریم پر ہے ایک حیرت انگیز انکشاف پیدا کیا ہے اسی طرح اس حصہ میں بھی ایک پوشیدہ حقیقت کو آپ نے ظاہر کیا ہے اور ایک سربستہ راز کو کھول کر دنیا پر ایک عظیم الشان راز کھولا ہے۔ مگر چونکہ اگلا عالم لوگوں کی نظر سے بالکل مخفی ہے مختصر تشریح اس کی حقیقت بیان کرنے کے لئے کافی نہیں اور لمبی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں اس لئے میں اس جگہ ایک مختصر خاکہ کھینچنے پر کفایت

کروں گا- کیونکہ نامکمل تشریح سے یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ صرف اس علم کے متعلق آپ کی تعلیم کا ایک سروپا انسان کے ذہن میں آجائے پھر جس کے دل میں پیاس ہو گی وہ مزید تحقیق کر سکتا ہے-

یاد رکھنا چاہئے کہ مابعد الموت حالت کے متعلق بحث و تدقیق کے ساتھ ہی انسان کے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ کیا روح کوئی چیز ہے؟ اگر ہے تو کیا؟ اس کے متعلق اسلام کا جواب یہ ہے کہ روح فی الواقع ایک چیز ہے جس کے ذریعہ سے انسان ان لطیف علوم کو حاصل کرتا ہے جن کو حواس ظاہری سے انسان حاصل نہیں کر سکتا- وہ خدا اور انسان کے تعلق کا مقام ہے اور اس کے جلال کا تخت گاہ- اسے جسم سے ایسا عجیب تعلق ہے کہ اس کی مثال اور کسی چیز میں نہیں پائی جاتی وہ دماغ کی قوت متفکّرہ اور دل کی قوت منفعلہ کے ذریعہ سے انسانی جسم کی ظاہری قوتوں پر اپنا اثر ڈالتی ہے- اسی وجہ سے وہ اس قدر ظاہری حرکات سے متأثر نہیں ہوتی جس قدر کہ افکار اور جذبات سے- کیونکہ اس کا علاقہ زیادہ تر انہی دو جگہوں سے ہے- سائنس اب تک اس تعلق کو معلوم کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی جو روح اور قلب میں ہے مگر صاحب تجربہ لوگ جانتے ہیں کہ روح کا قلب سے ایک باریک تعلق ہے جہاں سے دماغ کی طرف وہ تعلق بعض مخفی ذرائع سے اس طرح منتقل ہو جاتا ہے جس طرح کہ تیل بتی کے ذریعہ سے اوپر چڑھ جاتا ہے اور دماغ کے اعصاب آگے اسے قبول کر کے اس قابل بناتے ہیں کہ اس میں سے ایسی روشنی پیدا ہو جسے لوگ دیکھ سکیں اور ایک حقیقت کا اقرار کریں- یہ روح جیسا کہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ کہیں باہر سے نہیں آتی بلکہ رحم مادر میں جسم انسانی کی پرورش کے ساتھ ساتھ یہ بھی پیدا ہوتی جاتی ہے اور در حقیقت جسم میں سے نکلا ہوا ایک خلاصہ ہے اس کی مثال شراب کی سی ہے جس طرح جَو یا انگور اور ایسی ہی چیزوں میں سے جب ان کو خاص ترکیب سے سڑایا جائے شراب نکل آتی ہے اسی طرح جسم رحم مادری میں کچھ ایسی کیفیات سے گذرتا ہے کہ اس میں سے ایک لطیف جوہر نکل آتا ہے جسے روح کہتے ہیں- جب یہ جوہر جسم سے اپنا تعلق کامل کر لیتا ہے تو اس وقت انسانی قلب حرکت کرنے لگتا ہے اور انسان زندہ ہو جاتا ہے جسم سے نکلنے کے بعد اس جوہر کا وجود ایسا ہی مستقل ہوتا ہے جیسے شراب کا-

غرض اسلام کے نزدیک روح مخلوق ہے اور جس وقت بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے اس وقت وہ پیدا ہوتی ہے اور اسلام ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ انسانی روح پیدا ہونے کے بعد ضائع نہیں

جاتی اس کے بعد اس کے سامنے ایک غیر منقطع زمانہ ہے۔ جس حالت کو موت کہتے ہیں وہ روح کے جسم سے الگ ہونے کا ہی نام ہے جس کا لازمی نتیجہ دل کی دھڑکن کا بند ہونا اور جسم انسانی کا بے کار ہو جاتا ہے۔ اسلامی اصول کے مطابق روح اپنی طاقتوں کے اظہار کے لئے ہمیشہ جسم کی محتاج ہے اور جب کبھی جسم اس کی طاقتوں کے اظہار کے ناقابل ہو جاتا ہے وہ اسے چھوڑ دیتی ہے۔ جس وقت جسم روح کو چھوڑتا ہے اس کا نام موت ہے جسکے معنے بے حرکت ہو جانے کے ہیں۔ پس جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص مرگیا تو اس کے معنے صرف یہ ہوتے ہیں کہ اس کی روح اس کے جسم سے جدا ہو گئی ورنہ روح فنا نہیں ہوتی بلکہ زندہ رہتی ہے۔ اور اگر کوئی شخص خدا تعالیٰ کو قبول کرتا ہے اور اس کی طاقتوں پر یقین رکھتا ہے تو وہ یہ یقین ہی کب کر سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ تمام کارخانۂ عالم اسی لئے بنایا ہے کہ انسان اس میں پیدا ہو کر کچھ دنوں کھاپی کر یا اس دنیا کے اسرار قدرت دریافت کرکے فنا ہو جائے؟ یہ خیال کہ کوئی عاقل ہستی یہ تمام کارخانہ عالم یہ سورج، چاند، ستارے، زمین اور ان کے درمیان کی چیزیں اور قدرت کے باریک درباریک اسرار بنا کر اس پر ایک ایسے انسان کو پیدا کرے گی جو صرف ساٹھ، ستّر یا سَو سال زندگی بسر کرکے فنا ہو جائے گا ایک ایسا خیال ہے جسے عقل دھکے دیتی ہے۔ انسان کے لئے اس قدر کائنات کا پیدا کرنا اور اس پر عقل کے ذریعہ سے اسے حکم بخشنا چاہتا ہے کہ اس کے لئے اس محدود زندگی کے علاوہ کچھ اور مقصد بھی مقرر کیا گیا ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ وہ مقصد یہ ہے کہ انسان کو دائمی زندگی دی جائے اور دائمی ترقیات کا راستہ اس کے لئے کھولا جائے۔ سورۃ مومنون میں اللہ تعالیٰ زمین و آسمان کی پیدائش اور قدرت کے کارخانہ اور انسان کی طاقتوں کا ذکر فرما کر دریافت کرتا ہے کہ باوجود اس کے تم خیال کرتے ہو کہ صرف اسی دنیا کی زندگی ہے اور موت کے بعد کوئی اور حیات نہیں؟ پھر آخر میں سوال کرتا ہے اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ۔ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ۔ [۲۶۷] کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تم کو یونہی بطور کھیل کے پیدا کیا ہے؟ اور ایک دائمی زندگی کا سلسلہ اور دائمی ترقیات کا سلسلہ جو بعد الموت جاری ہو گا تمہارے لئے مقرر نہیں کیا؟ ایسا نہیں کیونکہ خدا تعالیٰ بلند شان والا ہے اور سچا بادشاہ ہے وہ بلاغرض اور بلا حکمت کام کوئی نہیں کرتا پھر وہ ایک ہی خدا ہے اور نہایت پاکیزہ اور دلوں میں عزت پیدا کر دینے والی صفات کا مالک ہے پس یہ خیال بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے اس دنیا کو پیدا نہیں کیا یا اس نے تو پیدا کیا ہے

مگر اس کی کوئی اہم غرض نہیں رکھی۔

اس حقیقت کے اظہار کے بعد کہ اسلام کے نزدیک مرنے کے بعد بھی انسانی زندگی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اسلام اس زندگی کی جو حقیقت ہمیں بتاتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگلا جہان کوئی نئی دنیا نہیں ہے بلکہ اسی دنیا کا تسلسل ہے۔ یہ نہیں کہ انسان مر کر کسی وقت تک مُردہ پڑا رہے گا اور پھر اس کو زندہ کر کے اس کی نیکی اور بدی کے مطابق اس کو کسی اچھی یا بری جگہ میں رکھا جائے گا بلکہ درحقیقت انسانی روح اپنی پیدائش کے ساتھ ہی ایسی طاقتوں کو لے کر آتی ہے کہ اس کے بعد اس کے لئے فنا حرام ہو جاتی ہے اور خدا تعالیٰ کی صفت قیوم اس کو اپنے سایہ کے نیچے لے آتی ہے اس وجہ سے وہ ہلاکت سے محفوظ ہو جاتی ہے۔

پس موت ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف انتقال کا نام ہے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ اور اس انتقال کی ضرورت قرآن کریم یہ بتاتا ہے کہ اگر موت نہ ہوتی تو انسانی روح کامل ترقیات بھی حاصل نہیں کر سکتی تھی کیونکہ انسان کی پیدائش ایسے طریق پر کی گئی ہے کہ جب کسی امر کا کامل انکشاف اس پر ہو جائے تو پھر وہ غلط راستہ پر نہیں چلتا اور کامل انکشاف کے بعد کسی ثواب کا ملنا بھی عقل کے خلاف ہے۔ ہم کسی کو اس لئے انعام نہیں دیتے کہ وہ سورج کو جب وہ نِصْفُ النَّهار پر ہوتا ہے مانتا ہے یا رات اور دن کا قائل ہے لیکن ہم مثلاً ایسے طالب علم کو جو امتحان میں بیٹھ کر باریک سوالوں کو حل کرتا ہے انعام دیتے ہیں۔ یا ایسے لوگوں کو جو باریک اسرارِ قدرت کو دریافت کرتے ہیں معزز اور مکرم سمجھتے ہیں اور ان کے درجہ کو بلند کرتے ہیں۔ پس انعام صرف خاص محنت اور پوشیدہ باتوں کے نکالنے پر ملتا ہے اور ایسے کاموں کے کرنے پر ملتا ہے جن میں انسان کو ہمت اور قوت سے کام لینا پڑے لیکن اگر انسانی ترقیات کا دروازہ اسی دنیا میں شروع ہو جاتا تو بعد میں آنے والی نسلیں ان لوگوں کو دیکھ کر جو اچھے کام کر کے بہت اعلیٰ ترقیات کو حاصل کر رہے ہوتے اور ان لوگوں کو دیکھ کر جو انبیاء کی مخالفت کی وجہ سے سخت آفات میں مبتلاء ہوتے خدا تعالیٰ کی ہستی پر اور انبیاء کی سچائی پر ایسا یقین کر لیتیں کہ آئندہ ان کے لئے ابتلاء اور امتحان کا کوئی موقع ہی نہ رہتا اور وہ مستحق بھی نہ رہتیں۔ پس یہ ضروری تھا کہ ایمان کو اور اس کے ثمرات کو ایک حد تک ظاہر کیا جائے اور ایک حد تک مخفی رکھا جائے تاکہ وہ لوگ جو خدا تعالیٰ کے لئے محنت کرنے والے ہیں اور وہ لوگ جو دنیا کی لذت میں انہماک کرنے والے ہیں ایک دوسرے سے ممتاز ہو جائیں اور اپنی اپنی قابلیت اور قربانی کے مطابق انعام یا سزا پائیں۔

غرض موت کی حکمت ان حالات کو انسان کی نظروں سے مخفی رکھنا ہے جو اس کے اعمال کے نتیجہ میں اس کو پیش آتے ہیں تا کہ وہ فکر اور غور اور عقل اور خشیت اللہ سے کام لے کر حقیقت تک پہنچے اور اس کی روح میں وہ آزاد قابلیت پیدا ہو جو صرف ایسی ہی کوشش کے نتیجہ میں پیدا ہوا کرتی ہے۔ دوسری غرض موت کی یہ ہے کہ انسانی روح ان قابلیتوں کو پیدا کر سکے جن کے بغیر اعلیٰ ترقیات حاصل نہیں ہو سکتیں- انسانی جسم ایسا کثیف ہے کہ دنیا کی لطیف چیزوں کا بھی مشاہدہ نہیں کر سکتا کجا یہ کہ ان باریک طاقتوں کو دیکھ سکے جو اس دنیا کے مادے کی نسبت زیادہ لطیف مادوں سے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ایک قسم کے روحانی اجزاء سے بنا ہوا ہے۔ پس روح کو جسم سے جدا کر کے موقع دیا جاتا ہے کہ وہ ان لطیف امور پر واقف ہو جو اس کی بے انتہاء ترقیات کے لئے ضروری ہیں پس جب روح جسم سے جدا ہوتی ہے تو اسی وقت وہ ایک اور سڑک پر قدم مارنے لگتی ہے اور یہ نہیں کہ اس کو کسی خاص وقت تک کسی خاص کوٹھڑی میں بند کر کے رکھ چھوڑا جاتا ہے تا کہ وہ اپنے امتحان کے نتیجہ کا انتظار کرے-

درحقیقت یہ خیال عقلی ڈھکوسلوں کا نتیجہ ہے- بعض لوگوں نے انسانی زندگی کو ایک امتحان سے تشبیہہ دیکر اس کی پوری صورت بَعْدَ الْمَوْت کے حالات میں بھی پیدا کر دی اور جس طرح امتحان کے بعد پرچوں کے دیکھنے تک ایک وقفہ ہوتا ہے انسان کی موت کے بعد ایک وقفہ تجویز کیا ہے اور پھر ایک دن مقرر کیا ہے جس دن کہ ان پرچوں کا نتیجہ سنا دیا جائے گا اور کوئی فیل ہو جائے گا اور کوئی پاس۔ لیکن گو یہ بات تو درست ہے کہ انسانی زندگی کو امتحان کے ایام سے بھی ایک مشابہت ہے مگر یہ درست نہیں کہ امتحان کی سب صورتیں اس پر منطبق ہوتی ہیں اس کی مشابہت اس قدر انسانی طریقہ امتحان سے نہیں جس قدر کہ قانون قدرت کے ترقی بخش طریق عمل سے ہے-

چنانچہ اسلام بعد الموت زندگی کو انسان کی ابتدائی زندگی سے تشبیہہ دیتا ہے یعنی جس طرح انسان نے نطفہ بلکہ نباتی اور حیوانی زندگی سے رحم مادر میں ترقی کی اور پھر پیدا ہونے کے بعد ایک کمزوری کے زمانہ میں سے گزرا جس میں اس نے اس دنیا کے علوم اور عادات کو سیکھا اسی طرح وہ مرنے کے بعد مختلف حالات میں سے گزرے گا- چنانچہ قرآن کریم جو لفظ رِحم کے متعلق استعمال فرماتا ہے وہی اس مقام اور اس حالت کے متعلق استعمال فرماتا ہے جس مقام اور جس حالت میں انسان بعد الموت رکھا جاتا ہے۔ پس مرنے کے بعد انسانی روح کی پہلی حالت اس

نطفہ کی طرح ہوتی ہے جو رحمِ مادر میں قرار پاتا ہے اور ان اعمال کے مطابق جو دنیا میں انسان نے کئے ہوتے ہیں اس کے اندر ایک تغیر پیدا ہونا شروع ہوتا ہے اور جس طرح رحم مادر میں بچہ نشوونما پاتے پاتے ایک ایسی حالت کو پہنچ جاتا ہے کہ اس میں سے ایک اور روح پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح انسانی روح مختلف حالات میں سے گزرتے گزرتے ایک ایسا تغیر پیدا کرتی ہے کہ اس کے اندر ایک اور روح جو اس دنیا کی زندگی کی روح سے بہت اعلیٰ وارفع اور زیادہ قوتیں اور تیز احساس رکھتی ہے پیدا ہو جاتی ہے اور پہلی روح اس کے لئے بمنزلہ جسم کے ہو جاتی ہے جس کے ذریعہ سے انسان ان امور کو جن کو انسان روحانی آنکھوں سے دیکھ سکتا تھا جسمانی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے کیونکہ وہاں جسم اپنی لطافت میں اس دنیا کی روح کی سی کیفیت رکھتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ایک نئے تغیر کے ماتحت وہ اسی روح سے تیار ہوتا ہے۔

اس تغیر کے بعد ایک اور تغیر روح میں پیدا ہوتا ہے جسے اس دنیا کی چیزوں سے بچہ کی پیدائش کے واقعہ سے تشبیہہ دے سکتے ہیں۔ یہ وہ تغیر ہے جسے "حشرِ اجساد" کے نام سے موسوم کرتے ہیں جس کے یہ معنی ہیں کہ زمانۂ قبر میں انسان کی نئی زندگی کے مناسب حال جسم اور روح تیار ہو گئے ہیں جس طرح کہ رحم مادر میں جب بچہ کامل ہو جاتا ہے اور روح پیدا ہو جاتی ہے تو پھر وہ باہر آجاتا ہے اسی طرح گویا وہاں وہ اس حالت قبر سے باہر آجائے گا۔

اس حشر اجساد کے بعد ایک دوسرا زمانہ اسلام یومِ حشر کا بتاتا ہے جسے بچپن کی عمر سے تشبیہہ دینی چاہئے جس میں وہ اپنے علم اور اپنی عقل کو اپنی نئی زندگی کے لئے ترقی دیتا اور بڑھاتا ہے۔ اس زمانہ میں روحوں کی قوتیں اس زمانہ سے جو زمانہ قبر کہلاتا ہے زیادہ نشوونما یافتہ ہوتی ہیں۔ مگر پھر بھی کامل نہیں ہوتیں۔ مگر اس دن کے اثرات اور تغیرات کے بعد وہ کامل ہو جاتی ہیں اور ان کی حالت اس بالغ بچہ کی طرح ہو جاتی ہے جو اب دنیا کی کیفیات کو پورے طور پر محسوس کرنے کے لئے تیار ہوتا ہے۔ اس حالتِ کمال کو آخری فیصلہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں جس کے بعد انسان اس آخری حالت کی طرف منتقل کر دیا جاتا ہے۔ جسے جنت یا دوزخ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

ان تینوں زمانوں میں انسان اپنی روحانی حالت کے مطابق سکھ یا دکھ پاتا رہتا ہے یعنی پہلی پیدائش کے زمانہ میں بھی جنت یا دوزخ کے دکھ یا سکھ اپنے احساسات کے مطابق پہنچتے رہتے ہیں اس زمانہ میں بھی جو یوم حشر کہلاتا ہے اور بچپن کی عمر سے مشابہ ہے وہ دُکھ یا سُکھ جس سے اس

نے اس دنیا میں مناسبت پیدا کرلی تھی پاتا رہتا ہے گو قبر کی حالت سے زیادہ۔ اور پھر آخر میں جب اس کی نئی پیدائش بالکل مکمل ہو جاتی ہے تو اس کی آخری حالت اس دنیا کے جوان انسان کے مشابہ ہوتی ہے جس نے اپنے احساسات اور ادراکات کو کامل کرلیا اور اسے اس آخری اور دکھ یا سکھ کے کامل احساسات والی حالت کی طرف منتقل کردیا جاتا ہے جسے جنت یا دوزخ کہتے ہیں۔

پس زندگی کا زمانہ کبھی ختم نہیں جزاء وسزا میں کوئی وقفہ نہیں۔ صرف نئی حالتوں کے ساتھ مطابقت حاصل کرنے کے لئے روح کو دو ایسے زمانوں میں سے گزرنا پڑتا ہے جو آخری اور مکمل حالت سے ادنیٰ درجہ کے ہیں لیکن اس تک پہنچنے کے لئے ضروری ہیں۔ انسانی روح برابر ترقیات کی طرف قدم مارتی چلی جاتی ہے اور ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہوتی چلی جاتی ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِهِمْ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَاكُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ- فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِیْنَ [268] - اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَیِّبِیْنَ یَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَیْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○ [269]۔ وہ لوگ جن کی فرشتے روح قبض کرتے ہیں درآنحالیکہ وہ لوگ اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے وہ لوگ فرشتوں کو صلح کا پیغام دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو کوئی برا کام نہیں کر رہے تھے۔ وہ کہیں گے کہ ہاں ہاں تم بُرے کام کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو جانتا ہے۔ جاؤ دوزخ کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ اور اس میں رہو۔ پس تکبر کرنے والوں کا کیا ہی بُرا ٹھکانا ہے۔ اور جن لوگوں کی فرشتے اس حالت میں روح قبض کریں گے کہ وہ پاک ہوں گے اور فرشتے ان کو کہیں گے تم پر سلامتی ہو۔ جاؤ اپنے اعمال کے سبب سے جنت میں داخل ہو جاؤ۔

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں اِنَّمَا الْقَبْرُ رَوْضَةٌ مِّنْ رِیَاضِ الْجَنَّةِ اَوْحُفْرَةٌ مِنْ حُفَرِ النَّارِ [270]۔ ایک قبر جنت کا باغیچہ ہوتی ہے اور ایک قبر دوزخ کا گڑھا ہوتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ انسانی روح برابر زندگی کی حالت میں رہتی ہے اور اس سڑک پر مرنے کے ساتھ ہی چل پڑتی ہے جو اس نے اپنے اعمال سے اپنے لئے تیار کی تھی۔

مذکورہ بالا حدیث میں جو قبر کا لفظ آیا ہے اس سے یہ دھوکا نہیں کھانا چاہئے کہ اس سے وہ مٹی کی قبر مراد ہے جس میں جسم رکھا جاتا ہے نہیں بلکہ اس سے مراد وہ مقام ہے جس میں ارواح رہتی ہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ [271]۔ ہر انسان کو خدا تعالیٰ مار کر

قبر میں ڈالتا ہے۔ اب یہ بات ظاہر ہے کہ ہر اک شخص قبر میں داخل نہیں کیا جاتا بلکہ بہت سے لوگ جلائے جاتے ہیں بعض کو جانور کھا جاتے ہیں بعض سمندر میں غرق ہو جاتے ہیں۔ پس اس قبر سے مراد وہ مقام ہے جہاں ارواح رہتی ہیں نہ یہ قبر جس میں بے جان جسم پڑا ہوتا ہے تا افتراق و تحلیل کے ابدی قانون کو اپنے اوپر پورا کرے۔

ثواب و عذاب اخروی جسمانی ہیں یا روحانی؟

اس امر کے بتانے کے بعد کہ اسلام انسانی روح کی مابعد الموت حالت کیا بتاتا ہے۔ اب میں اس سوال کے متعلق اسلام کی تعلیم بتانا چاہتا ہوں کہ اگلے جہاں کی نعمتیں یا سزائیں جسمانی ہیں یا روحانی؟

سو یاد رکھنا چاہئے کہ اسلام کے نزدیک اگلے جہان کی کیفیات جسمانی بھی ہیں اور روحانی بھی۔ جسمانی تو وہ ان معنوں میں ہیں کہ روح انسانی معا ترقی کرکے اپنے لئے ایک جسم تیار کرلے گی۔ پس وہاں کی لذات اور تکالیف اسی طرح مرئی صورت میں متمثّل ہونگی جس طرح کہ اِس دنیا میں ہم چیزوں کو دیکھتے ہیں اور روحانی ان معنوں میں کہ وہ اس مادہ کی نہیں ہوں گی جس مادہ کی اس دنیا کی چیزیں ہیں اور یہ ہو بھی کب سکتا ہے کیونکہ اس دنیا سے روح کو دوسرے جہان میں منتقل تو اسی وجہ سے کیا گیا ہے کہ وہ ان لطیف طاقتوں کو حاصل کرے جن کے ذریعہ سے وہ ان لطائف کو معلوم کرسکے جن کو یہ جسم معلوم نہیں کرسکتا۔ اب اگر وہاں اسی قسم کے میوے اور اسی قسم کے دودھ اور اسی قسم کے شہد ہوتے ہیں اور اسی قسم کی آگ اور اسی قسم کا دُھواں ہوتا ہے جیسے کہ اس دنیا میں ہے تو روح کو جسم سے جدا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ پھر تو چاہئے تھا کہ جسم ہی کے ساتھ اس کو اٹھا لیا جاتا اور جبکہ وہاں کا جسم بھی موجودہ روحانی حالت کے مشابہ ہے تو اس کی غذائیں دودھ اور شہد اور اس کی سزا آگ اور گرم پانی کس طرح بن سکتے ہیں۔ کیا اس وقت انسانی روح یہاں کی آگ اور یہاں کے پانی اور یہاں کے میووں کو استعمال کرسکتی ہے کہ وہاں وہ ان کو استعمال کرسکے گی۔

غرض یہ درست نہیں کہ مرنے کے بعد انسان اسی دنیا کی قسم کی چیزوں سے عذاب یا ثواب دیا جائے گا لیکن یہ ضرور ہے کہ وہاں لطیف روحانی اجسام کے ساتھ بعض چیزیں متمثّل ہوکر انسان کے سامنے پیش ہونگی۔ بدوں کے سامنے سزا کی چیزیں اور نیکوں کے سامنے نیکی کی چیزیں۔ کیونکہ زندگی کی حقیقت کامل طور پر محسوس نہیں ہوسکتی جب تک لطیف چیز اپنی لطافت کے

مطابق ایک جسم نہ رکھے۔ ہر اک روح ایک جسم کی محتاج ہے۔ ادنیٰ روح کثیف جسم کی اور اعلیٰ روح لطیف جسم کی۔ پس چونکہ ارواح وہاں بھی ایک جسم رکھیں گی یہ بات ضروری ہے کہ ان کے سامنے چیزیں اسی طرح محسوساتِ خارجیہ کے ذریعہ سے پیش ہوں جس طرح کہ اس دنیا میں پیش ہوتی ہیں مگر چونکہ وہ جسم روحانی ہونگے اور اس قسم کے نہیں ہونگے اس لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ۔ متمثّلات بھی اس دنیا کی چیزوں کے مقابلہ میں روحانی ہوں۔

لیکن جس طرح اس دنیا میں علاوہ جسمانی کیفیتوں کے ایک روحانی کیفیات بھی ہوتی ہیں اسی طرح اُس دنیا کی اُس اعلیٰ اور نئی پیدا شدہ بروح کے لئے اِس دنیا کی روحانی حالتوں سے اعلیٰ روحانی حالتیں ہوں گی۔ ثواب کی بھی اور عذاب کی بھی۔ پس اگلے جہان کی نعمتیں بھی اور عذاب بھی جسمانی اور روحانی ہونگے۔ اُسی طرح جس طرح اِس دنیا میں دکھ اور سکھ کی حالت جسمانی اور روحانی دونوں طرح کی ہوتی ہے لیکن اُس دنیا کی حالتیں اِس دنیا کی حالتوں سے اعلیٰ ہوں گی۔ وہاں کی جسمانی حالت یہاں کی روحانی حالت کے مشابہ ہوگی اور روحانی حالت بہت ہی ارفع اور اعلیٰ ہوگی۔

قرآن کریم بے شک مابعد الموت حالات کے متعلق سزا کے لئے آگ اور سردی اور طوقوں وغیرہ کا ذکر کرتا ہے اور انعام کے طور پر سایوں اور پانیوں اور دودھ اور شہد کا ذکر کرتا ہے مگر ساتھ ہی وہ یہ بھی فرماتا ہے فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ [۲۷۲] یعنی کوئی نفس نہیں جان سکتا کہ اس کے لئے بسبب اس کے اعمال کے کس قسم کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان مہیا کیا گیا ہے؟ اسی طرح حدیث میں ہے کہ جنت کی نعمتیں ایسی ہیں کہ لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ [۲۷۳] نہ آنکھوں نے دیکھیں نہ کانوں نے سنیں اور نہ انسان کا ذہن ان کا اندازہ کر سکتا ہے۔ اب اگر وہاں اسی دنیا کی نعمتیں ہوں گی تو گو وہ کیسی ہی اعلیٰ ہوں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انسان ان کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ پس یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ وہ نعمتیں بالکل ہی اور قسم کی ہیں اور اسی طرح وہاں کے عذاب بھی۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ ایک جگہ فرماتا ہے کہ جنتیوں کے سامنے جب جنت کے میوے رکھے جائیں گے تو وہ کہیں گے هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ [۲۷۴] یہ تو وہ نعمت ہے جو ہمیں پہلے دی گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ اس قول کے متعلق فرماتا ہے وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا [۲۷۵] وہ ملتی جلتی

چیزیں دیئے جائیں گے۔ یعنی وہ چیزیں دنیا کی سی چیزیں نہیں ہوں گی مگر اپنی ظاہری شکلوں میں ان سے مشابہ ہوں گی۔

اصل بات یہ ہے کہ روح گو جسم کی طرح جسمانی چیزوں کو استعمال نہیں کرتی لیکن جسم کے سُرور سے حصہ ضرور لیتی ہے اور اسی طرح جسم کی تکالیف سے حصہ لیتی ہے۔ پس چونکہ دنیاوی چیزوں سے وہ مانوس ہے اس کی خوشی اور اس کے رنج کو مکمل کرنے کے لئے وہاں کی چیزیں دنیاوی چیزوں کی شکل میں متمثّل ہوں گی۔

قرآن کریم نے مَابَعْدَ الْمَوْت کی روحانی حالتوں کے سمجھنے کے لئے ایک لطیف مثال دی ہے اِس سے انسان اچھی طرح اُس جہان کی کیفیت کو اس حد تک کہ اس دنیا کی قوتوں کے ساتھ سمجھ میں آسکتی ہے سمجھ سکتا ہے۔ فرماتا ہے اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰۤى اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ [۲۷۶]۔ اللہ تعالیٰ روح قبض کرتا ہے لوگوں کی موت کے وقت اور جو نہیں مرتا اس کی نیند میں۔ پس روک رکھتا ہے اس روح کو جس پر موت کا فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے اور واپس کر دیتا ہے دوسری کو ایک مدت مقررہ تک کے لئے۔ اس میں بہت سے نشانات ہیں اس قوم کے لئے جو فکر کرتی ہے۔ یعنی خواب کی حالت میں بھی روح کا تعلق جسم سے عارضی طور پر الگ ہوتا ہے اور اس پر انسان مابعد الموت حالت کا قیاس کر سکتا ہے چونکہ یہ علیحدگی عارضی ہوتی ہے اس لئے دماغ کے ساتھ اس کا تعلق قائم رہتا ہے اور اس وجہ سے انسان ان کیفیتوں کو یاد رکھ سکتا ہے جو روح کو جسم سے علیحدگی کے وقت پیش آتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ فکر کرنے والے ہیں ان کے لئے اس میں بہت بڑے فوائد ہیں۔ یعنی وہ اس کے ذریعہ سے روح کی کیفیت اور ان کے اعمال اور مابعد الموت کے حالات کو سمجھ سکتے ہیں۔

اب خواب کی حالت پر غور کر کے دیکھو۔ اس میں گو جسم آرام سے سویا ہوا ہوتا ہے مگر انسان اپنے آپ کو دوسری شکلوں میں دیکھتا ہے اور مختلف جگہوں کی سیر کر لیتا ہے اور جن چیزوں کو دیکھتا ہے وہ جسم رکھتی ہیں مگر ان کا جسم ویسا نہیں ہوتا جس قسم کا کہ ان مادی چیزوں کا۔ ہاں کبھی کبھی وہ جسم ایسا کامل ہو جاتا ہے کہ اس کے آثار جسم پر بھی نمودار ہو جاتے ہیں اور جو صاحب تجربہ ہیں وہ اسے جانتے ہیں۔ میں نے خود اس کا کئی بار مشاہدہ کیا ہے چنانچہ ایک دفعہ میں روزے میں تھا اور مجھے پیاس کی سخت تکلیف تھی جب وہ تکلیف حد سے بڑھ گئی تو میں نے دعا کی اور میں

نے دیکھا کہ معاً ایک غنودگی کی حالت مجھ پر طاری ہوئی اور ایک پیاس بجھانے والی چیز میرے منہ میں ڈالی گئی۔ یہ کیفیت ایک سیکنڈ کی تھی اس کے بعد وہ حالت بدل گئی اور میں نے دیکھا کہ وہ پیاس کی حالت بالکل جاتی رہی اور یوں معلوم ہوا کہ جس طرح خوب پانی پی لیا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ایسے بہت سے تجربات لکھے ہیں حتیٰ کہ آپ نے عین بیداری میں روحانی جسم کے ساتھ حضرت مسیح ناصری کو دیکھا ہے اور دیر تک ان سے مسیحیت کی خرابیوں اور ان کی اصلاح کے متعلق گفتگوئیں کی ہیں اور ایک دفعہ تو آپ نے ان کے ساتھ مل کر کھانا بھی کھایا ہے۔ اب یہ باتیں ان لوگوں کے لئے جو ان علوم سے واقف نہیں ایک وہم اور دماغ کی خرابی سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتیں مگر جو لوگ صاحب تجربہ ہیں اور روحانی علوم کے ماہر ہیں وہ ان کیفیتوں کو خوب اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ میری مراد روحانی علوم سے اس جگہ دماغی کیفیات نہیں ہیں جو مسمریزم وغیرہ کے ذریعہ سے ظاہر ہوتی ہیں۔ وہ بالکل الگ چیز ہیں اور ان کا روحانی حالتوں سے کچھ تعلق نہیں ہے روحانی حالتوں کی کیفیات ہی اور ہیں۔

غرض یہ کہ خواب کا عالم اور کشف کا عالم عالمِ اُخروی کے لئے بطور مثال کے ہے اور اس پر انسان اس عالم کا قیاس کر سکتا ہے جس طرح خواب میں سب چیزیں روحانی ہوتی ہیں مگر پھر ایک جسم بھی رکھتی ہیں اسی طرح اگلے جہاں میں ہوگا کہ وہاں کی چیزیں جسم تو رکھیں گی لیکن وہ جسم روحانی ہوگا اور ان کے علاوہ ان سے اعلیٰ کیفیات خالص روحانی ہوں گی۔

قرآن کریم اس واقعہ کی حقیقت یہ بیان کرتا ہے کہ اسی دنیا کے اعمال متمثّل ہو کر وہاں انسان کے سامنے آئیں گے وہاں کا پانی نہیں ہوگا مگر اس دنیا کا عمل بر شریعت۔ اور دودھ نہیں ہوگا مگر علمِ الٰہی جو اس دنیا میں حاصل کیا گیا تھا اور میوے نہیں ہونگے مگر وہی لذت اور سرور جو خدا تعالیٰ کی اطاعت میں روح اس دنیا میں محسوس کرتی تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ وَنُخْرِجُ لَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ كِتٰبًا یَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا۔ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْیَوْمَ عَلَیْكَ حَسِیْبًا۔ [۲۷۷] ہر ایک انسان کے ساتھ اس کے عمل لگے چلے جاتے ہیں وہ کبھی اس سے جدا نہیں ہوتے گو ان کے اثرات مخفی ہوتے ہیں لیکن قیامت کے دن ہم ان اعمال کو اس طرح کر دیں گے گویا وہ ایک کتاب ہے جسے وہ کھول کر پڑھ رہا ہے یعنی اس وقت وہ اپنے اثرات کو ظاہر کر دیں گے اور ایک ایک عمل جو انسان نے اس دنیا میں کیا تھا وہ اپنا نتیجہ وہاں ظاہر کرے گا اور اس دنیا کی زندگی کو اپنے مطابق ڈھالے گا۔ پھر فرماتا

ہے ہم انسان سے کہیں گے اب اپنی یہ کتاب پڑھتا رہ یعنی ان اعمال کے مطابق ترقی یا تنزل حاصل کر اور ان کا نتیجہ بُھگت۔ ہمیں تیرا حساب لینے کی ضرورت نہیں۔ تیرا نفس خود تجھ سے حساب لیتا رہے گا۔ یعنی جو اثرات تیرے اعمال نے پیدا کئے ہیں وہ تیرے لئے سزا کے طور پر بھی اور انعام کے طور پر کافی ہیں ہمیں کسی نئی سزا اور جزاء کے دینے کی ضرورت نہیں۔ دیکھو یہ آیت کس وضاحت سے بتاتی ہے کہ اگلے جہاں کی نعمتیں اور سزائیں اسی دنیا کے اعمال کے تمثلات ہیں۔

ایک دوسری جگہ قرآن کریم فرماتا ہے اِنَّ الْاَبْرَارَ یَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا۔ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا [۲۷۸]۔ نیک لوگ وہاں ایسے پیالوں سے پئیں گے جن کا اثر کافوری ہو گا یعنی وہ ناجائز جوشوں کو دبانے والے ہوں گے۔ ایسے چشموں سے وہ پیالے بھرے جائیں گے جو چشمے کہ مومنوں نے بڑی محنت سے پھوڑے ہیں۔ یعنی دنیا میں جو عمل وہ کرتے رہے ہیں وہی بطور مثال اس وقت چشموں کی صورت میں ظاہر ہوں گے وہ کوئی الگ شئے نہیں۔

اسی طرح قرآن کریم فرماتا ہے۔ وَمَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰی فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی [۲۷۹]۔ جو شخص اس دنیا میں اندھا ہے وہ اگلے جہاں میں بھی اندھا ہو گا۔ یعنی جس نے اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کو اپنی روحانی آنکھوں سے نہیں دیکھا وہاں چونکہ یہی روح بمنزلہ جسم کے ہوگی وہ اپنے آپ میں اندھوں کی قسم کی ایک کیفیت محسوس کرے گا۔

ایک اور جگہ فرماتا ہے وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰی۔ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِیْۤ اَعْمٰی وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا۔ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰی [۲۸۰]۔ ایسا شخص جو اس دنیا میں میری یاد سے بے پرواہ رہتا ہے اور مجھے تلاش کرنے کی طرف توجہ نہیں کرتا وہ ایسی زندگی بسر کرے گا جو اس کی روحانی طاقتوں کو بالکل محدود کرتی چلی جائے گی اور آخر نتیجہ یہ نکلے گا کہ اس کی روح جب اپنی طاقتوں کو مکمل کرلے گی اور وہ وقت آئے گا جو دوسری روحانی زندگی کے لئے بمنزلہ پیدائش کے ہے تو وہ اندھا ہو گا گویا نئی پیدائش میں وہ اندھا ہی پیدا ہو گا۔ تب وہ گھبرا کر کہے گا کہ خدایا یہ کیا ہوا؟ کہ میں تو اُس دنیا میں سوجاکھا تھا اب تو نے مجھے اندھا کیوں پیدا کیا ہے اس پر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اسی طرح تو نے میرے کلام کو ترک کر دیا تھا پس میں نے بھی تجھے تیرے اعمال کے مطابق نتیجہ نکلنے کے لئے چھوڑ

دیا۔اس آیت سے ظاہر ہے کہ اگلے جہاں کا اندھاپن اِس دنیا کے روحانی اندھے پن کے سبب سے ہوگا۔

پس صاف ثابت ہے کہ اسلام کے نزدیک اگلے جہاں کے تمام دکھ اور سکھ کے سامان گو ایک قسم کا جسم رکھیں گے مگر ہوں گے اس دنیا کے اعمال کے تمثّلات نہ کہ کوئی نئی چیز۔ تفصیلی طور پر بھی جو چیزیں اگلے جہان کی بتائی ہیں ان سے یہی امر معلوم ہوتا ہے۔چنانچہ قرآن میں فرماتا ہے کہ جنت میں ایک قسم کی شراب ملے گی مگر فرماتا ہے کہ وہ شراب ایسی ہوگی کہ دل کو پاک کرے گی۔ اب یہ امر ظاہر ہے کہ جسمانی چیز دل کو پاک نہیں کر سکتی پس شراب سے مراد وہی محبت الٰہی ہے جو اس دنیا میں انسان کو خدا تعالیٰ سے حاصل تھی وہی اگلے جہاں میں شراب کی شکل میں دکھائی جائے گی جس طرح کہ خواب میں انسان روحانی حالتوں کو جسمانی شکلوں میں دیکھتا ہے چنانچہ جب اس شراب کو انسان پئے گا تو چونکہ محبت الٰہی ہی اس شکل میں متمثّل ہوگی کوئی مادی شراب نہ ہوگی اس لئے اس سے دل پاک ہونگے اور خدا کی محبت اور بھی بڑھے گی۔

خلاصہ کلام یہ کہ اسلام نے اگلے جہان کی نعمتوں اور اگلے جہان کی سزاؤں کو جہاں جسمانی قرار دیا ہے وہاں ان کو ساتھ ہی روحانی بھی قرار دیا ہے اور درحقیقت یہی اصلی اور صحیح کیفیت ہے۔ جن لوگوں کو اصل حقیقت معلوم نہ تھی انہوں نے یا تو ان کو جسمانی ہی قرار دے دیا ہے یا صرف قلبی کیفیات سمجھ لیا ہے حالانکہ دونوں امور عقل کے خلاف ہیں۔ نہ وہاں جسمانی چیزیں ہو سکتی ہیں اور نہ خالص قلبی احساسات اس غرض کو پورا کرسکتے ہیں اور نہ کوئی لطیف شئے جو مخلوق ہو بغیر ایک اپنی نسبت کثیف جسم کے رہ سکتی اور اپنی طاقتوں کا اظہار کر سکتی ہے۔

اگلے جہان کے عذاب اور ثواب کہاں اور کس صورت میں ہونگے؟

ایک سوال یہ ہے کہ عالم آخرت کے عذاب اور ثواب کہاں ہونگے؟ اور کس صورت میں ہوں گے؟ اس سوال کا جواب اسلام نہایت ہی لطیف پیرایہ میں دیتا ہے جس کے مقابلہ میں دوسرے ادیان بالکل خاموش ہیں۔ اسلام ہمیں یہ بتاتا ہے کہ دوزخ درحقیقت ان عذابوں کا نام ہے جو حواسِ سبعہ کے ذریعہ سے محسوس ہونگے چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے لَهَا

سَبْعَةُ اَبْوَابٍ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ۔ [۲۸۱] دوزخ کے سات دروازے ہونگے اور ان سات دروازوں میں سے ہراک میں سے دوزخی کا ایک حصہ گزرے گا۔ لیکن چونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم دوزخی ہو یا جنتی ہراک انسان کو مکمل ظاہر کرتا ہے یہ نہیں بتاتا کہ اس کے ٹکڑے کئے جائیں گے۔ اس لئے سات دروازوں سے انسان کا ایک ایک ٹکڑا داخل ہونا در حقیقت اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ دوزخ کو سات حواس کے ذریعہ سے انسان محسوس کرے گا پس گویا سات دروازوں کے ذریعہ سے وہ دوزخ میں داخل ہوگا اور ہراک دروازہ میں سے اس کا ایک حصہ داخل ہوگا یعنی ایک حصہ بینائی کے ذریعہ سے' ایک حصہ شنوائی کے ذریعہ سے' ایک حصہ قوت شامہ کے ذریعہ سے' ایک حصہ قوت ذائقہ کے ذریعہ سے' ایک حصہ قوتِ لامسہ کے ذریعہ سے' ایک حصہ قوت حاسہ کے ذریعہ سے جسے سنس آف ٹمپریچر کہتے ہیں یعنی حس حرارت اور حسِّ برودت کے ذریعہ سے اور ایک قوت فاعلیہ کے ذریعہ سے جسے مسکولر سنس کہتے ہیں۔ ان سات حسّوں سے انسان تمام گناہ کرتا ہے یا تو آنکھ کے ذریعہ سے گناہ کرتا ہے کہ یہ چیزوں کو دیکھتا ہے یا بدی کی نگاہ ڈالتا ہے یا کان کے ذریعہ سے گناہ کرتا ہے کہ غیبتیں سنتا ہے فحش سنتا ہے یا ناک کے ذریعہ سے گناہ کرتا ہے کہ جس چیز کو نہیں سونگھنا چاہئے تھا اسے سونگھتا ہے یا ذائقہ کے ذریعہ سے کرتا ہے کہ ایسی چیزوں کو کھاتا ہے جو نہیں کھانی چاہئے تھیں یا لامسہ کے ذریعہ سے گناہ کرتا ہے کہ نرم بستر اور فرشوں کی خواہش اس کو بنی نوع انسان کے لئے مشقّت اٹھانے میں روک ہوتی ہے یا پھر گرمی اور سردی کے ڈر کے مارے نیک کاموں میں سستی کرتا ہے اور یا سستی اور غفلت کے سبب سے اپنے جسم کو تھکان سے بچانے کے لئے نیک کاموں کو ترک کر دیتا یا ادھورا چھوڑ دیتا ہے۔

غرض سات ہی حواس ہیں جو انسان سے بدی کراتے ہیں اور یہی سات حواس انسان سے نیکیاں بھی کراتے ہیں۔ پس جہنم کے سات دروازوں سے جن کے ذریعہ سے انسان جہنم میں داخل ہوگا وہی سات حواس مراد ہیں جن کے واسطہ اور سبب سے انسان دنیا میں گناہ کرتا تھا عالم آخرت میں یہی اس کے عذاب چکھانے کا موجب ہونگے کیونکہ بوجہ بدی کی عادت ہونے کے ان سات جسمانی حواس کے مقابلہ میں سات روحانی حواس کمزور اور بیمار ہو جائیں گے اور بیماری کی وجہ سے وہ اس دکھ اور عذاب کو محسوس کریں گے جو اگلے جہان میں غلط کاروں کے لئے مقرر ہے۔ چنانچہ ان ساتوں قسم کے عذاب کا قرآن کریم میں ذکر ہے۔ رؤیت کے عذاب کے متعلق

فرماتا ہے وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ [۲۸۲]۔ کاش منکرین اس وقت کا نظارہ اپنے ذہنوں میں لا سکیں جب وہ عذاب کو دیکھیں گے۔ یعنی ایسے نظارے انکو دکھائے جائیں گے جن کی وجہ سے ان کو تکلیف معلوم ہو گی رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ سانپ اور بچھو اور اسی قسم کی اور چیزیں ان کو نظر آئیں گی۔ [۲۸۳]۔

قوت سامعہ کے عذاب کے متعلق قرآن کریم میں آتا ہے اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا [۲۸۴]۔ جب وہ دوزخ کے سامنے آئیں گے تو اس کی تیز آواز اور چیخ سنیں گے یعنی اس کے شعلوں کی آواز نہایت ڈراؤنے طور پر نکلے گی جو خود ایک عذاب ہو گی۔

قوت شامّہ اور ذائقہ کے متعلق فرماتا ہے وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ [۲۸۵]۔ وہ گندے اور میلے پانی پینے کو دیئے جائیں گے جن کو بدمزے اور بو کے سبب سے وہ نگل نہیں سکیں گے۔

چھونے کے عذاب کے متعلق فرماتا ہے لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ [۲۸۶]۔ ان کو اس جگہ بستر اور اوڑھنے بھی عذاب کے ہی ملیں گے یعنی ان کی قوت لامسہ بھی عذاب پا رہی ہو گی۔ اسی طرح فرماتا ہے وَاِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا [۲۸۷]۔ جس وقت وہ جہنم میں ایک تنگ جگہ پر ڈالے جائیں گے جکڑ کر اس وقت ہلاکت کی دعا کریں گے۔

گرمی اور سردی کے عذاب کے متعلق فرماتا ہے فَلْيَذُوْقُوْهُ حَمِيْمٌ وَّغَسَّاقٌ [۲۸۸]۔ اس عذاب کو چکھو گرمی اور سردی کا عذاب۔

مسکولر سنس کے عذاب کے متعلق فرماتا ہے وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ۔ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ [۲۸۹]۔ اس دن کچھ منہ ذلیل ہوں گے محنت کریں گے اور تھکیں گے نتیجہ کچھ نہ نکلے گا۔

غرض کہ ساتوں حواس کے عذاب قرآن کریم نے بیان فرمائے ہیں۔ اور اس سے مراد ان کے ساتوں روحانی حواس کے خراب ہو جانے سے ہے جس کے باعث وہ عذاب میں مبتلاء ہوں گے چونکہ انہوں نے اس دنیا میں خدا کی نعمت یعنی حواس کو برے طور پر استعمال کیا تھا اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ روحانی زندگی میں ان کے حواس بالکل بیمار ہو نگے اور ہر چیز ان کے لئے عذاب بن جائے گی۔ انہی حواس کو جن لوگوں نے نیک طور پر استعمال کیا ہو گا ان کے لئے وہ آرام کا موجب ہو جائیں گے۔ کیونکہ صحیح استعمال سے چیز کی طاقت بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ نیکو کاروں کے جو انعام

قرآن کریم نے بتائے ہیں وہ بھی ان ساتوں حواس سے تعلق رکھتے ہیں ہر حسّ کو لذت حاصل ہوگی کیونکہ وہ تندرست ہوگی کیا تم دیکھتے نہیں کہ سورج کی خوشگوار روشنی جو آنکھوں کے لئے طراوت کا موجب ہوتی ہے اور دل اس سے فرحت حاصل کرتا ہے وہ بیمار آنکھ والے کے لئے کیسی تکلیف دہ ہوتی ہے اور وہ اس سے کس قدر دکھ اور تکلیف محسوس کرتا ہے حتیٰ کہ اگر اس کو جلد نہ روکا جائے تو قریب ہوتا ہے کہ بیمار کی آنکھ ہی ماری جائے یا وہ بیہوش ہو جائے۔ اسی طرح دیکھتے نہیں کہ وہ خوشگوار اور خوبصورت آواز جو طبائع کے لئے نہایت سرور بخش ہوتی ہے اس شخص کے لئے جس کے کانوں میں نقص ہو یا سر درد ہو کس قدر تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے وہی آواز جو بعض دوسروں کو نئی زندگی بخشتی ہے وہ ایسے لوگوں کی جان کے لئے وبال اور ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ پھر کیا نہیں دیکھتے کہ انہی حواس کے نقص کی وجہ سے وہ ناک جو خوشبو سونگھنے کے لئے مقرر کیا گیا ہے جب اس کی حس ذکی ہو جاتی ہے ہر خوشبو کو سونگھ کر تکلیف اٹھاتا ہے اور بعض لوگوں میں تو یہ نقص اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ وہ عطر کی خوشبو سونگتے ہی بیمار ہو جاتے ہیں اور ان کے سر میں درد شروع ہو جاتا ہے حالانکہ خوشبو ایک اعلیٰ درجہ کی نعمت ہے۔ پھر کیا نہیں دیکھتے کہ منہ کا مزہ جو انسان کے لئے ایک بہت بڑا انعام ہے جب خراب ہو جاتا ہے تو میٹھے کو کڑوا اور نمکین کو سخت شور محسوس کرکے انسان کے لئے کس قدر تکلیف کا موجب ہو جاتا ہے اور ہر چیز کی لذت کو خراب کر دیتا ہے بلکہ ایک عذاب بنا دیتا ہے۔ پھر کیا نہیں دیکھتے کہ جب لمس کی حس میں فرق پڑ جاتا ہے تو نرم گدے جو دوسروں کے لئے آرام کا باعث ہوتے ہیں ایسے شخص کو پتھر سے زیادہ سخت اور کانٹوں کے بچھونے معلوم ہوتے ہیں اور آدمی ان پر پڑا لوٹتا ہے۔ پھر کیا نہیں دیکھتے کہ گرمی سردی کی حسّوں میں جب نقص پیدا ہو جاتا ہے تو وہی سردی جو دوسرے لوگوں کے لئے راحت دے رہی ہوتی ہے ایسے شخص کے لئے آگ بن جاتی ہے اور وہ اپنے اوپر سے کپڑے اتار اتار کر پھینک رہا ہوتا ہے اور یہی شکایت کرتا ہے کہ میں جل گیا حالانکہ پاس کے لوگ سردی محسوس کرتے ہیں۔ پھر کیا نہیں دیکھتے کہ گرمی کے موسم میں جس کی گرمی کی حِسّ کو کسی بیماری کی وجہ سے صدمہ پہنچ جاتا ہے وہ سردی کے مارے کانپنے لگتا ہے اور کپڑے اوڑھتا ہے حالانکہ دوسرے لوگ برف کا استعمال کر رہے ہوتے ہیں اور پنکھے جھلتے ہیں۔ اسی طرح کیا نہیں دیکھتے کہ جن لوگوں کی حس عاملہ خراب ہو جاتی ہے ان کو وہی چلنا پھرنا جو دوسروں کے اندر نشاط پیدا کرتا ہے عذاب معلوم ہوتا ہے اور دو قدم چلنے سے پاؤں پھول جاتے ہیں۔ غرض یہ سب

نظارے اس دنیا میں موجود ہیں اور انسان ان نظاروں سے دوزخ کی کیفیت کو اچھی طرح معلوم کر سکتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ جس طرح نیکی ایک مستقل وجود کا نام ہے اور بدی اس کے غلط استعمال کا نام ہے اسی طرح نعمائے الٰہی اصل ہیں اور عذاب اس خرابی کا نتیجہ ہے جو انسان خود اپنے اندر پیدا کرتا ہے۔ رسول کریم ﷺ سے ایک شخص نے دریافت کیا یا رسول اللہ! جب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جنت کا پھیلاؤ آسمان اور زمین کے برابر ہے تو پھر دوزخ کہاں ہے؟ آپؐ نے فرمایا جب دن آتا ہے تو رات کہاں ہوتی ہے؟[۲۹۰] یہی حال جنت اور دوزخ کا ہے۔ اب یہ مراد اس قول سے نہیں ہو سکتی کہ ایک زمانے میں سب لوگ دوزخ میں ہونگے اور ایک زمانہ میں سب لوگ جنت میں۔ جس طرح ایک وقت رات آتی ہے اور دوسرے وقت دن۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ رات بھی ساری دنیا پر آتی ہے اور دن بھی ساری دنیا پر چڑھتا ہے مگر وہ جو سورج کے نیچے آجاتے ہیں ان کے لئے دنیا پر دن ہو جاتا ہے اور دوسروں کے لئے رات۔ اسی طرح وہ لوگ جو خدا کے فضل کے نیچے آجائیں گے ان کے لئے وہ جگہ جنت ہو جائے گی دوسروں کے لئے دوزخ۔ پس جو لوگ خدا تعالیٰ کے فضل سے حواس سبعہ درست رکھتے ہونگے وہ جنت کی لذتیں محسوس کریں گے اور جو لوگ ان حواس کو خراب کر چکے ہوں گے ان کے لئے یہی نعمتیں عذاب اور سخت عذاب ہوں گی۔ نیک تو اسی قدر گرمی محسوس کرے گا جو اس کے لئے خوشی کا موجب ہوگی۔ لیکن بد ایسی شدید آگ محسوس کرے گا کہ وہ اپنے شعلوں سے اس کو جھلس دے گی جس طرح ایک بیمار آگ دیکھتا ہے اور اس کی گرمی بھی محسوس کرتا ہے۔ نیک ٹھنڈے پانی کے مشابہ روحانی نعمتوں کو حاصل کرے گا لیکن جب بد کو پانی ملے گا وہ اس کو ایسا سخت گرم پائے گا کہ اس کے منہ کو جھلس دے گا۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں ہر شخص کے لئے جنت اور دوزخ میں جگہ بنی ہوئی ہے۔[۲۹۱] جو جنت میں جاتے ہیں وہ دوزخیوں کی جگہ لے لیتے ہیں اور جو دوزخ میں جاتے ہیں وہ جنتیوں کے حصے کی جگہ بھی لے لیتے ہیں اس سے بھی یہی مراد ہے کہ جنتی سب راحت کو لے لیتا ہے اور سزا یافتہ سب عذاب کو۔ یہ محاورہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی نعمت سے فائدہ نہ اٹھا سکے تو وہ دوسرے کو کہتا ہے کہ تُو نے بھی میرا حصہ لے لیا ہے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ دوزخ کے متعلق فرماتا ہے وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا [۲۹۲]۔ پھر فرماتا ہے ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا [۲۹۳]۔ ہر ایک شخص دوزخ میں وارد ہوگا۔ پھر ہم متقیوں کو اس کے عذاب سے بچا لیں گے

وارد بھی ہونگے اور بچیں گے بھی۔ اس کے یہی معنی ہیں کہ جنتی اپنے حواس کی درستی کی وجہ سے ہر اک چیز کو اپنے لئے راحت بنالے گا چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک شخص کو کہے گا کہ دوزخ میں چھلانگ مار جب وہ اس میں کودے گا تو وہ اسے بالکل آرام دہ معلوم ہوگی۔ [۲۹۴]

پس اگلے جہان کا ثواب اور عذاب ان کیفیات کا نام ہے جسے وہ روحانی جسم محسوس کرے گا جو اگلی دنیا میں ملے گا اور یہ کیفیات نتیجہ ہونگی حواس سبعہ کے صحیح یا غلط استعمال کا۔ ہاں ایک امر ہے اور وہ یہ کہ دوزخی لوگ اپنی جگہوں میں محصور ہونگے مگر جنتی آزاد ہونگے جس طرح بیمار بستر پر لٹایا جاتا ہے اور تندرست آزاد پھرتا ہے کیونکہ دوزخ ایک قید خانہ ہے اور جنت ایک سیر گاہ۔ پس دوزخ ایک محدود مقام کا نام ہے اور جنت غیر محدود ہے۔ دوزخی اپنے علاقہ سے نہیں نکل سکتا کیونکہ وہ ایک بیمار کی طرح بستر پر لٹایا ہوا ہے لیکن جنتی جہاں چاہے جائے اس کے لئے ہر مقام جنت ہے اگر وہ اس مقام میں بھی داخل ہو جو دوزخیوں کے لئے آگ کا کام دیتا ہے تو اسے وہ بھی گلزار ہی معلوم ہوگا مگر چونکہ دوزخی تکلیف میں ہونگے اور تکلیف کو دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے اس لئے ان کو ایک لطیف پردہ کے ذریعہ سے جنتیوں کی آنکھ سے پوشیدہ رکھا جائے گا سوائے اس کے کہ وہ خود خواہش کرکے دیکھنا چاہیں تاکہ طبیعت پر تکلیف کی حالت دیکھ کر ملال نہ آئے اور جنتی ایک دوسرے کے مدارج سے بھی غافل رہیں گے۔ پھر ہر اک اپنی ہی حالت سے واقف ہوگا۔ ہاں جب خدا تعالیٰ چاہے گا کہ کسی کو ترقی دے تو وہ اسے اوپر کے شخص کے درجہ کی حالت سے آگاہ کرے گا اور جب اس کے دل میں تمنا پیدا ہوگی تو اس کو وہ درجہ مل جائے گا۔

کیا عذاب اور ثواب دائمی ہونگے؟

ایک سوال عالَم آخرت کے متعلق یہ ہے کہ کیا عذاب اور ثواب دائمی ہیں؟ اسلام اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ جزائے نیک تو دائمی ہوگی مگر عذابِ دوزخ دائمی نہیں ہوگا۔ کیونکہ قرآن کریم فرماتا ہے کہ سب انسان اس لئے پیدا کئے گئے ہیں تا خدا تعالیٰ کی صفات کا کامل مظہر بنیں۔ پس اگر کچھ لوگ ہمیشہ کے لئے دوزخ میں پڑے جلتے رہیں تو وہ کامل مظہر کب اور کس طرح بنیں گے؟ قرآن کریم ہمیں یہ بتاتا ہے کہ جنت کی نعمتیں نہ کٹنے والی اور نہ ختم ہونے والی ہونگی مگر دوزخ کی سزاؤں کا یہ حال نہ ہوگا بلکہ خدا تعالیٰ کے ارادہ کے ماتحت اور اس کے فضل سے وہ آخر مٹا دی جائیں گی۔ کیونکہ قرآن فرماتا ہے کہ خدا کی رحمت اس کے غضب پر غالب ہے۔ پس ایک عرصہ تک جب خدا کے غضب کو بدکار بُھگت لیں گے جو اس قدر لمبا عرصہ ہوگا کہ اسے انسانی کمزوری

کے لحاظ سے ابد کہہ سکتے ہیں تب خدا کی رحمت جوش میں آجائے گی۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ یَأْتِیْ عَلٰی جَھَنَّمَ زَمَانٌ لَیْسَ فِیْھَا اَحَدٌ وَنَسِیْمُ الصَّبَا تُحَرِّکُ اَبْوَابَھَا ۲۹۵۔ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ جہنم خالی ہو جائے گی اور اس کے دروازوں کو ہوا ہلائے گی۔ یعنی کوئی شخص عذاب میں مبتلاء نہیں رہے گا۔

اصل میں یہ خیال کہ دوزخی ہمیشہ عذاب میں رہیں گے اِس حکمت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ خدا عذاب کیوں دے گا؟ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں اسلام کا دعویٰ ہے کہ انسان اپنی بداعمالی سے خود عذاب پیدا کرتا ہے ورنہ خدا تعالیٰ رحم کرنے والا ہے۔ وہ سزا دینا نہیں چاہتا مگر چونکہ انسان اپنی روحانی قوتوں کو خراب کر لیتا ہے وہ ان انعامات کے محسوس کرنے کے قابل نہیں ہوگا جو اگلے جہان میں ملیں گے پس وہ عذاب چکھے گا۔ مگر خدا تعالیٰ کے رحم نے ایک یہ قانون بھی مقرر کیا ہوا ہے کہ بیماری میں ہی علاج نکل آتا ہے۔ پس جس طرح جسمانی بیماریوں کے علاج ہو جاتے ہیں ان عذابوں سے جو انسان اگلے جہان میں محسوس کرے گا بدکاروں کی اصلاح ہو جائے گی اور وہ نعمائے جنت کو محسوس کرنے کے قابل ہو جائیں گے تب ان کو جنت میں داخل کر دیا جائے گا اور خدا کی رحمت مکمل ہوگی اور انسان کی پیدائش کی غرض پوری ہوگی اور انسان وہیں جا پہنچے گا جہاں کے لئے وہ پیدا کیا گیا تھا۔

کیا جنت میں عمل ہوگا یا عمل ختم ہو جائے گا؟

ایک اور اہم سوال ہے جس کا جواب دیئے بغیر مابعد الموت حالت کا بیان نامکمل رہ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس ابدی زندگی میں انسان کیا کرتا ہے؟ کیا اس کے اعمال ختم ہو جاتے ہیں؟ اور وہ اب ایک بوڑھے آدمی کی طرح کھانے پینے میں ہی مصروف رہتا ہے یا کچھ کرتا بھی ہے؟

اسلام اس سوال کا جواب یہ دیتا ہے کہ عمل ہی انسان کی زندگی ہے۔ عمل سے انسان کو الگ کر دینا گویا اس کی زندگی کو باطل کر دینا ہے اور زندگی بِلا عمل درحقیقت موت سے بدتر ہے۔ اگر بے عمل کی زندگی بھی کوئی اچھی چیز ہوتی تو اس دنیا میں بھی آرام طلب لوگ سب سے بہتر سمجھے جاتے۔ مگر جس شخص نے کام کی لذت دیکھی ہے وہ جانتا ہے کہ اصل لذت اور سرور کام کرنے اور ترقی کرنے میں ہے خالی بیٹھ رہنا ایک مُختَلُّ الحَوَاسِ انسان کے لئے گو اچھا ہو مگر صحیح الدماغ آدمی کبھی اس کو اچھا نہیں سمجھ سکتا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے نُوْرُھُمْ

یَسْعٰی بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَبِاَیْمَانِھِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْلَنَا اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ [۲۹۶]۔ مومنوں کا نور بعد الموت ان کے آگے آگے چلے گا اور دائیں بھی چلے گا اور کہتے جائیں گے کہ خدایا ہمارے نور کو مکمل کر اور ہماری موجودہ کمزوریوں کو دور کر۔ تُو ہر ایک چیز پر قادر ہے۔ یعنی برابر مومن آگے کو ترقی کرتا چلا جائے گا اور نئے نئے مدارج اس کو نظر آئیں گے جن کے حصول کے لئے وہ کوشش اور خواہش کرے گا۔ اسی طرح قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا یَمَسُّھُمْ فِیْھَا نَصَبٌ [۲۹۷]۔ مومنوں کو وہاں تھکان نہیں ہوگی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کام تو ہوگا مگر اس کے نتیجہ میں تھکان اور ملال پیدا نہیں ہوگا اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یٰٓاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ [۲۹۸]۔ اے نفس! جو میری ذات کے متعلق مطمئن ہو گیا اور جس کے دل میں میری نسبت کوئی شک نہیں رہا۔ اب تُو اپنے رب کی طرف لوٹ اس طرح کہ تو اپنے رب سے خوش ہے اور تیرا رب تجھ سے خوش ہے پس اب تُو میرے غلاموں میں داخل ہو جا اور میرا غلام بن کر اس مقام میں داخل ہو جا جو میرے سائے کے نیچے آیا ہوا ہے یعنی خدا تعالیٰ کی صفات کاملہ کا اس مقام پر کامل پَرتَو پڑتا ہے اس آیت سے ظاہر ہے کہ گو بندہ اس دنیا میں بھی کام کرتا ہے مگر اصل کام کا زمانہ بَعْدَ الْمَوْت کا ہے۔ مومن کامل غلام اسی وقت بنتا ہے کیونکہ اسی وقت اس کو اللہ تعالیٰ کی صفات کو اپنے اندر جذب کرنے کا پورا موقع ملتا ہے پس وہاں کام زیادہ ہوگا نہ کہ بند ہو جائے گا۔

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں یُلْھَمُوْنَ التَّسْبِیْحَ وَالتَّحْمِیْدَ [۲۹۹]۔ جنت میں مومنوں کو نئی نئی تسبیحیں اور تکبیریں الہام کی جائیں گی۔ اس سے یہ مراد نہیں ہو سکتی کہ نئے الفاظ میں خدا کی تسبیح اور تکبیر سکھائی جائے گی۔ کیونکہ یہ کام تو انسان خود بھی کرتا رہتا ہے۔ بلکہ اس سے یہ مراد ہے کہ خدا تعالیٰ کی پاکیزگی اور اس کی بڑائی پر دلالت کرنے والی نئی صفات اس کو الہام سے بتائی جائیں گی تاکہ وہ کوشش کرکے ان صفات کا بھی مظہر بنے۔

شاید کسی کو یہ خیال گزرے کہ نئی صفات کونسی ہوں گی؟ کیا اب وہ صفات معلوم نہیں؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ انسان اسی قدر علم حاصل کر سکتا ہے جس قدر کہ اس کے حواس اس کو سکھا سکتے ہیں اس لئے ہمارے موجودہ علم ہمارے حواس تک محدود ہیں پس ان علموں کی نسبت یہی کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ حواس کو مدنظر رکھ کر یہ علوم کامل ہیں مگر جب نئے حواس انسان

حاصل کرے گا تو نئی صفات کے سمجھنے کی بھی اس کو توفیق ملے گی اور خدا تعالیٰ چونکہ غیر محدود ہے انسان اس حصول علم اور معرفت میں ترقی کرتا رہے گا اور نئی نئی صفات اس پر ظاہر ہونگی اور وہ ان کو اپنے نفس میں پیدا کرنے کے لئے کوشش کرے گا پس ہر نیا علم ایک نیا دورِ عمل جاری کرے گا اور اسی طرح ہوتا چلا جائے گا اور روز بروز انسان کا یہ عرفان کہ خدا تعالیٰ غیر محدود ہے زیادہ ہوتا چلا جائے گا۔

خلاصہ یہ کہ جنت بھی دار العمل ہے جس طرح یہ دنیا دار العمل ہے بلکہ اس سے بڑھ کر۔ صرف فرق یہ ہے کہ اس دنیا میں تو انسان کو نیچے گر جانے کا اور فیل ہو جانے کا خطرہ رہتا ہے وہاں انسان اس خطرہ سے محفوظ ہو جائے گا گویا یہ دنیا روحانی علوم میں ایک مدرسہ کی نسبت رکھتی ہے جس میں فیل اور پاس دونوں ہی صورتیں ہیں لیکن وہ جہان ایسا ہے جیسے کوئی شخص سب امتحان پاس کرکے تحقیقات علمی میں لگ جاتا ہے محنت تو یہ شخص بھی کرتا ہے بلکہ بعض دفعہ طالب علم سے زیادہ لیکن اس میں اور طالب علم میں یہ فرق ہے کہ اسے فیل ہونے کا دھڑکا تھا لیکن اسے وہ دھڑکا نہیں۔

مذکورہ بالا بیان سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اسلام کے نزدیک جنت کی اصل خوشی اور اصل نعمت ترقی روحانی ہی ہے نہ کہ وہ سفلی لذات جو اس کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ سب سے بڑی نعمت جنت میں خدا کی رضا ہو گی اور سب سے بڑی خوشی رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں رؤیت الٰہی کی ہو گی۔[۳۰۰]

حاصل کلام یہ کہ ایک مسلمان کی جنت صحیح علم کے حصول اور پھر اس کے مطابق صحیح عمل کرنے اور ان دونوں کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ کا قرب اور اتّصال حاصل کرنے کا نام ہے اور اس سے بڑا اور کوئی مقصد پیش نہیں کیا جا سکتا۔

اب میں ان تمام سوالوں کے متعلق احمدیت کی تعلیم بیان کر چکا ہوں۔ جن کے متعلق صحیح تعلیم بیان کرنا مذاہب کا کام ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ جو لوگ غور اور فکر سے میری باتوں کی طرف متوجہ ہوں گے وہ اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اس سے بہتر اور کوئی تعلیم نہیں ہو سکتی اور خصوصاً اس کی یہ خوبی کہ یہ خدا تک عملاً انسان کو پہنچا دیتی ہے سب باتوں اور بحثوں کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ انسان دنیا میں کیوں پیدا کیا گیا؟ اسی لئے کہ وہ خدا سے ملے۔ پس وہی مذہب ہمارے کام کا ہے جو خدا سے ہمیں ملاتا ہے نہ کہ وہ جو صرف باتوں سے ہمیں خوش کرنا چاہتا ہے۔

مسیح موعودؑ کی تعلیم کا اثر

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تعلیم کے بیان کر چکنے کے بعد میں یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ اس تعلیم کا اثر آپ کی جماعت پر کیا ہوا ہے؟

یاد رکھنا چاہئے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام خیالاتِ موجودہ کا آئینہ نہ تھے بلکہ زمانہ کی رَو اور اس کے میلان کے بالکل خلاف تعلیم لے کر آئے تھے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اس زمانہ میں خیالات کی رَو دو جہات کی طرف مائل ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ خدا تعالیٰ اور بندہ کے درمیان کوئی گہرا تعلق نہیں ہونا چاہئے بلکہ انسان کو آزادی ملنی چاہئے۔ چنانچہ تمام جدید مذاہب اور قدیم مذاہب اپنے آپ کو اس رَو کے مطابق بنا رہے ہیں اور عبادات کی حقیقت کو بدل کر یا ان میں کمی کر کے لوگوں کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

دوسری رَو اس زمانہ میں یہ چل رہی ہے کہ لوگ فیصلہ کر بیٹھے ہیں کہ تمدنی بنیاد جو پچھلے کئی سو سال میں دنیا میں قائم ہوئی ہے اس میں کوئی فرق نہیں پڑنا چاہئے۔ نہ اس لئے کہ وہ تمدن اعلیٰ اور اکمل ہے بلکہ اس لئے کہ لوگ اس کے عادی ہو چکے ہیں اور اب وہ اس کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں۔ نئے اور پرانے سب مذاہب اپنی تعلیمات کو اس تمدن کے مطابق کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کیونکہ جانتے ہیں کہ وہ اس کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ چنانچہ سود' پردہ' کثرت ازدواج ایسے تمام امور کے متعلق تمام مذاہب اپنی پوزیشن کو صاف کرنے کی فکر میں ہیں اور اپنی تعلیم کو رائج الوقت تمدنی خیالات کے مطابق بنا رہے ہیں۔ مگر برخلاف تمام لوگوں کے حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنی تعلیم کی بنیاد خالص مذہب پر رکھی ہے اور رائج الوقت خیالات پر ان کی بنیاد نہیں رکھی۔ پس آپ حقیقی معنوں میں مصلح تھے نہ کہ زمانہ کے منہ میں نَے کی مانند۔ کہ جو کچھ وہ بجانا چاہتا تھا آپؑ نے اس کو بلند آواز سے کہہ دیا۔ آپ نے زمانہ کی دونوں موجوں کا مقابلہ کیا مذہبی آزادی کا بھی اور تمدنی غلامی کا بھی۔ آپ نے نہ تو عبادات میں کمی کی نہ ان کو اڑایا بلکہ آپ نے اسلام کے قدیم حکم کی طرف دنیا کو توجہ دلائی اور عبادات کی حقیقت کو لوگوں پر ظاہر کیا اور ان کے دلوں میں عبادت کا سچا جوش پیدا کر کے خدا تعالیٰ سے ان کے تعلق کو مضبوط کیا۔ نہ صرف فرض نمازوں کی طرف لوگوں کو توجہ دلائی بلکہ نوافل پر کاربند ہونے کی بھی

رغبت دلائی کیونکہ عبادت چٹی نہیں بلکہ ترقیات روحانیہ کا ذریعہ ہیں۔ روزے جو اس زمانہ میں دوسرے مذاہب سے تو بالکل مفقود ہو گئے تھے مسلمانوں میں سے بھی تعلیم یافتہ لوگوں میں ان کا بالکل رواج نہ رہا تھا آپ نے ان کی ضرورت کو بھی روحانی اور جسمانی دلائل سے ثابت کیا اور ان کی طرف لوگوں کو توجہ دلائی۔ اسی طرح ذکر، حج اور قربانی کی حقیقت کو روشن کر کے ان پر کاربند ہونے کی تعلیم دی۔

تمدنی غلامی سے بھی آپ نے لوگوں کو چھڑایا اور اس بھیڑ چال کی غلطی ان پر ظاہر کی جس میں وہ مبتلاء تھے اور اسلامی تمدنی تعلیم کی خوبی کو ظاہر کیا، سود کی برائی کو ظاہر کیا، پردہ کی خوبیوں کو واضح کیا، کثرت ازدواج کی ضرورت کو ثابت کیا، طلاق کی اہمیت کو بیان کیا، غرض وہ مسائل جن کے متعلق لوگ زمانہ کی رَو کو دیکھ کر بول نہیں سکتے تھے ان کے متعلق علی الاعلان اسلامی تعلیم کو پیش کیا اور زمانہ کے خیالات کی پرواہ نہیں کی۔

میں اس جگہ ان پرانے وساوس اور شُبہات کا جو غیر تعلیم یافتہ لوگوں میں رائج تھے اور جن کا آپ نے مقابلہ کیا اس جگہ ذکر نہیں کرتا کیونکہ کہا جاسکتا ہے کہ زمانہ خود ان کی اصلاح کر رہا تھا۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی اس تعلیم کا جو آپ نے زمانہ کی رَو کے خلاف دی یہ اثر ہوا کہ لاکھوں آدمی جو زمانہ کی رَو میں بہے جاتے تھے ان کو ہوش آگئی اور وہ کھڑے ہو گئے اور انہوں نے سوچا اور اسلامی تعلیم کو سب تعلیموں سے افضل پایا۔ وہ لوگ جو پہلے دہریت اور مادہ پرستی کا شکار تھے جو خدا تعالیٰ کی عبادت تو کیا کرنی تھی اس کے وجود کے ہی منکر ہو رہے تھے ان کو آپ نے تہجد گزار اور ذاکر بنا دیا۔ ان کے دماغ مغربی تعلیم سے روشن ہیں اور ان کے فکر جدید افکار پر محتوی مگر ان کے دل محبت الٰہی سے لبریز ہیں اور ان کے ماتھے خدا تعالیٰ کے حضور میں جھکے رہتے ہیں۔ رات اور دن وہ اللہ تعالیٰ کی یاد میں بسر کرتے ہیں اور باوجود اعلیٰ درجہ کی تعلیم کے وہ دین کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں۔

تمدن کی غلامی سے بھی آپ نے بہت سے لوگوں کو چھڑا کر عقل کے حُریّت خیز میدان میں لا کھڑا کیا ہے۔ باوجود زمانہ کی مخالفت کے آپ کی جماعت تمدنی اصلاح میں مشغول ہے اور اس کی عمارت کو طلبِ فرحت اور عیاشی کی بنیادوں سے ہٹا کر اصلاح اور عفّت اور اخلاق پر کھڑا کر رہی ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے مذہبی دیوانگی پیدا نہیں کی اور نہ مذہب کو اپنی ذات کی محبت کے گرد لپیٹ کر لوگوں کی توجہ کو ایک ہی نقطہ پر جمع کر دیا ہے جیسا کہ ان لوگوں کا قاعدہ ہے جو باقی نیک خصلتوں کو نظر انداز کر کے صرف قربانی اور ایثار کا مادہ پیدا کرنا چاہتے ہیں بلکہ آپ نے ہر اک چیز کو اس کے مرتبہ کے مطابق پیش کیا ہے اور انسانی عقل کو ہر ممکن طریق سے زندہ رکھنے کی بلکہ ترقی دینے کی کوشش کی ہے۔ مگر باوجود اس کے آپ کی جماعت میں یہ مادہ نظر آتا ہے کہ وہ اپنی جان اور اپنا مال خدا تعالیٰ کے راستہ میں قربان کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ ان کی مثال صحابہؓ رسول کریم ﷺ کی ہے جن کی نسبت قرآن کریم فرماتا ہے۔ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ [۳۰۱]۔ ان میں سے بعض نے اپنے ارادہ کو پورا کر دیا اور خدا کی راہ میں جان دے دی ہے اور بعض اس وقت کے منتظر ہیں۔ چنانچہ افغانستان میں دو موقعے احمدیوں کو جان قربان کرنے کے ملے ہیں جن میں انہوں نے نہایت ثبات سے جانیں دی ہیں۔ دو موقعوں سے میری مراد یہ ہے کہ جن دو موقعوں پر ان کو کہا گیا ہے کہ تم توبہ کر لو مگر انہوں نے توبہ نہیں کی ورنہ احمدیت کی وجہ سے مارے تو وہاں کئی آدمی گئے ہیں جن کی تعداد دس سے کم نہ ہو گی۔

ان آدمیوں میں سے زیادہ اہم شہادت سید عبد اللطیف صاحب کی ہے۔ آپ افغانستان کے بہت بڑے عالم تھے اور آپ کو ایسا درجہ حاصل تھا کہ امیر حبیب اللہ خان [۳۰۲]۔ صاحب کی تاجپوشی کی رسم آپ ہی نے ادا کی تھی۔ آپؓ کو جب سلسلہ احمدیہ کی خبر ملی تو آپ نے کتب سلسلہ منگوا کر پڑھیں اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام پر ایمان لے آئے۔ اس کے بعد ملاقات کا شوق پیدا ہوا اور حج کی نیت سے افغانستان کے امیر سے اجازت لی اور راستہ میں قادیان بھی ٹھہرنے کا ارادہ کیا۔ قادیان آکر ان پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ انہوں نے کہا کہ مجھے اب آگے نہیں جانا چاہئے بلکہ یہاں رہ کر دین کی معلومات بڑھانی چاہئیں۔ چنانچہ وہ یہیں ٹھہر گئے اور کئی مہینے ٹھہر کر واپس وطن گئے اور جاتی دفعہ کہہ گئے کہ میرا ملک مجھے بلاتا ہے تا اپنے خون سے اس کی اصلاح کا راستہ کھولوں اور میں اپنے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی دیکھتا ہوں۔ ملک میں جاتے ہی امیر نے طلب کیا اور ان سے پوچھا کہ کیا وہ احمدی ہو گئے ہیں؟ انہوں نے اقرار کیا۔ اس پر بہت بڑی بحث کے بعد علماء کے فتویٰ کے ماتحت ان کے قتل کا فیصلہ کیا گیا۔ بار بار امیر نے بلا کر ان کو توبہ کی تحریک کی مگر انہوں نے انکار کیا اور آخر ان کو زمین میں گڑھا کھود کر آدھا دفن کیا گیا اور امیر خود مع لشکر

میدان میں آیا اور شہر کے لوگ بھی اکٹھے ہوئے اور سنگسار کرنے کی تجویز ہوئی- آخری وقت میں امیر پھر ان کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ صاحبزادہ صاحب! اب بھی موقع ہے آپ اپنے عقیدہ سے توبہ کرلیں مگر انہوں نے جواب دیا کہ توبہ کس بات سے؟ میں نے حق کو پالیا ہے اور میں اس کو نہیں چھوڑ سکتا- یاد رکھو کہ میرے مرنے کے بعد پہلی جمعرات کو قیامت آجائے گی اور میں جی اٹھوں گا- جب امیر مایوس ہو گیا تو اس نے واپس آکر سید الشہداء پر پتھر پھینکا اور چاروں طرف سے لوگوں نے پتھر پھینکنے شروع کئے مگر صاحبزادہ صاحب استقلال سے کھڑے رہے یہاں تک کہ پتھروں کی ضربوں سے ان کا سر پاش پاش ہو گیا اور گردن جھک گئی- ظالم برابر پتھر مارتے چلے گئے حتیٰ کہ سر تک پتھروں کا ایک بڑا ڈھیر جمع ہو گیا اور اس صادق مومن کی پاکیزہ روح اپنے پیدا کرنے والے سے جاملی- تب لوگ واپس اپنے گھروں کو چلے گئے مگر ان کی لاش پر پہرہ مقرر کر دیا گیا تا کہ کوئی شخص ان کو دفن نہ کردے- مگر خدا کا بدلہ نزدیک تھا وہ قیامت جس کی انہوں نے خبر دی تھی اچانک آگئی اور پہلی جمعرات کو غیر معمولی طور پر خلاف توقع اور خلاف پچھلے تجربہ کے کابل میں سخت ہیضہ پھوٹا اور سخت موت پڑی جس سے شاہی خاندان میں سے بھی بعض جانوں کا نقصان ہوا- ان واقعات کو ایک بے تعلق انگریز انجینئر مسٹر مارٹن (FRANK A. MARTIN) دی انجینئر اِنچیف افغانستان نے اپنی کتاب "انڈر دی ابسولیوٹ امیر" (UNDER THE ABSOLUTE AMIR) [۳۰۳] میں نہایت سادگی سے بیان کیا ہے جو پڑھنے کے قابل ہے- گو بوجہ سلسلہ سے ناواقفیت کے بعض باتیں انہوں نے غلط لکھ دی ہیں مگر پھر بھی ان کی تحریر نہایت مؤثر ہے خصوصاً اس صورت میں کہ ایک بے تعلق آدمی کی لکھی ہوئی ہے-

صاحبزادہ عبداللطیف صاحب سے پہلے ان کے شاگرد مولوی عبدالرحمٰن صاحب کو گلا گھونٹ کر مار دیا گیا تھا ان کا جرم بھی یہی تھا کہ وہ سلسلہ احمدیہ سے تعلق رکھتے تھے- ان دو قتلوں کے علاوہ جو حکومت کی طرف سے ہوئے ہیں لوگوں نے کئی احمدی قتل کئے ہیں- چنانچہ پچھلے ماہ میں دو احمدیوں کو لوگوں نے مار دیا ہے- علاوہ قتل کے دوسری تکالیف تو ہمیشہ ہی احمدیوں کو پہنچائی جاتی ہیں جنہیں وہ نہایت بہادری سے برداشت کرتے ہیں- چنانچہ اسی سال کے دوران میں خوست کے علاقہ میں جو بغاوت ہوئی ہے اس میں جب باغیوں نے ہزمیجسٹی دی امیر کی افواج کے خلاف کچھ زور چلتا ہوا نہ دیکھا تو احمدیوں کے دو گاؤں جلا دیئے اور بہانہ یہ کیا کہ یہ لوگ امیر کو

ورغلاتے ہیں۔ سال میں دو تین دفعہ ایسا ضرور ہوتا ہے کہ عوام بعض متعصب مقامی افسروں کو ملا کر جس جس احمدی پر زور چلے اسے گرفتار کرلیتے ہیں اور بعض کو منہ کالا کر کے گدھے پر سوار کر کے شہر میں پھراتے ہیں' بعض کو مارتے ہیں' بعض کو قید میں ڈال دیتے ہیں اور جُرمانہ وصول کر کے چھوڑتے ہیں۔ مگر باوجود اس کے کہ پچیس سال سے احمدی یہ مصائب برداشت کرتے چلے آرہے ہیں خدا تعالیٰ کے فضل سے ان کے ایمان متزلزل نہیں ہیں بلکہ وہ ترقی کر رہے ہیں۔

یہ امر جذبۂ شکر کے خلاف ہوگا اگر میں اس جگہ یہ اظہار نہ کردوں کہ ہز میجسٹی امیر امان اللہ صاحب جب سے سلطنتِ افغانستان پر متمکن ہوئے ہیں انہوں نے ان مظالم کو بالکل مٹا دیا ہے جو احمدیوں کے خلاف حکومت کی طرف سے ہوتے تھے اور گو بوجہ اس کے کہ ابھی افغانستان انتظام و درستی کے ابتدائی مراحل سے گذر رہا ہے وہ ان کے لئے حقیقی امن قائم کرنے میں ابھی تک کامیاب نہیں ہوسکے۔ مگر ہم امید کرتے ہیں کہ گورنمنٹ افغانستان اسی انصاف کی روح کے ساتھ کام کرتی رہی تو کچھ عرصہ تک افغانستان میں احمدیوں کے لئے گورنمنٹ کے علاوہ حکام مقامی اور رعایا سے بھی امن ہو جائے گا۔

یہ تو افغانستان کے لوگوں کی قربانی ہے مگر ہندوستان کے احمدیوں کا حال کم نہیں ہندوستان میں انگریزی حکومت ہے اس لئے یوں تو مار نہیں سکتے مگر جھوٹ اور فریب سے ہر جگہ احمدیوں کو تکلیف دی جاتی ہے اور وہ سب تکلیفوں کو خوشی سے برداشت کرتے ہیں۔ قتل بے شک ایک بڑا ابتلاء ہے لیکن صبر آزما مصیبت وہ ہے جو آہستہ آہستہ آتی ہے۔ ہندوستان کے احمدیوں کو اس سے حصہ ملا ہے بلکہ نوے فیصدی احمدی ان حالات میں سے گزرتے ہیں۔ بہت ہیں جن کے جسم ان نشانوں سے پُر ہیں جو ان کو احمدیت قبول کر کے ماریں کھا کر لگے ہیں' بہت سے لوگ گھروں سے نکالے گئے' بعض چھوٹے چھوٹے بچوں کو والدین نے نکال دیا مگر ثابت قدم رہے' بعض دفعہ ایک گاؤں میں ایک ہی احمدی ہوتا ہے اور سب لوگ اس کو مل کر مارتے ہیں پھر پولیس کی تفتیش پر کوئی اس کی تائید میں گواہی دینے والا نہیں ہوتا' کئی جگہوں پر قبرستانوں میں احمدیوں کو مردے دفن نہیں کرنے دیتے' بعض جگہ لاشیں لوگوں نے باہر نکال کر پھینک دیں' گرمیوں کے دنوں میں کنوؤں سے پانی لینے سے روک دیا اور کئی کئی دن اس شدید گرمی میں کہ پارۂ حرارت ایک سو پندرہ تک سایہ میں ہو جاتا ہے بڑوں اور بچوں کو پیاسا رہنا پڑا' کئی جگہ ان کی دکانوں سے سودا نہیں لیا جاتا اور ان کے کھیت برباد کر دیئے جاتے ہیں' ان کے لیکچروں اور وعظوں کے موقعوں پر

پتھر مارے جاتے ہیں شور کیا جاتا ہے' کئی جگہ ان کی بیویوں کو ان سے جبراً چھین کر ان کا دوسری جگہ نکاح کر دیا گیا ہے' بچوں کو والد سے جدا کر لیا گیا ہے' عورتوں کو ان کے خاوندوں نے مار کر گھر سے نکال دیا ہے' سرکاری ملازمتوں میں چونکہ دوسرے لوگوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے ان میں بھی احمدیوں کو دِق کیا جاتا ہے اور ہمیشہ وہ مصائب میں مبتلاء رہتے ہیں' وکلاء اور ڈاکٹروں کا بھی جہاں بس چلتا ہے بائیکاٹ کیا جاتا ہے' عام پیشہ وروں کا تو حال ہی ناقابل بیان ہے ان کو تو سخت تکلیف دی جاتی ہے حتیٰ کہ سینکڑوں ہیں جو غیر احمدی ہونے کی حالت میں اچھے آسودہ حال تھے مگر آج وہ نانِ شبینہ کے محتاج ہیں۔ مگر حضرت مسیح موعود نے کچھ ایسی روح اس جماعت میں پھونک دی ہے کہ وہ دلیری سے ان مصائب کو برداشت کرتی ہے مگر اپنے ایمان کو نہ چھوڑتی ہے نہ چھپاتی ہے بلکہ علی الاعلان اس کو ظاہر کرتی رہتی ہے اور دین کو دنیا پر مقدم کرنے کا اعلیٰ نمونہ دکھاتی رہتی ہے۔

احمدی افراد اپنے لباس واطوار میں دوسرے لوگوں سے جدا نہیں ہیں مگر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تعلیم نے ان پر کچھ ایسا اثر کیا ہے کہ باوجود لباس وغیرہ میں تغیر نہ ہونے کے عام طور پر لوگ ان کو پہچان لیتے ہیں اور اس کی وجہ ان کے وہ اعلیٰ اخلاق ہیں جن کے ذریعہ سے وہ دوسروں سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ ان کی زبانوں کا گالیوں اور فحش باتوں سے پاک ہونا' ان کا دوسروں کی خاطر تکلیف اٹھانا اور ایثار سے کام لینا' ان کا دھوکے اور فریب سے بچنا یہ ان کو ہر مجلس میں ممتاز کر کے دکھا دیتا ہے اور وہ آدمی بھی جو احمدی کیریکٹر سے واقف ہو لیکن ایک احمدی کا ذاتی واقف نہ ہو اسے ریل یا جلسہ یا دوسری اجتماع کی جگہوں میں پہچان لیتا ہے۔

جاہل سے جاہل احمدی بھی کہیں نظر آئے تو اس کی عقل تیز اور اس کی بحث کی قابلیت غیر معمولی نظر آئے گی۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تعلیم نے اس جماعت کے بنانے میں یہ عظیم الشان معجزہ دکھایا ہے کہ ایک طرف تو احمدی آپ کی تعلیم کے ماتحت اس انتہائی بے دینی اور بے پرواہی کو چھوڑ کر جو دنیا میں نظر آتی تھی خدا تعالیٰ اور اس کے رسولوں اور اس کے کلام کی محبت میں سرشار نظر آتا ہے۔ وہ اپنے وجود کو اب صرف ایک آئینہ سمجھتا ہے جو خدا تعالیٰ کی صفات کے انعکاس کے لئے بنایا گیا تھا۔ اس کا دن اور اس کی رات خدا تعالیٰ کی یاد اور اس کی عبادت میں صرف ہوتے ہیں وہ اس دنیوی مقابلہ کے زمانہ میں اپنے کاموں کا حرج کر کے روحانی فیوض کے حصول میں مشغول نظر آتا ہے مگر دوسری طرف اسی تعلیم کے اثر سے وہ دنیا کے سخت

ترین معقول لوگوں میں سے ہے وہ کسی بات کو بِلا دلیل ماننے کے لئے تیار نہیں ہر اک بات کو دلیل سے مانتا ہے اور دلیل سے منوانا چاہتا ہے۔ وہ علوم جدیدہ کا دشمن نہیں بلکہ ان کا مؤیّد ہے اور ان کو دین کا مخالف نہیں بلکہ دین کا خادم سمجھتا ہے۔ غرض وہ ہر بات میں اپنی حریّت کو قائم رکھتا ہے وہ نہ اپنے باپ دادوں کی سنی سنائی بات کو مانتا ہے اور نہ ہر مدعی علم کے دعویٰ کو تسلیم کرلیتا ہے اور ہر جدید بات پر فدا ہو جاتا ہے بلکہ ہر بات کو علم اور عقل سے موازنہ کرکے دیکھتا ہے اور ہر اک حقیقت کو اسی مقام پر رکھتا ہے جو اسے خدا تعالیٰ نے بخشا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ایک عجیب اثر اپنی جماعت میں یہ پیدا کردیا ہے کہ آپ کی جماعت کے لوگ علم حاصل کرنے میں دوسرے لوگوں سے غیر معمولی طور پر بڑھ گئے ہیں۔ ہندوستان کی دوسری آبادی کی نسبت اس جماعت کے لوگ تعلیمی نسبت میں بہت زیادہ ہیں حالانکہ بوجہ غربت مدارس کا کوئی الگ انتظام نہیں ہے۔ بہت سے لوگ ہیں جنہوں نے بڑھاپے میں تعلیم حاصل کی ہے۔ عورتوں میں تعلیم کا اس قدر چرچا ہے کہ قادیان کے بہت سے گھر مدرسے معلوم ہوتے ہیں۔ ستّر ستّر برس کی عورتیں قرآن کریم کو ترجمہ کے ساتھ پڑھ رہی ہیں۔ ہر عمر کے لوگوں کا اک جمگھٹا مردوں میں سے بھی اور عورتوں میں سے بھی قادیان میں لگا رہتا ہے جو مختلف صوبوں سے اور ملکوں سے قادیان میں تعلیم دین حاصل کرنے کے لئے آتے ہیں۔ غرض دنیا میں اگر کہیں مغرب و مشرق جمع نظر آتے ہیں تو وہ قادیان ہی ہے کیونکہ دوسری جگہوں میں اگر مغربی تعلیم ہے تو دین جو مشرق سے پیدا ہوا ہے ندارد ہے۔ اور اگر دین ہے تو علوم جدیدہ سے بے پرواہی ہے جن کا سرچشمہ آجکل مغرب ہے لیکن احمدی جماعت اور خصوصاً قادیان میں جو مرکز سلسلہ ہے یہ دونوں چیزیں اکٹھی نظر آتی ہیں۔ یہاں باوجود مسٹر کپلنگ (MR.KIPLING) [۳۰۴] کے مخالف دعویٰ کے مغرب و مشرق اکٹھے نظر آتے ہیں۔ ایک طرف تو علوم جدیدہ کی تحصیل اور ان میں ترقی کرنے کا جوش ہے اور دوسری طرف مذہب سے اخلاص اور اس کی تعلیمات پر یقین اس درجہ پر پہنچا ہوا ہے کہ اس کے لئے جان اور مال اور وطن کی قربانی ایک حقیر شئے نظر آتی ہے اور مذہب کے چھوٹے سے چھوٹے حکم کو اس کی اصل شکل اور صورت میں احتیاط سے پورا کیا جاتا ہے۔

احمدیوں میں عورتوں کے حقوق کی ادائیگی اور ان کو جائز قیود سے آزاد کرنے کا بھی خاص خیال پایا جاتا ہے مگر باوجود اس کے وہ مذہب کے خلاف کوئی بات نہیں کرتے۔ ان میں مذہبی روا

داری تمام اقوام سے زیادہ ہے وہ ان جھگڑوں کو جو بعض مذہبی رسوم کی ادائیگی کے متعلق مختلف اقوامِ ہند میں ہوتے رہتے ہیں بچوں کا کھیل سمجھتے ہیں اور لوگوں کو سمجھاتے رہتے ہیں وہ اپنی مساجد میں سخت ترین دشمنان اسلام کو بولنے کا موقع دیدیتے ہیں اور ان کی باتیں سنتے اور اپنی سناتے ہیں۔

ایک عظیم الشان تبدیلی جو احمدی جماعت میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے پیدا کردی ہے وہ دین کو دنیا پر مقدم رکھنے کا احساس ہے۔ ہراک احمدی اپنے مال کو خدا تعالیٰ کی امانت خیال کرتا ہے جو لوگ سلسلہ کی تربیت کے نیچے آچکے ہیں وہ ماہوار سولھواں حصہ دینی کاموں کے لئے بطور چندہ دیتے ہیں۔ اس چندہ کے علاوہ خاص چندوں میں بھی ان کو حصہ لینا پڑتا ہے جن کو اگر جمع کردیا جائے تو ہرایک احمدی جو سلسلہ تربیت کے نیچے آچکا ہے اپنے اپنے اخلاق کے مطابق اپنی آمد کے تیسرے حصہ سے دسویں حصہ تک چندہ میں دیتا ہے اور یہ انکی قربانی لوگوں کی نظروں میں ایسی عجیب ہے کہ بعض لوگ تو یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ جماعت بڑی امیر ہے اور بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس جماعت کو گورنمنٹ مدد دیتی ہے حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ گورنمنٹ نہ مدد دیتی ہے نہ دے سکتی ہے اور ہماری جماعت نہایت ہی غریب ہے اور شاید اس سے غریب اور کوئی جماعت ہندوستان میں نہیں۔ مگر ہم میں سے ہراک اپنی ضرورتوں کو قربان کرکے دنیا کی دینی، اخلاقی اور علمی ضرورتوں کی اصلاح کے لئے اس قدر چندہ دیتا ہے کہ دوسری اقوام میں اس سے دس گنی آمدنی والے لوگ بھی اس قدر روپیہ بنی نوع انسان کی ہمدردی کے لئے خرچ نہیں کرتے اور اس قربانی میں ان کی عورتیں مردوں سے کم نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنے ایثار سے ثابت کردیا ہے کہ دنیا کے پردے پر ایسی عورتیں بھی ہیں جو زیور اور کپڑے کے لئے نہیں بلکہ خدا کے لئے جیتی ہیں۔ چنانچہ پچھلے سال میں نے جرمن میں مسجد بنانے کی تحریک کی اور صرف عورتوں سے چندہ طلب کیا اور میں نے دیکھا کہ بیسیوں عورتوں نے اپنے زیور اور اپنے اعلیٰ کپڑے تک فروخت کرکے اس کام کے لئے دیدیئے اور جس قدر رقم ان سے طلب کی گئی تھی اس سے دگنے سے بھی زیادہ چندہ جمع کردیا۔

غرض سلسلہ احمدیہ کا اثر افراد سلسلہ پر ایسا گہرا اور ایسا نمایاں ہے کہ اس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ چنانچہ سلسلہ کے اشدّ ترین دشمن بھی اس کا اقرار کرتے ہیں مگر وہ اس تغیر کو اس پردہ کے نیچے چھپانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ دکھانے کے لئے اور منافقت سے ہے۔ مگر

کیسی مبارک یہ منافقت ہے جس نے بیماروں کو چنگا کر دیا ہے اور مُردے زندہ کر دیئے ہیں۔ کاش یہ منافقت دنیا کے ہر گوشہ میں نظر آتی۔

سلسلہ احمدیہ کا جو اثر اس کے افراد پر ہے اس کو اجمالی طور پر بیان کرنے کے بعد میں اپنے مضمون کو ختم کرتا ہوں اور تمام بھائیوں اور بہنوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہوں کہ:۔

اے بھائیو اور بہنو! خدا نے ہمیں اس لئے پیدا کیا ہے تا ہم اس کے جلال کے مظہر ہوں اور تا اس کی صفات کو اپنے اندر جذب کریں جب تک ہم اس مقصد کو پورا نہ کریں ہم ہرگز کامیاب نہیں کہلا سکتے۔ ہماری دنیاوی ترقیات کیا ہیں؟ ایک مشغلہ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتیں۔ یہ تمام ترقیات ہمارے کس کام کی اگر ہم خدا کو اپنے پر ناراض کر لیتے ہیں؟ اور ابدی ترقیات کے راستے اپنے اوپر بند کر لیتے ہیں۔ اگر ہم دنیا کے سب سے بڑے موجد بھی ہیں لیکن اس علم کی طرف توجہ نہیں کرتے جس کے ذریعہ سے ہم ابدی زندگی میں نور حاصل کر سکیں تو ہماری مثال اس طالب علم کی ہے جو سارا دن کھیلتا رہتا ہے اور اس پر خوش ہو جاتا ہے کہ اس نے مقابلہ میں اپنے حریف کو پچھاڑ لیا لیکن وہ اس مقابلہ کی فکر نہیں کرتا جو اس کی ساری زندگی کو سدھارنے والا ہے۔ زندگی وہی ہے جو نہ ختم ہونے والی ہو اور راحت وہی ہے جو نہ مٹنے والی ہو اور علم وہی ہے جو ہمیشہ بڑھتا رہے پس ابدی زندگی اور دائمی راحت اور حقیقی علم کی طرف توجہ کرو تا دونوں جہان کا آرام پاؤ اور اسی طرح خدا تعالیٰ کو خوش کرو جس طرح کہ دنیا کے لوگوں کو خوش کرنا چاہتے ہو۔

اے بھائیو اور بہنو! خدا تعالیٰ نے تمہاری پریشان حالت کو دیکھ کر آپ تمہارے لئے رحمت کا دروازہ کھولا ہے اور خود تم کو بلانے کے لئے آیا ہے پس اس کے اس احسان اور اس کی محبت کی قدر کرو اور اس کی نعمتوں کو رڈ نہ کرو اور اس کے احسانوں کو حقیر سمجھ کر ان سے منہ نہ پھیرو کہ وہ خالق ہے اور مالک ہے اور اس کے آگے کسی تکبر کرنے والے کا تکبّر نہیں چلتا۔ بڑھو اور اس کے فضل کے دروازے میں داخل ہو جاؤ تا اس کی رحمت تم کو اپنی آغوش میں لے لے اور اس کے فضل کی چادر تم کو اپنے اندر لپیٹ لے۔

اے انگلستان کے رہنے والو! خدا نے تم کو دنیا میں عزت دی ہے مگر اس عزت کے ساتھ تمہاری ذمہ داری بھی بڑھ گئی ہے کیونکہ ہر اک جو زیادہ احسان کے نیچے ہوتا ہے زیادہ ذمہ وار ہوتا ہے۔ خدا نے تم کو سینکڑوں سالوں سے سمندروں کی حکمرانی عطا کی ہوئی ہے۔ تمہارا ملک

سمندروں کی ملکہ کہلاتا ہے مگر کیا تم نے کبھی اس بادشاہ کی طرف بھی توجہ کی جو سب عزتوں کا سرچشمہ ہے اور جس کی عنایت کی ایک نگاہ نے تم کو اس مرتبہ تک پہنچایا ہے۔ کیا تم نے کبھی معرفت کے سمندر کی بھی جستجو کی؟ جو ہر اس شخص کے دل میں لہریں مارتا ہے جو اس کی تلاش کرے آہ! تم شمال کی طرف گئے اور جنوب کی طرف گئے اور تم نے زمین پر ایک ایک چُلّو پانی کو چھان مارا اور سب گہرائیوں کو دریافت کیا مگر افسوس! کہ ابھی تک معرفت کے سمندر کی تہہ معلوم کرنے کے لئے تم نے کبھی غوطہ نہیں مارا نہ اس کی دریافت کے لئے وفد بھیجے

تم نے جزیروں کی تلاش میں اور خشکیوں کی جستجو میں زمین کا چپّہ چپّہ دیکھ مارا اور تمہارے بیڑوں نے ہر اک طرف کا رخ کیا مگر تم کبھی اس یار کی جستجو میں نہ نکلے جو ان سب زمینوں کا پیدا کرنے والا اور سب جزیروں کا بنانے والا ہے کیا یہ بھی دانش ہے کہ درخت سے گرے ہوئے بُور کو تو جمع کیا جائے لیکن پھل کو چھوڑ دیا جائے؟

اے بھائیو! میں تم کو بشارت دیتا ہوں کہ خدا کی رحمت آج اسی طرح جوش میں آئی ہوئی ہے جس طرح آج سے سینکڑوں سال پہلے وہ جوش میں آئی تھی جس طرح وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں جوش میں آئی تھی، مسیح ناصری علیہ السلام کے وقت میں جوش میں آئی تھی، داؤد کے وقت میں جوش میں آئی تھی، موسیٰ کے وقت میں جوش میں آئی تھی، اسحٰق کے وقت میں جوش میں آئی تھی ابراہیمؑ کے وقت جوش میں آئی تھی، نوحؑ کے وقت میں جوش میں آئی تھی اور اس کی معرفت کا سورج اسی طرح آج بھی چڑھا ہے جس طرح کہ پہلے نبیوں کے زمانہ میں چڑھا کرتا تھا۔

پس باہر نکلو اور کمروں کی بند ہوا کی بجائے عالم روحانی کی وسیع فضاء میں خدا کی رحمت کی ٹھنڈی اور معطر ہوا سونگھو اور اس کی معرفت کے سورج کی خوشگوار روشنی اور چمک سے اپنی آنکھوں کو منور کرو کہ یہ دن روز روز نہیں چڑھا کرتے۔

میں تمہیں ہی نہیں بلکہ سب ان قوموں کو جو انگریزی حکومت کے جھنڈے کے نیچے آرام کی زندگی بسر کرتی ہیں کہتا ہوں کہ دیکھو خدا نے اپنی برکت کا ہاتھ تمہارے سروں پر رکھا ہے تم ادب کے گھٹنے اس کے سامنے جھکا دو۔

میں ویلز کے لوگوں سے کہتا ہوں کہ اے ویلز! تُو اپنی محنت اور جانفشانی پر نگاہ کر اور دیکھ کہ تیری محنت میں سے کس قدر حصہ خدا کے لئے ہے اور اے سکاٹ لینڈ! تُو اپنی آزاد زندگی پر فخر

کرتا ہے کیا تُونے خدا کی باتوں کے سمجھنے اور قبول کرنے میں بھی ویسی ہی آزادی دکھائی ہے جیسی کہ دوسرے امور میں؟ اور اے آئرلینڈ کے لوگو! تمہاری حب الوطنی اور جوش ضرب المثل ہیں مگر کیا تم نے اس محبت کا کچھ حصہ خدا کے لئے بھی نکالا؟ کیا اس کے پانے کے لئے بھی تم نے ویسا ہی جوش دکھایا جیسا کہ اپنے ملک کی حکومت کے لئے؟

اے نو آبادیوں کے لوگو! کہ تم نو آبادیوں کے بسانے میں ایک خاص ملکہ رکھتے ہو اور نئی زمینوں کو شوق سے بساتے ہو مگر اب تک تم اس عرفان کے جزیرے کو جو علم کے سمندر سے نکلا ہے بسانے میں کیوں غافل ہو؟

میں پھر کہتا ہوں۔ دیکھو! خدا نے برکت کا ہاتھ تمہارے سروں پر رکھا ہے اپنے ادب کے گھٹنے اس کے سامنے جھکا دو کہ وہ بادشاہوں کا بادشاہ اور شہنشاہوں کا شہنشاہ ہے۔ اپنے سروں کو اس کے سامنے کرو تا وہ اسی طرح ان کو دین کی برکتوں سے ممسوح کرے جس طرح کہ اس نے انہیں دنیا کی برکتوں سے ممسوح کیا۔

خدا تعالیٰ کی نعمتیں محدود نہیں ہوتیں۔ وہ ہر اک ملک اور ہر اک قوم کا خدا ہے اور اس کا سچا پرستار بھی شکلوں اور حد بندیوں کے چکر میں بندھنا پسند نہیں کرتا۔ وہ بے شک اپنی قوم اور اپنے ملک کا خیر خواہ ہوتا ہے لیکن اس کی نظر قوم اور ملک سے بالا جاتی ہے۔ وہ ان حد بندیوں سے بہت اوپر رہتا ہے۔ وہ تمام بنی نوع انسان کا خیر خواہ ہوتا ہے۔ اور سب انسانوں میں اس برادرانہ تعلق کا نشان پاتا ہے جو رب العالمین خدا کی مخلوق ہونے کے سبب سے ان میں پایا جاتا ہے اس کے لئے کالے اور گورے، مغربی اور مشرقی اپنے اور غیر اس کی نظر میں بحیثیت انسان ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔ ہر اک کی خیر خواہی اس کے دل میں راسخ اور ہر اک کی محبت اس کے قلب میں موجزن ہوتی ہے۔ وہ درحقیقت رب العالمین خدا کا سچا مظہر ہوتا ہے۔

پس میں اپنے خطاب کو کسی خاص قوم تک محدود نہیں رکھتا نہ کسی خاص ملک تک بلکہ میں سب دنیا کے لوگوں کو اس خدا کے پیغام کی طرف بلاتا ہوں جس نے اپنی تقسیم میں کسی قوم سے بخل نہیں کیا۔ جس نے اپنی رحمت کے دروازے ہر اک ملک کے لوگوں کے لئے یکساں طور پر کھلے رکھے ہیں اور کہتا ہوں کہ اے امریکہ اور یورپ کے لوگو! اے آسٹریلیا اور افریقہ کے لوگو! اے ایشیا کے باشندو!!! خواب غفلت کو ترک کرو اور آنکھیں کھولو۔ خدا کی محبت کا سورج قادیان کی گمنام سرزمین سے چڑھا ہے تا ہر اک کو اس ازلی بادشاہ کے پیار کی یاد دلائے جو اسے

اپنے بندوں سے ہے تاشکوک و شبہات کی تاریکیاں مٹ جائیں۔ تا غفلت اور بے پرواہی کی سردیاں دور ہو جائیں۔ تافسق اور فجور اور ظلم اور خونریزی اور فساد اور ہر قسم کی بدیوں کے راہزن جو انسان کے متاعِ ایمان اور دولتِ امن کو ہر وقت لوٹنے کی فکر میں رہتے تھے بھاگ جائیں اور تاریک غاروں میں جا چھپیں جو ان کی اصل جگہ ہے۔ تاپاک دل اور پاک نفس بندے جو دنیا میں بمنزلہ فرشتوں کے ہیں اس کی روشنی کی مدد سے اس سانپ کا سر کچلیں جس نے حوّا اور آدم کی ایڑی کو ڈساتھا اور شیطان کی زہریلی کچلیوں کو توڑیں اور اس کے شر سے دنیا کو ہمیشہ کے لئے بچالیں۔

ہاں اے مشرق و مغرب کی سرزمین کے بسنے والو! سب خوش ہو جاؤ اور افسردگی کو دلوں سے نکال دو کہ آخر وہ دولھا جس کی تم کو انتظار تھی آگیا۔ آج تمہارے لئے غم اور فکر جائز نہیں آج تمہارے لئے حسرت واندوہ کا موقع نہیں بلکہ خرمی و شادمانی کا زمانہ ہے مایوسی کا وقت نہیں بلکہ امیدوں اور آرزوؤں کی گھڑیاں ہیں۔ پس تقدیس کے سنگھار سے اپنے آپ کو زینت دو اور پاکیزگی کے زیوروں سے اپنے آپ کو سجاؤ کہ تمہاری دیرینہ آرزوئیں بر آئیں اور تمہاری صدیوں کی خواہشیں پوری ہوئیں۔ تمہارا رب خود چل کر تمہارے گھروں میں آگیا اور تمہارا مالک آپ تمہاری رضامندی کا طالب ہوا۔ آؤ آؤ! کہ ہم سب اپنے بچوں والے تنازعات کو بھول کر اس کے فرستادہ کے ہاتھ پر جمع ہو جائیں اور اس کی حمد کے ترانے گائیں اور ثناء کے قصیدے پڑھیں اور اس کے دامن کو ایسی مضبوطی سے پکڑلیں کہ پھر وہ یارِ یگانہ کبھی ہم سے جدا نہ ہو۔ اٰمین

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

---

۱ الصّٰفّٰت : ۳ تا ۸ ۲۔ فاطر : ۲۵

۳ متی باب ۲۴ آیت ۲۷ نارتھ انڈیا بائبل سوسائٹی مرزاپور مطبوعہ ۱۸۷۰ء

۴ مرقس باب ۱۳ آیت ۲۲، ۲۳ نارتھ انڈیا بائبل سوسائٹی مرزا پور مطبوعہ ۱۸۷۰ء

۵ دارقطنی کتاب العیدین باب صفة صلوٰة الخسوف والکسوف وھیئتھما جلد ۲ صفحہ ۶۵ مطبوعہ قاہرہ ۱۹۶۶ء

۶ مسند احمد بن حنبل جلد ۲ صفحہ ۳۴۷ مطبوعہ بیروت ۱۹۷۸ء

۷ بخاری کتاب الفتن باب خروج النار

۸ مسلم کتاب الایمان باب نزول عیسی ابن مریم حاکما لشریعة نبینا صلی الله علیه وسلم

۹ بحارالانوار مؤلفه الشیخ محمد باقر المجلسی جلد۵۲ صفحه ۲۸۵ مطبوعه بیروت لبنان ۱۹۸۳.

۱۰ ابن ماجه کتاب الفتن باب اشراط الساعة

۱۱ کنز العمال جلد۱۴ صفحه۵۷۳ روایت نمبر۳۹۶۳۹ مطبوعہ حلب ۱۹۷۵ء

۱۲ مسلم کتاب اللباس باب النساء الکاسیات العاریات المائلات الممیلات

۱۳ مسلم کتاب الفتن باب فی فتح قسطنطینیة

۱۴ مسلم کتاب الفتن باب تقوم الساعة والروم اکثر الناس

۱۵ مسلم کتاب الفتن باب لاتقوم الساعة حتّٰی یحسر الفرات عن جبل من ذهب

۱۶ بخاری کتاب الفتن باب خروج النار

۱۷ کنز العمال جلد۱۴ صفحه۵۷۳ مطبوعه حلب ۱۹۷۵.

۱۸، ۱۹ کنز العمال جلد۱۴ صفحه۵۷۴ روایت ۳۹۶۳۹ مطبوعه حلب ۱۹۷۵.

۲۰ کنز العمال جلد۱۴ صفحه۵۷۳ روایت ۳۹۶۳۹ مطبوعه حلب ۱۹۷۵.

۲۱ ابن ماجه کتاب الفتن باب اشراط الساعة

۲۲ کنز العمال جلد۱۴ صفحه۵۷۴ روایت ۳۹۶۳۹ مطبوعه حلب ۱۹۷۵.

۲۳ ابن ماجه کتاب الفتن باب اشراط الساعة

۲۴ بخاری کتاب الفتن باب قول النبی صلی الله علیه وسلم ویل للعرب من شرٍّقَدِ اقْترب

۲۵ مشکوٰة باب اشراط الساعة الفصل الثانی مطبوعہ لاہور ۱۹۸۳ء

۲۶ مسلم کتاب الایمان باب نزول عیسی ابن مریم حاکمًا لشریعة نبینا محمد صلی الله علیه وسلم

۲۷ الرحمٰن : ۲۰ تا ۲۵ (۲۸) التکویر : ۱۱ (۲۹) التکویر : ۱۲

۳۰ التکویر : ۷ (۳۱) القارعة : ۶، التکویر : ۴
۳۲ بخاری کتاب الفتن باب خروج النار
۳۳ التکویر : ۹ البروج : ۹
۳۴ مسلم کتاب الفتن و اشراط الساعة باب ذکر الدجال
۳۵ بخاری کتاب الفتن باب ذکر الدجال
۳۶ لوائح الانوار البهية وسواطع الاسرار الاثرية مؤلفه شيخ محمد بن احمد السفارینی جلد۲ صفحہ۱۷ مطبوعہ مصر ۱۳۲۴ھ + اقتراب الساعة مؤلفہ نواب نور الحسن خان صفحہ ۶۳ مطبوعہ مطبع مفید عام آگرہ ۱۳۰۱ھ
۳۷ مشکوٰۃ باب اشراط الساعة الفصل الثانی مطبوعہ لاہور ۱۹۸۳ء
۳۸ لوائح الانوار البهية وسواطع الاسرار الاثریہ مؤلفہ شیخ محمد بن احمد السفارینی جلد۲ صفحہ۱۷ مطبوعہ مصر ۱۳۲۴ھ + اقتراب الساعة مولفہ نواب نورالحسن خان صفحہ۶۳ مطبوعہ مطبع مفید عام آگرہ ۱۳۰۱ھ
۳۹ اشارات فریدی (مؤلفہ خواجہ غلام فرید صاحب) جلد ۳ صفحہ۷۰ مطبع مفید عام آگرہ ۱۳۲۰ھ
۴۰ ابن ماجه کتاب الفتن باب شدة الزمان
۴۱ لیکچر لاہور صفحہ ۳۴ روحانی خزائن جلد۲۰ صفحہ ۱۸۰
۴۲ کتاب البریہ صفحہ۲۷۲ حاشیہ روحانی خزائن جلد۱۳ صفحہ۲۹۰ حاشیہ
۴۳ کتاب البریہ صفحہ۲۷۳ تا ۲۷۶ حاشیہ روحانی خزائن جلد ۱۳ صفحہ۲۹۱ تا ۲۹۴ حاشیہ
۴۴ ریویو آف ریلیجنز (اردو) جلد۱ شمارہ ۱ جنوری۱۹۰۲ء صفحہ ۳
۴۵ تذکرہ صفحہ ۱۳۹۔ ایڈیشن چہارم (مفہوماً)
۴۶
۴۷
۴۸
۴۹ متی باب۵ آیت ۱۷ نارتھ انڈیا بائبل سوسائٹی مرزاپور مطبوعہ ۱۸۷۰ء
۵۰ متی باب۲۳ آیت۲، ۳ نارتھ انڈیا بائبل سوسائٹی مرزاپور مطبوعہ ۱۸۷۰ء

۵۱ متی باب ۷ آیت ۱۲ نارتھ انڈیا بائبل سوسائٹی مرزاپور مطبوعہ ۱۸۷۰ء
۵۲ المزمّل : ۱۶
۵۳ ازالہ اوہام حصہ اول صفحہ ۱۵۵ تا ۱۵۸۔ روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۲۵۵ تا ۲۵۸
۵۴ الفاتحة : ۲ (۵۵) النحل : ۶۲ (۵۶) الحشر : ۲۵
۵۷ الاعراف : ۱۵۷ (۵۸) النحل : ۳۷
۵۹ "ایں مشتِ خاک را گرنہ بخشم چہ کنم" کوثر النبی ؐ مؤلفہ حافظ عبدالعزیز ملتانی صفحہ ۵۵۵
۶۰ النحل : ۶۴، ۶۵ (۶۱) الانعام : ۱۰۴ (۶۲) الملک : ۲ تا ۵
۶۳ الانعام : ۲ (۶۴) الشورٰی : ۳۰، ۳۱ (۶۵) الاعراف : ۹
۶۶ النساء : ۹۶
۶۷ ترمذی ابواب الزهد باب ما جاء فی الصبر علی البلاء
۶۸ الانعام : ۱۶۱ (۶۹) اٰل عمران : ۶۵ (۷۰) التوبة : ۲۴
۷۱ اٰل عمران : ۱۹۲ (۷۲) الانفال : ۳ (۷۳) البقرة : ۱۹۰
۷۴ النساء : ۷۲ (۷۵) البقرة : ۱۹۸
۷۶ ترمذی شرح امام ابن عربی مالکیؒ جزء ۹ صفحہ ۳۲ مطبوعہ بیروت ابواب صفة القيامة باب ما جاء فی التوکل
۷۷ التوبة : ۷۲ (۷۸) المؤمن : ۶۵ تا ۶۷ (۷۹) الماعون : ۵ تا ۷
۸۰ البقرة : ۲۶۵ (۸۱) الحج : ۳۳ (۸۲) المطففین : ۱۵
۸۳ PSYCHOLOGY (۸۴) البقرة : ۱۵۳ (۸۵) العنکبوت : ۳۶
۸۶ بخاری کتاب التهجد باب قیام النبی ﷺ باللیل حتی ترم قدماه
۸۷ الرعد : ۲۹ (۸۸) البقرة : ۱۸۶ (۸۹) البقرة : ۱۸۴
۹۰ ان اول بیت وضع للناس للذی ببکة.... (اٰل عمران : ۹۷)
۹۱ الحج : ۳۸ (۹۲) البقرة : ۳ (۹۳) النساء : ۷۰، ۷۱
۹۴ یونس : ۸، ۹ (۹۵) الرحمٰن : ۴۷ (۹۶) القيامة : ۲۳، ۲۴
۹۷ البقرة : ۱۵۳

۹۸

۹۹ النمل : ۶۳ (۱۰۰) حٰمٓ السجدة : ۳۱، ۳۲ (۱۰۱) النجم : ۲ تا ۶

۱۰۲ یوحنا باب ۳ آیت ۱۳ نارتھ انڈیا بائبل سوسائٹی مرزاپور مطبوعہ ۱۸۷۰ء۔ آیت کے الفاظ یہ ہیں "اور کوئی آسمان پر نہیں گیا، سوا اس شخص کے جو آسمان پر سے اُترا"

۱۰۳ الانعام : ۱۰۴

☆☆۱۰۳ شیکسپیئر ولیم Shakespeare William (1564ء-1616ء) عظیم انگریز شاعر اور ڈرامہ نگار ۱۵۶۴ء میں سٹراٹ فورڈ Strat Ford میں پیدا ہوا۔ ۱۵۸۸ء میں لندن چلا گیا اور وہاں ایک نوآموز کے طور پر سٹیج سے وابستہ ہو گیا۔ ۱۵۸۹ء کے قریب اسکے پہلے ڈرامے کا حصہ اول سٹیج پر کھیلا گیا اس کے بعد یہ مسلسل ڈرامے لکھتا رہا۔ بہت سے ماہر نقاد اسکے لکھے ہوئے ڈراموں کی تعداد ۳۸ قرار دیتے ہیں۔ ان میں وہ ڈرامے بھی شامل ہیں جو اس نے کسی دوسرے ڈرامہ نگار کی شراکت میں لکھے۔ شیکسپیئر کے ڈراموں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا مصنف عظیم ترین زندۂ جاوید نابغوں میں سے ہے۔ شیکسپیئر کے ڈراموں میں وہ بیش بہا خزانہ محفوظ ہے جو اس عظیم شاعر اور ڈرامہ نگار نے دنیا کو دیا۔ ان ڈراموں کے اشعار جو کبھی پرشکوہ، کبھی غنائی اور کبھی حیرت انگیز طور پر ظریفانہ ہوتے ہیں حسن و خوبی میں لاثانی ہیں۔ شیکسپیئر کا فن تمام ان ادبی کمالات سے جو تصور میں آسکتے ہیں بالاتر ہے۔ اس کے بعد آنے والے تمام ادیب اور شعراء اسکے اسلوبِ فن سے متأثر ہوئے۔

(اردو جامع انسائیکلوپیڈیا حصہ اول صفحہ ۸۷۲ مطبوعہ لاہور ۱۹۸۷ء)

☆۱۰۴ DANTE (۱۲۶۵ء-۱۳۲۱ء) اٹلی کا مشہور شاعر۔ The Divine Comedia اس کا مشہور منظوم کلام ہے جسکی وجہ سے یہ دنیا کے چھ عظیم ترین مصنفین میں شمار ہوتا ہے (انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا جلد ۷ صفحہ ۳۶ تا ۴۱ مطبوعہ ۱۹۵۰ء)

☆☆۱۰۴ ازالہ اوہام حصہ دوئم صفحہ ۲۷۶، ۲۷۷ روحانی خزائن جلد ۳

صفحہ ۳۷۶، ۳۷۷

۱۰۵ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۱۵۱، ۱۵۲ حاشیہ روحانی خزائن جلد ۲۱

۱۰۶ الزلزال : ۲

۱۰۷ سموئیل ۱ باب ۱۴ آیت ۱۵ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لاہور مطبوعہ ۱۹۴۳ء

۱۰۸ سیرۃ المہدی حصہ اول صفحہ ۲۳۹ تا ۲۴۱ مطبوعہ ۱۹۳۵ء قادیان

۱۰۹ سرمہ چشم آریہ صفحہ ۱۳۲ حاشیہ روحانی خزائن جلد ۲ صفحہ ۱۸۰ حاشیہ (مفہوماً)

۱۱۰ تذکرہ صفحہ ۲۶۵۔ ایڈیشن چہارم

۱۱۱ تتمہ حقیقۃ الوحی۔ روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۴۸۰ تا ۴۸۲ (مفہوماً)، تذکرہ صفحہ ۶۸۴۔ ایڈیشن چہارم

۱۱۲ تتمہ حقیقۃ الوحی۔ روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۴۸۲

۱۱۳ تحفہ غزنویہ صفحہ ۲۹ روحانی خزائن جلد ۱۵ صفحہ ۵۵۹ (مفہوماً)

۱۱۴ یوحنا باب ۸ آیت ۴۶ نارتھ انڈیا بائبل سوسائٹی مرزاپور مطبوعہ ۱۸۷۰ء

۱۱۵ متی باب ۱۱ آیت ۱۹ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لاہور مطبوعہ ۱۹۴۳ء

۱۱۶ اشاعۃ السنۃ جلد ۷ نمبر ۶ صفحہ ۱۶۹ جون تا اگست ۱۸۸۴ء

۱۱۷ آئینہ کمالاتِ اسلام۔ روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۲۹۷ تا ۲۹۹ (مفہوماً)

۱۱۸ تریاق القلوب صفحہ ۱۵۵ روحانی خزائن جلد ۱۵ صفحہ ۲۸۳

۱۱۹ تذکرۃ الشہادتین صفحہ ۶۴ روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۶۴

۱۲۰ متی باب ۹ آیت ۲۴ نارتھ انڈیا بائبل سوسائٹی مرزاپور مطبوعہ ۱۸۷۰ء

۱۲۱ تذکرہ صفحہ ۴۹۵۔ ایڈیشن چہارم

۱۲۲ تذکرہ صفحہ ۴۹۶۔ ایڈیشن چہارم

۱۲۳ نزول المسیح صفحہ ۳۹۔ روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۴۱۵ (مفہوماً)

۱۲۴ تذکرہ صفحہ ۳۹۷۔ ایڈیشن چہارم

۱۲۵ تذکرہ صفحہ ۴۳۴۔ ایڈیشن چہارم

۱۲۶ ریویو آف ریلیجنز اردو ستمبر ۱۹۰۲ء جلد ۱ نمبر ۹ صفحہ ۳۴۳، ۳۴۴ (مفہوماً)

۱۲۷ تتمہ حقیقۃ الوحی۔ روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۵۰۶ حاشیہ (مفہوماً)

۱۲۸ تتمہ حقیقۃ الوحی۔ روحانی خزائن جلد۲۲ صفحہ۵۰۹
۱۲۹ متی باب۷ آیت۱۵ تا۲۰ نارتھ انڈیا بائبل سوسائٹی مرزاپور مطبوعہ ۱۸۷۰ء
۱۳۰ النساء : ۱۸ (۱۳۱) الشوریٰ : ۴۱
۱۳۲ بخاری باب کیف کان بدء الوحی الی رسول الله صلی الله علیه وسلم
۱۳۳ ۔ الانعام : ۱۵۲ (۱۳۴) البقرة : ۲۸۵ (۱۳۵) هود : ۱۱۵
۱۳۶ المائدة : ۱۰۶
۱۳۷ مسند احمد بن حنبل جلد۲ صفحہ۲۰۰
۱۳۸ ۔ الفرقان : ۲۲ (۱۳۹) الحجرات : ۱۳ (۱۴۰) البقرة : ۲۲۶
۱۴۱ بخاری کتاب الرقاق باب من هم بحسنة او سيئة
۱۴۲ النجم : ۳۲،۳۳ (۱۴۳) البقرة : ۱۹۵ (۱۴۴) الحجرات : ۱۲
۱۴۵ ترمذی ابواب البرو الصلة باب ماجاء فی كراهية الهجر للمسلم
۱۴۶ الحجر : ۴۸
۱۴۷ الجامع الصغیر الجزء الثانی صفحہ ۱۸۰ حاشیہ مطبع الخیریة مصر ۱۳۲۱ھ
۱۴۸ التوبة : ۲۴ (۱۴۹) التحريم : ۷ (۱۵۰) المائدة : ۹
۱۵۱ الممتحنة : ۹ (۱۵۲) هود : ۱۱۴ (۱۵۳) الحجرات : ۸
۱۵۴ الشعراء : ۴ (۱۵۵) البقرة : ۱۴۹ (۱۵۶) الفلق : ۶
۱۵۷ الحجرات : ۱۲ (۱۵۸) مسند احمد بن حنبل جلد۵ صفحہ۱۸۱
۱۵۹ النساء : ۳۷ (۱۶۰) الاحزاب : ۵۱ (۱۶۱) بنی اسرائیل : ۳۳
۱۶۲ النور : ۳۴ (۱۶۳) الحديد : ۲۸ (۱۶۴) البقرة : ۲۶۸
۱۶۵ بنی اسرائیل : ۲۷ (۱۶۶) الذّٰريٰت : ۲۰ (۱۶۷) النحل : ۹۱
۱۶۸ اٰل عمران : ۸۰ (۱۶۹) الذّٰريٰت : ۵۷ (۱۷۰) الكهف : ۸
۱۷۱ حٰمٓ السجدة : ۳۵ (۱۷۲) القصص : ۷۸ (۱۷۳) الاعراف : ۵۶،۵۷
۱۷۴ ابوداؤد کتاب الادب باب فی الحسد
۱۷۵ الحجرات : ۱۲ (۱۷۶) بنی اسرائیل : ۳۳ (۱۷۷) محمد : ۳۹
۱۷۸ الاعراف : ۳۶

۱۷۹ ابوداؤد کتاب الملاحم باب ما یذکر فی قرن المائة
۱۸۰ مسلم کتاب البر و الصلة والادب باب النهی عن قول هلک الناس
۱۸۱ التین : ۵ (۱۸۲) الشمس : ۹،۸
۱۸۴،۱۸۳ بخاری کتاب التوحید باب السوال باسماء الله تعالیٰ والاستعاذة بها
۱۸۵ التوبة : ۱۱۹ (۱۸۶) المؤمنون : ۵۲ (۱۸۷) الاعراف : ۳۳،۳۲
۱۸۸ الانعام : ۱۴۶ (۱۸۹) النور : ۳۲،۳۱ (۱۹۰) البقرة : ۱۴۴
۱۹۱ الاعراف : ۱۵۸
۱۹۲ بخاری کتاب النکاح باب الاکفاء فی الدین وقوله..... الخ
۱۹۳ النساء ۳۵، ۳۶
۱۹۴ کنزالعمال جلد۱۶ صفحہ۳۷۲ روایت نمبر۴۴۹۵۵ مطبوعہ حلب ۱۹۷۷ء
۱۹۵ مسلم کتاب الرضاع باب الوصیة بالنساء
۱۹۶ ابوداؤد کتاب النکاح باب فی حق المرأة علی زوجها
۱۹۷ بخاری کتاب الصوم باب حق الاهل فی الصوم
۱۹۸ ابن ماجه کتاب النکاح باب حسن معاشرة النساء
۱۹۹ سنن نسائی کتاب النکاح باب کراهیة تزویج الزناة (ای النساء خیر)
۲۰۰ ترمذی ابواب النکاح باب ماجاء فی التسویة بین الضرائر
۲۰۱ بخاری کتاب المغازی باب مرض النبی ﷺ ووفاته
۲۰۲ المؤطا کتاب الطلاق باب ماجاء فی العزل
۲۰۳ بخاری کتاب الادب باب رحمة الولد و تقبیله و معانقته
۲۰۴ ترمذی ابواب البروالصلة باب ماجاء فی النفقات علی البنات
۲۰۵ ابن ماجه کتاب النکاح باب الغیل
۲۰۶ النساء : ۳۷
۲۰۷ بخاری کتاب الشرکة باب الشرکة فی الطعام والنهد والعروض
۲۰۸ ترمذی ابواب البروالصلة باب ما جاء فی رحمة الصبیان
۲۰۹ بخاری کتاب الصلوٰة باب صلوٰة النساء خلف الرجال

۲۱۰ مسلم کتاب الفضائل باب رحمته ﷺ النساء وامره بالرفق بهن
۲۱۱ بخاری کتاب النکاح باب طلب الولد
۲۱۲ ابوداود کتاب الطلاق باب من احق بالولد
۲۱۳ بخاری کتاب النکاح باب لایخطب علی خطبة اخیه حتی ینکح او یدع
۲۱۴ بخاری کتاب البیوع باب کسب الرجل وعمله بیده
۲۱۵ بخاری کتاب الزکٰوة باب الاستعفاف عن المسئلة
۲۱۶ نسائی کتاب الزکٰوة باب من یسال ولایعطی (فضل من لایسال الناس شیئا)
۲۱۷ بخاری کتاب الاستئذان باب افشاء السلام
۲۱۸ بخاری کتاب الاستئذان باب التسلیم ثلاثا والاستئذان
۲۱۹ بخاری کتاب الشرکة باب الشرکة فی الطعام والنهد والعروض
۲۲۰ بخاری کتاب الجنائز باب الامر باتباع الجنائز و باب من انتظر حتّٰی یدفن
۲۲۱ مسلم کتاب اللباس باب اشتمال الصماء والاحتباء فی ثوب واحد
۲۲۲ ابن ماجه کتاب الطهارة وسننها باب النهی عن الخلاء علی قارعة الطریق
۲۲۳ بخاری کتاب الاذان،باب فضل التهجیر الی الظهر
۲۲۴ مقدمه ابن ماجه باب من سئل عن علم فکتمه
۲۲۵ مسلم کتاب الصید والذ بائح باب النهی عن صبر البهائم
۲۲۶ مسلم کتاب اللباس باب النهی عن ضرب الحیوان فی وجهه و وسمه فیه
۲۲۷ ابوداود کتاب الجنائز باب الامراض المکفرة للذنوب
۲۲۸ بخاری کتاب الطب باب ما یذکر فی الطاعون
۲۲۹ بخاری کتاب المظالم والقصاص باب من قتل دون ماله فهو شهید
☆۲۳۰ ومالکم لا تقاتلون فی سبیل الله والمستضعفین من الرجال والنساء والولدان الذین یقولون ربنا اخرجنا من هذه القریة الظالم اهلها..... (النساء : ۷۶)

☆☆۲۳۰

۲۳۱ مسلم کتاب البروالصلة باب النهی عن الاشارة بالسلاح الی مسلم
۲۳۳،۲۳۲ النساء : ۱۱۵ ۲۳۴۔ النساء : ۵۹
۲۳۵ یایھاالذین امنوا لاتسئلوا عن اشیاء ان تبدلکم تسؤکم...... (المائدة : ۱۰۲)
۲۳۶ بخاری کتاب الجمعة باب الجمعة فی القرٰی والمدن
۲۳۷ کنزالعمال جلد۱۲ صفحہ۶۴۸،۶۴۹ روایت۳۵۹۷۸ مطبوعہ حلب ۱۹۷۴ء
۲۳۸ ''لست سائلا انت تاجر تجمع لاھلک'' تاریخ عمر بن الخطاب (عربی) مؤلفہ ابی الفرج عبدالرحمان بن علی بن محمد بن الجوزی صفحہ۱۷۰ مطبوعہ مصر۱۹۳۱ء
۲۳۹ بخاری کتاب الحدود باب اقامة الحدود علی الشریف والوضیع
۲۴۰ کنز العمال جلد۱۲ صفحہ۶۶۴،۶۶۵ روایت ۳۶۰۱۴ مطبوعہ حلب ۱۹۷۴ء
۲۴۱ اٰل عمران : ۲۰۱ (۲۴۲) المدثر : ۶
۲۴۳ مسلم کتاب المساقات والمزارعة باب الامر بقتل الکلاب و بیان نسخہ..... الخ
۲۴۴ الجمعة : ۳
۲۴۵ مقدمہ ابن ماجہ باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم
۲۴۶
۲۴۷ الفاروق حصہ دوم (سوانح عمر) مؤلفہ شبلی نعمانی صفحہ۴۵ مطبوعہ ۱۸۹۸ء
۲۴۸ مسند احمد بن حنبل جلد۳ صفحہ۴۴۷
۲۴۹،۲۵۰ ترمذی ابواب البروالصلة باب ماجاء فی الاحسان الی الخدم
۲۵۱ بخاری کتاب العتق باب اذا اتاہ خادمہ بطعامہ
۲۵۲،۲۵۳ ابن ماجہ کتاب الرھون باب اجرالاجراء
۲۵۴ البقرة : ۱۴۹ (۲۵۵) النساء : ۳۳ (۲۵۶) النور : ۳۴
۲۵۷ الذّٰریٰت : ۲۰ (۲۵۸) الروم : ۳۹ (۲۵۹) النساء : ۳۷،۳۸
۲۶۰ بخاری کتاب الزکوٰة باب وجوب الزکوٰة
۲۶۱ التوبة : ۱۰۳ (۲۶۲) طٰهٰ : ۱۳۲ (۲۶۳) المائدة : ۹

۲۶۴ الحجرت : ۱۰

۲۶۵ بخاری کتاب المظالم باب اعن اخاک ظالما او مظلوما

۲۶۶ اٰل عمران : ۱۴۱ (۲۶۷) المؤمنون : ۱۱۶، ۱۱۷ (۲۶۸) النحل : ۲۹، ۳۰

۲۶۹ النحل : ۳۳

۲۷۰ ترمذی ابواب صفة القیامة باب فی صفة اوانی الجنة

۲۷۱ عبس : ۲۲ ۲۷۲۔ السّجدة : ۱۸

۲۷۳ ابن ماجه کتاب الزهد باب صفة الجنة

۲۷۴، ۲۷۵ البقرة: ۲۶ (۲۷۶) الزمر: ۴۳ (۲۷۷) بنی اسرائیل: ۱۴، ۱۵

۲۷۸ الدهر : ۶، ۷ (۲۷۹) بنی اسرائیل : ۷۳ (۲۸۰) طٰهٰ : ۱۲۵ تا ۱۲۷

۲۸۱ الحجر : ۴۵ ۲۸۲- البقرة : ۱۶۶

۲۸۳ درمنثور جلد ۴ صفحہ ۲۳۹ زیر آیت ویوم نبعث من کل امة شهیداً وجئنا.....
مطبوعہ بیروت ۱۹۹۰ء

۲۸۴ الفرقان : ۱۳ ۲۸۵۔ ابراهیم : ۱۷، ۱۸ ۲۸۶۔ الاعراف : ۴۲

۲۸۷ الفرقان : ۱۴ (۲۸۸) صٓ : ۵۸ (۲۸۹) الغاشیة : ۳، ۴

۲۹۰ مسند احمد بن حنبل جلد ۳ صفحه ۴۴۲

۲۹۱ بخاری کتاب الجنائز باب موعظة المحدث عندالقبروقعود اصحابه حوله

۲۹۲ مریم : ۷۲ ۲۹۳۔ مریم : ۷۳

۲۹۴ ترمذی شرح ابن عربی مالکی جزء ۱۰ صفحه ۶۴ مطبوعه بیروت ابواب
صفة جهنم باب ماجاء ان للنار نفسین وماذکر من النار من اهل التوحید

۲۹۵ کنزالعمال جلد ۱۴ صفحہ ۵۲۷ روایت ۳۹۵۰۶ مطبوعہ حلب ۱۹۷۵ء میں روایت کے
الفاظ اس طرح ہیں "یاتی علی جهنم یوم ما فیها من بنی ادم احد تخفق
ابوابها"

۲۹۶ التحریم : ۹ (۲۹۷) الحجر : ۴۹ (۲۹۸) الفجر : ۲۸ تا ۳۱

۲۹۹ مشکوٰة کتاب الرؤیا باب صفة الجنة

۳۰۰ ترمذی ابواب صفة الجنة باب ماجاء فی رؤیة الرب تبارک و تعالٰی

۳۰۱ الاحزاب : ۲۴

۳۰۲ امیر حبیب اللہ خان۔ والی افغانستان۔ اپنے والد عبدالرحمٰن کی وفات کے بعد یکم اکتوبر ۱۹۰۱ء میں مسند نشین ہوا۔ اسی کے عہد میں ڈیورنڈ لائن کا تعین کیا گیا اور برطانیہ نے افغانستان کو آزادی دینے کا وعدہ کیا۔ ۲۰۔ فروری ۱۹۱۹ء کو اس نے وادی النگار (ALINGAR) میں قلعہ السراج (لغمان) کے قریب "گوش" میں پڑاؤ ڈال رکھا تھا کہ اسے قتل کر دیا گیا۔ (اردو جامع انسائیکلوپیڈیا جلد ۱ صفحہ ۵۳۷ مطبوعہ لاہور ۱۹۸۷ء' اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۷ صفحہ ۸۸۶' ۸۸۷ مطبوعہ دانش گاہ پنجاب لاہور)

۳۰۳ UNDER THE ABSOLUTE AMIR

. BY FRANK A. MARTIN P203'204 PUBLISHED IN 1907,

۳۰۴ جوزف رُڈیارڈ کپلنگ (Kipling Joseph Rudyard) برطانوی شہری۔ ۳۰ دسمبر ۱۸۶۵ء کو برطانوی والدین کے ہاں بمبئی میں پیدا ہوا۔ اور ۱۸ جنوری ۱۹۳۶ء کو لندن میں وفات پائی۔ ناولسٹ' شاعر اور کہانی نویس' بالخصوص بچوں اور برطانوی سپاہیوں کے متعلق اس کی کہانیوں اور نظموں کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ ۱۹۰۷ء میں ادب کا نوبل انعام لینے والا یہ پہلا انگریز تھا۔

The New Encyclopaedia Britannica vol.5 Edition 15th p828)